میڈیا، اردو اور جدید رجحانات

سہیل انجم

میڈیا، اردو

اور

جدید رجحانات

سہیل انجم

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

نام کتاب : میڈیا اردو اور جدید رجحانات
مصنف : سہیل انجم
قیمت : 395
اشاعت اول : 2010
مصنف کا پتہ : 370/6A ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۔ ٦

ISBN: 978-81-8223-742-1

Media Urdu Aur
Jadeed Rujhanat

by

Suhail Anjum

Year of 1st Edition: 2010
Price: Rs. 395

Published by
Educational Publishing House
Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi - 6

انتساب

بزرگ صحافی

جناب **محفوظ الرحمٰن** صاحب

کے نام

جن کی تحریک وترغیب نے

میرے اندر میڈیا کے گہرے

مطالعے کا رجحان پیدا کیا

فہرست

مقدمہ

پروفیسر شافع قدوائی
شعبۂ ترسیل عامہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تجسّس اور ترسیل نہ صرف فطرت انسانی کا لازمی خاصّہ ہیں بلکہ یہی خصوصیات انسان کو دیگر نوامیس فطرت کے بالمقابل ایک منفرد تشخص عطا کرتی ہیں۔ اکیسویں صدی میں تعقل اور علم پر انحصار کے بجائے اطلاع اور معلومات کی فوری اور بے محابا خواہش نے ایک نئے اجتماعی آشوب کو جنم دیا ہے جہاں اطلاع اقتدار کے کھیل کا بنیادی آلۂ کار بن گئی ہے۔ اب اطلاعاتی تکنالوجی سے کسبِ فیض کر کے عالمی سطح پر ایک متجانس کے خواب کو اب بڑی حد تک شرمندۂ تعبیر کر لیا گیا ہے۔ اطلاعاتی تکنالوجی اور کمپیوٹر کے حوالے سے صورت پذیر ہونے والا معاشرہ اصلاً مابعد صنعتی معاشرہ ہے جسے ماہرین بشریات، عمرانیات اور اقتصادیات نے میڈیا معاشرہ کا نام دیا ہے۔ اس عہد کا شناس نامہ خارجی اور داخلی ہر دو سطحوں پر ذرائع ترسیل کا نفوذ ہے۔ ہمارے تمام اعمال وافعال ذرائع ابلاغ کی فراہم کردہ اطلاعات پر منحصر ہوتے ہیں۔ حسن و قبح اور رد و قبول کے فیصلے ذرائع ابلاغ علی الخصوص ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے رہینِ منت ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی کی بنیادی اقدار اور رسومیات کا تعین بھی ذرائع ابلاغ کرنے لگے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ہمیشہ تیوہاروں اور تقریبات کا انعقاد یا تو مذہب یا پھر معاشرتی رسومیات اور تہذیبی روایات کا تابع ہوتا ہے۔ تاہم اب

ایسے تیوہار بڑے جوش وخروش کے ساتھ منائے جاتے ہیں جن کی اشاعت وترویج ذرائع ابلاغ کرتے ہیں۔ذرائع ابلاغ اساس حقیقت ہی اصل حقیقت بن گئی ہے۔ Media Generated Events نے روایتی تقریبات پر سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔سینٹ ویلینٹائن ڈے، مدرس ڈے، فادرس ڈے وغیرہ اس اجمال کی تفصیل پر گواہ ہیں۔

میڈیا معاشرہ سے مراد ایک ایسا سماج ہے جہاں اطلاع کی تخلیق، تقسیم، نفوذ، استعمال اوراس کا Manipulation ایک اہم اقتصادی، سیاسی اورتہذیبی سرگرمی سمجھی جاتی ہے۔میڈیا کی روز افزوں مقبولیت نے اس کی فلسفیانہ اساس ،نظری مباحث، نوعیت، مقاصد اور کردار سے متعلق خیال انگیز مباحث کو جنم دیا ہے جس سے اردو دنیا کم ہی واقف ہےاور یوں بھی شاعری کی استثنائی مثال سے قطع نظر اردو میں علمی موضوعات پر سنجیدہ کتابیں شاذ ہی منظر عام پر آتی ہیں۔اردو کے معروف صحافی سہیل انجم نے ادھر کئی برسوں سے ذرائع ابلاغ کے معروضی مطالعہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہےاور اردو میں میڈیا شناسی کے نئے اور خیال انگیز امکانات ہویدا کئے ہیں۔ان کی تصانیف ''میڈیا: روپ اور بہروپ'' اور ''مغربی میڈیا اور اسلام''اس اجمال کی تفصیل پر دال ہیں۔سہیل انجم ہر چند کہ ایک معروف صحافی ہیں اور ان کا تعلق پرنٹ میڈیا اور نشریات سے ہے تاہم انہوں نے ذرائع ابلاغ کے محاسبہ میں مقدمات کی تدوین اور نتائج کے استخراج میں دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔

میڈیا اور مسلمان ایک ایسا موضوع ہے جس پر سیاست داں، ماہر عمرانیات، صحافی، ادیب، سماجی کارکن اور حقوق انسانی کے قائدین مسلسل اظہار خیال کرتے رہتے ہیں اور میڈیا کو مسلمانوں کی شبیہ مسخ کرنے کے لئے موردالزام ٹھہراتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کے اصل مسائل سے بے اعتنائی کا شکوہ کرتے رہتے ہیں۔سہیل انجم نے بظاہر اس پیش پا افتادہ موضوع کو موضوع بحث بنایا ہے مگر مصنف نے جذباتی ردعمل سے انحراف کرتے ہوئے مسلمانوں کے تئیں میڈیا کے رویّے کا پوری دیانت داری اور گہری تجزیاتی بصیرت کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور متعدد معین مثالوں کے ساتھ استنادی شہادتیں پیش کی ہیں اور اس موضوع

پر شائع ہونے والی دو اہم کتابوں کا محاسبہ بھی کیا ہے۔ اردو کے نوجوان دانشور اطہر فاروقی کی مرتبہ کتاب "Muslims and Media Images: News versus Views" (جو ایک موقر اشاعتی ادارے آکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی ہے) اور پروفیسر راکیش سنہا کی ہندی کتاب ''آتنک واد اور میڈیا'' کے مشمولات کا جائزہ لیا ہے اور اردو کے عام قارئین کو ملک اور بیرون ملک کے عالموں اور دانشوروں کے خیالات سے واقف کرانے کی قابلِ قدر سعی کی ہے۔ سہیل انجم نے خود کو محض تعارف کی حد تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ چندن مترا، اطہر فاروقی، روبن جعفری، ونود مہتہ، کلدیپ نیّر، مرنال پانڈے اور وحیدالدین خاں کے نقطۂ نظر کا عالمانہ بصیرت کے ساتھ محاسبہ کیا ہے۔ اطہر فاروقی نے ونود مہتہ کے مضمون (آؤٹ لُک) کا بہت اچھا Rejoinder بھی لکھا تھا، کیا ہی اچھا ہوتا اگر مصنف ان دونوں مضامین کے بنیادی مباحث سے بھی قارئین کو واقف کرا دیتے۔ مصنف نے راکیش سنہا کے اعتراضات کا متعین مثالوں کے ساتھ استرداد کیا ہے۔

27 مضامینمیں منقسم زیر مطالعہ کتاب ''میڈیا، اردو اور جدید رجحانات'' نہ صرف اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلوں کی ادارتی پالیسی اور خبروں کی پیش کش کے طریقۂ کار کو بعض اہم واقعات اور حادثات کی coverage کے حوالے سے واضح کرتی ہے بلکہ صحافت کے بدلتے ہوئے منظر نامہ اور اطلاعاتی تکنالوجی سے مسلسل کسبِ فیض کی اطلاقی جہتوں کو بھی موضوع بحث بناتی ہے۔ آن لائن میڈیا اور ای میل سے متعلق مضامین مصنف کی موضوع سے بغایت دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے مشمولات کے موضوعاتی جائزے میں سہیل انجم نے ایک وسیع تر اخلاقی اور انسانی نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھا ہے۔ برطانیہ کی مشہور اداکارہ جیڈ گوڈی نے اپنی موت کے ٹیلی ویژن پر براہ راست ٹیلی کاسٹ پر اصرار کیا تھا۔ مصنف نے اس مسئلہ کو حیات و ممات کے بدلتے آداب کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اور فحاشی کے موضوع پر بھی سہیل انجم نے دلجمعی کے ساتھ گفتگو کی ہے، تاہم مصنف نے فحاشی سے متعلق مقبول عام تصور جو فہم عامہ سے ماخوذ ہے، کو پیش نظر رکھا ہے اور

صارفیت کے زیر اثر انسان کی سائیکی میں آنے والی بنیادی تبدیلیوں کو اس مسئلہ کے ساتھ مربوط کر کے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

ریئلٹی شوز ٹیلی ویژن چینلوں کے مقبول ترین پروگرام ہیں اور عوام کی ایک بڑی تعداد موسیقی اور فلم پر مبنی پروگراموں سے اوب چکی ہے لہٰذا ریئلٹی شوز نے مرکزی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ سہیل انجم نے ریئلٹی شوز کے امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک ہنگامہ خیز اور متنازع فیہ پروگرام ''سچ کا سامنا'' کا جائزہ لیا ہے۔ اس پروگرام کو فحاشی کو فروغ دینے پر عام طور پر مطعون کیا گیا اور صحافتی ضابطۂ اخلاق کی پاسداری کی دہائی دی گئی تھی۔ سہیل انجم نے ردو قبول کے محض اخلاقی معیار کو پیش نظر رکھ کر اس پروگرام کے ٹیلی کاسٹ پر اعتراض نہیں کیا بلکہ انہوں نے سچ کے دائرہ کو صرف جنسی سرگرمیوں تک محدود کرنے کی روش پر نکتہ چینی کی ہے۔ مصنف نے بجا طور پر لکھا ہے کہ نریندر مودی اور اس نوع کے دیگر افراد، جنہوں نے انسانیت سوز مظالم کئے ہیں، سچ کے روبرو کرایا جائے اور بدعنوان سیاست دانوں اور نوکر شاہوں کو بھی کٹہرے میں کھڑا کیا جائے۔ مصنف کی یہ دلیل خاصی مسکت ہے اور یہ صرف جذباتی ردعمل کے داعیوں کو متحرک نہیں کرتی۔

عتیق صدیقی اور طاہر مسعود کی کاوشوں سے قطع نظر اردو صحافت سے متعلق کتابیں تحقیقی نقطۂ نظر سے انتہائی ناقص ہیں اور تاریخی حقائق سے زیادہ سنی سنائی باتوں پر مبنی نظر آتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اردو صحافت کی مبسوط تاریخ اب تک نہیں لکھی جا سکی ہے۔ سہیل انجم نے اردو صحافت کی ایک جہت کو، جس کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، اپنی تحقیق کا ہدف بنایا ہے۔ مصنف نے دینی مدارس کی صحافت پر ایک طویل تحقیقی باب سپرد قلم کیا ہے اور مسلمانوں کے مختلف مسلکوں کے جرائد، ان کی تعداد اشاعت اور مشمولات وغیرہ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ باب تحقیقی طریقۂ کار (Research Methodology) سے مکمل واقفیت اور حقائق کی معروضی پیش کش کو آشکارا کرتا ہے۔

اردو میں تحقیقی طریقۂ کار کی پاسداری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں اور تجربی مطالعہ

(Empirical Study) کی مثالیں تو خال خال ہی ملتی ہیں۔ سہیل انجم اردو کے غالباً پہلے ایسے محقق ہیں جنہوں نے سروے کی بنیاد پر ٹھوس نتائج نکالے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نیوز چینل اردو کے لاتعداد الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اردو کی مقبولیت پر گواہ ہے۔ مصنف نے مضمون ''الیکٹرانک میڈیا کے جدید رجحانات اردو زبان کے حوالے سے'' کی بنیاد ایک سروے پر رکھی ہے اور مقبول عام نیوز چینلوں کے بلیٹنوں کی الفاظ شماری کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان میں مستعمل 25 فی صد سے زیادہ الفاظ اردو کے ہوتے ہیں اگرچہ معنی کی سطح پر یہ اکثر مختلف ہوتے ہیں۔ قواعد، خلاصہ اور اس نوع کے دیگر الفاظ کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

ہم سب ما بعد جدید میں سانس لے رہے ہیں جو اصل تکثیری معاشرہ ہے۔ مرکزیت سے گریز اس کی لازمی صفت ہے۔ بڑے مرکزی ادارے اب قصہ پارینہ بن گئے ہیں۔ مقامی ثقافتی تقاضوں نے بنیادی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ قومی چینلوں کے بجائے مقامی چینلوں کا قیام اور ایف ایم ریڈیو کی مقبولیت اس کا ثبوت ہے۔ اب براڈ کاسٹنگ Narrowcasting کا زمانہ ہے۔ مختلف چھوٹے چھوٹے شہروں میں نیوز چینل قائم کئے جارہے ہیں۔ سہیل انجم نے اس موضوع پر بھی اظہار خیال کیا ہے جس کا عنوان ہے ''گلی کوچوں میں نیوز چینلوں کا قیام''۔ باب کے مندرجات سے اختلاف کی گنجائش کم ہے تاہم اس کے عنوان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مصنف کے نزدیک یہ روش سودمند نہیں ہے۔ گلی کوچے میں تحقیر کا پہلو مستتر ہے۔ سہیل انجم زبان و بیان کے فنی نکات سے خوب واقف ہیں لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ عنوان دانستہ طور پر رکھا گیا ہے۔

سہیل انجم نے دہلی کے اخباروں میں زبان و بیان کے اغلاط پر خیال انگیز بحث کی ہے اور زبان کے گرتے ہوئے معیار پر بجا طور پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ مصنف نے اردو صحافت سے متعلق وحیدالدین خاں کا ایک جملہ نقل کیا ہے کہ اردو صحافت احتجاج کی صحافت ہے۔ اس کے لئے مولانا موصوف نے اردو صحافیوں پر تنقید کی ہے۔ مولانا وحیدالدین خاں

ایک قابل احترام عالم ہیں مگر صحافت سے متعلق ان کی رائے جزوی صداقت کی حامل ہے۔ اس میں اردو کی صحافت کی تخصیص نہیں ہے، صحافت دراصل احتجاج کا دوسرا نام ہے۔لندن ٹائمس کے مشہور اڈیٹر Harold Ewans نے خبر کی تعریف کے ضمن میں لکھا ہے:

News is that which some one wants to supress, rest is the advertisement. یعنی اصل صحافت نیش زنی سے عبارت ہے کہ دنیا غلط کاروں سے پُر ہے اور صحافی جب بھی کچھ لکھے گا تو یہ غلط کار افراد اسے دبانے کی کوشش کریں گے۔اگر غلط کاروں کے خلاف احتجاج نہیں ہے تو خبر اور اشتہار میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

سہیل انجم نے معاصر میڈیا کی امتیازی صفت ''سنسنی خیزی'' پر بھی کئی مضامین میں اظہار خیال کیا ہے اور BigBang تجربے کی Coverage کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ دہلی دھماکوں کے دوران شیوراج پاٹل کے رول کو میڈیا نے ایک خاص نکتہ یعنی وزیر داخلہ کی خوش پوشاکی پر اپنی توجہ صرف کرتے رہے، کو اس طرح اجاگر کیا کہ انہیں مستعفی ہونا پڑا۔ مصنف نے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ترجمہ کے نظری مسائل کو جدید ترین لسانی نظریے کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

سہیل انجم کی زیر مطالعہ کتاب کا امتیازی وصف حقائق کی معروضی پیش کش، معاصر میڈیا کی نظری اساس اور اس کی نئی اطلاقی جہتوں کی نشاندہی اور خیال انگیز تجزیاتی مطالعہ ہے جس کی پذیرائی اردو داں حلقوں پر فرض ہے۔

اردو صحافت کا منظر نامہ

رضوان اللہ

میڈیا ایک بحرِ بیکراں ہے جس کی حدیں ہر روز نہیں، ہر لمحہ وسعت پذیر ہیں۔ سہیل انجم اس بحرِ ناپیدا کنار کے شناور ہی نہیں، ایسے غواص ہیں جو وقفے وقفے سے معلومات کے گہر ہائے آبدار لے کر نمودار ہوتے ہیں جو اردو قارئین کے لیے چشم کشا اور ان کی معلومات میں تازہ کاری کا موجب ہوتے ہیں۔ ''میڈیا، روپ اور بہروپ'' اور ''مغربی میڈیا اور اسلام'' کے بعد اب ''میڈیا، اردو اور جدید رجحانات'' لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ تقریباً پانچ دہائیوں سے اردو میں صحافت کے موضوع پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ یہ ملک میں اردو زبان اور صحافت کی زندگی اور صحت کی دلیلوں میں سے ایک مضبوط دلیل ہے۔ پچھلی صدی میں اردو صحافت پر جو کتابیں شائع ہوئیں ان کو بڑی حد تک ایک طرح کی فہرست سازی کہا جا سکتا ہے یعنی عہد بہ عہد، سال بہ سال، شہر بہ شہر اخباروں کی فہرست، ان کے سال اشاعت، ان کے مالکوں اور مدیروں کی فہرست جو عموماً ایک ہی ہوا کرتے تھے اور اخبارات ان کے ذاتی افکار، دلچسپیوں اور مشاغل کے عکاس ہوتے تھے تاہم ان تصنیفات کو ایک تاریخی ریکارڈ کی حیثیت حاصل ہے۔ نئی صدی کے آتے آتے ان تصنیفات کے مشمولات میں تنوع پیدا ہوا۔ آزادی کے بعد اردو صحافت پر جو کچھ گزری اس کی داستانیں شامل ہوئیں، اس تمام اثناء میں اپنے خونِ جگر سے اس کو روشن رکھنے والے صحافیوں کے خونچکاں تجربے شامل ہوئے، ان کی جدو جہد کے جو ثمرے سامنے آئے ان کو کن دامنوں

نے سمیٹا اور محرومیاں کس کے حصے میں آئیں اس کی الگ کہانی ہے۔ اور آگے بڑھے تو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب کی برکات نے ان تصنیفات کے صفحات کو جلا بخشی۔

لیکن آزاد ہندوستان میں اردو صحافت کا جہاں تک تعلق ہے اس کی رہِ پرخار دیگر ہم عصر صحافتوں کی خوش خرامیوں سے مختلف رہی ہے۔ اسے دلخراش سوالوں اور منحوس پیشین گوئیوں کا سامنا رہا ہے۔ میری پیشہ ورانہ زندگی کے تقریباً ہر موڑ پر اس قطعی بیان کا سامنا ہوا کہ آزاد ہندوستان میں اردو زبان اور اردو صحافت کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ان کا وجود یا عدم وجود محض وقت کی بات ہے۔ اپنے جذباتی تعلق اور پیشہ ورانہ وابستگی سے قطع نظر تاریخ اور حقائق کی روشنی میں اس خیال کو میں ہمیشہ مسترد کرتا رہا۔ آج حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'' سہیل انجم کی موجودہ تصنیف کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں اور عصری میڈیا کے رشتوں کو سمجھنا سمجھانا ہے۔ اس تصنیف کی معنویت اور اس کے مضمرات اسی اجمال کی تفصیلات ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے ہم اس کو تین ابواب میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول ہم عصر میڈیا۔ دوم اردو یا مسلم صحافت تیسرے الیکٹرانک میڈیا۔ جہاں تک ہم عصر میڈیا کا تعلق ہے اس میں زبانوں کی کثرت، نظریات کے اختلافات اور تنوعات اور مسلمانوں کے تئیں ان کے مختلف اور متضاد رویوں کی وجہ سے ان کا مختصر تجزیہ بھی خاصا مشکل اور عام قاری کو الجھانے والا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس تصنیف میں شامل کئی مضامین مثلاً ہم عصر میڈیا اور رجحانات، قومی میڈیا اور مسلمان، دہشت گردی، مسلمان اور میڈیا اور اس سلسلے کے دیگر مضامین کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ فی الحال اشارتاً کہا جا سکتا ہے کہ سہیل انجم نے مختلف اخبارات اور نشریات کے حوالے سے اور متعدد مستند اور معتبر صحافیوں کے انٹرویوز کے ذریعے ان غلط فہمیوں کو اجاگر کیا ہے جو ہم عصر میڈیا میں مسلمانوں کے تئیں موجود ہیں۔ مثلاً دہشت گردی کے تئیں عام مسلمانوں کا نرم رویہ یا اردو صحافت، بہ الفاظ دیگر مسلم صحافت کا محض احتجاجی ہو کر رہ جانا۔ سہیل انجم نے ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

انٹرویوز سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اعتدال پسند صحافی میڈیا کے ہر شعبہ میں موجود

ہیں وہ مسلمانوں کے مسائل اور حقیقتِ حال کو جاننے کے خواہشمند بھی ہیں لیکن انھیں نہیں معلوم کہ وہ یہ کام کیسے کریں۔ انھیں بہرحال مسند نشینوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ اتنی ہی بات اس ضرورت پر زور دینے کے لیے کافی ہے کہ مخلص مسلمان صحافی سامنے آئیں عصری میڈیا میں کھلے ذہن کے لوگوں کو تلاش کر کے ان سے مستقل رابطے میں رہیں اور ان کے تجسس کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہیں۔ یہ وقتی نہیں مستقل اور مسلسل عمل ہے۔

جہاں تک اردو یا مسلم صحافت کا تعلق ہے اس موضوع پر کئی مبسوط مضامین شریک اشاعت ہیں۔ اردو پریس، دہلی کی ہمعصر اردو صحافت، اردو میڈیا، رول اور ذمہ داریاں، میڈیا کے جدید رجحانات، اردو کے حوالے سے۔ لیکن اس سلسلے کا اہم ترین مضمون دینی مدارس کی اردو صحافت ہے۔ جس کی طرف اب تک ناکافی توجہ دی گئی ہے۔ سہیل انجم نے مدارس سے شائع ہونے والے جرائد کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں بڑی کاوش کی ہے۔ ان کی آمدنی کے محدود وسائل کی طرف اشارے کئے ہیں اور انھیں اپنی اشاعتوں کو زیادہ بہتر اور مفید بنانے اور آمدنی کے وسائل دریافت کرنے کے ضمن میں مفید مشورے دیے ہیں اس کے ساتھ ہی ان رسالوں کی ذہنی آبیاری کرنے والوں کے معاشی حالات بہتر بنانے کی ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان رسائل کی رسائی دور دور تک ہے اور عوامی ذہن پر ان کی گرفت بھی مضبوط ہے اس لیے میڈیا کی پیدا کی ہوئی اور پھیلائی ہوئی بہت ساری خرابیوں کی اصلاح کا یہ بہترین ذریعہ ہیں اس بیش بہا اور مؤثر وسیلے کو بھرپور استعمال کیا جانا چاہیے۔

ایک اور سوال اکثر کیا جاتا رہا کہ اردو صحافت کس کی ہے۔ اس کا صاف اور سیدھا جواب تو یہی ہے کہ جو اس صحافت کا قاری، سامع، ناظر یا مخاطب ہے یہ صحافت اسی کی ہے۔ لیکن اس سوال کی رمزیت بڑی تکلیف دہ ہے کیونکہ قومیت یا زبان کی مذاہب کے خانوں میں تقسیم کا تصور تکلیف دہ اور ناقابلِ قبول ہے۔ جب وہ وقت آیا جب ''صحافت'' کی اصطلاح ''میڈیا'' سے بدل گئی اور پریس، جرنلزم، صحافت سب میڈیا کے جامے میں سما گئے تو اردو زبان، پریس اور صحافت سب اس میں فٹ ہو گئے کیونکہ انفارمیشن ٹیکنالوجی

کے انقلاب نے اردو کے مال متاع کو ہر جامے میں فٹ کرنے کے ناممکن عمل کو ممکن بنا دیا لیکن اس بظاہر عمل مساوات نے اردو زبان و ادب اور صحافت کی داخلی کشاکش کو کم کرنے کے بجائے بڑھا دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی بہی خواہان اردو کی تشویش میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اس کی تفصیلات اور اس صورت حال کے مقابلے اور اصلاح کی کوششوں کی طرف سہیل انجم کی موجودہ تصنیف میں اشارے موجود ہیں، اس سلسلے میں زبانی جمع خرچ کے بجائے مسلسل پر خلوص اور صدق دلانہ عمل کی ضرورت ہے۔ ...... ابھی بلا تکلف کہہ دینا چاہیے کہ اس کا بار صحافیوں اور اردو اساتذہ کو ہی اٹھانا چاہیے۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو یہ کارِ خیر جسے بہر حال ہونا ہے قدرت ان کے ہاتھوں سے لے کر کسی اور کو سونپ دے گی اور وہ اس سعادت سے محروم رہ جائیں گے۔ ایسا ہو بھی چکا ہے۔ میں کلکتہ میں اردو صحافت کی تقدیر کے مالکوں سے کہا کرتا تھا کہ اگر دوسرے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اردو پریس بھی ایک اچھا بزنس ہے تو آپ کا بازار سرد پڑ جائے گا۔ میرا یہ بیان میری تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' مطبوعہ 2007ء میں موجود ہے۔ ظاہر ہے یہ تلخ بیانی کسی کے حلق سے اترنے والی نہ تھی لیکن آج وہ سنگین حقیقت سامنے ہے، اس کو کیا کریں۔

اس کتاب میں ایک اہم مضمون ترجمہ سے متعلق بھی ہے، لیکن اس میں زیادہ تذکرہ عمومی یا ادبی تراجم کے متعلق ہے۔ مشینی ترجمے کی کوششوں کا بھی ذکر ہے، لیکن اخباری یا میڈیا کے تراجم کی بات بالکل الگ ہے۔ اردو پریس کے پس منظر میں جب ترجمہ کی بات ہوتی ہے تو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ گویا یہ اخبارات صرف ترجمہ کے مرہونِ منت ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں خبر رسانی کا عمل روزِ اول سے ترجمہ کی معرفت ہوتا رہا ہے۔ کیا دنیا بھر کو پیکنگ، ماسکو، ٹوکیو یا قاہرہ سے ملنے والی خبریں انگریزی اور صرف انگریزی میں ملتی رہی ہوں گی۔ شاید ایسا نہیں ہے ہر جگہ سے مقامی زبانوں میں ترسیلات ہوتی رہی ہیں اور موصول ہونے والے مقامات پر مقامی زبانوں میں ان کے ترجمے ہوتے رہے یا ابتداء ہی میں مختلف زبانوں میں ترجمے کر کے ان کی ترسیل ہوتی رہی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سارا

خبری نظام ترجمہ کے ذریعہ جاری رہا ہے۔ اس عمل کے دوران کلیدی مقامی الفاظ کو جوں کا توں استعمال کیا جاتا رہا اور وہ اس طرح دنیا بھر کی زبانوں میں شامل کر لیے گئے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کی ضرورت اردو صحافت کے دفاع میں پیش آئی ہے۔

لیکن آج ہندوستان میں اردو زبان کو اسی ترجمہ سے نئے خطرے لاحق ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ اردو کی حیثیت سے ہزار انکار کے باوجود یہ وہ جادو ہے جو ہندی کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ چنانچہ میڈیا ہو فلم یا ابلاغ عامہ کا کوئی شعبہ وہاں ہندی زبان کا استعمال کرنے والے اپنی زبان کی زیبائش کے لیے اردو سے کچھ پر لے کر اپنی کلغی میں الٹے سیدھے کی تمیز کیے بغیر ٹھونس لیتے ہیں اور ''مخالف'' کو ''خلافت''، ''تفصیل'' کو ''خلاصہ'' کہنے لگتے ہیں۔ مثالیں اور بھی ہیں۔ یہ ہماری زبان کی خطرناک تخریب ہے اور اس کا تشویشناک پہلو یہ ہے کہ اردو والے اپنی بے عملی یا کام چوری کی بنا پر ان بگڑی ہوئی شکلوں کو ہی اختیار کرتے جا رہے ہیں، یعنی ہندی سے اردو میں ترجمہ نہیں کرتے صرف رسم الخط بدل دیتے ہیں۔ اس باب میں اردو میڈیا کے ارباب اقتدار کو سخت گرفت اور سخت رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں سہیل انجم نے ایک دلچسپ حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جس طرف عام طور سے نظر نہیں جاتی وہ ہے انٹرنیٹ پر اردو زبان میں مفید مطلب اور حسبِ خواہ مواد کی دستیابی اور اس سے استفادہ۔ اسی وسیلے سے غیر ملکی مطبوعات کا مرتب اور معلومات افزا مواد بھی دستیاب ہوتا ہے۔ یہ سب اردو کمپیوٹروں پر یو این آئی کے ارسال کیے جانے والے مضامین اور خبرناموں کے علاوہ ہے۔ مزید براں بڑے بڑے عالمی نشریاتی اداروں کے نشریات بھی انٹرنیٹ پر تحریری صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ ابھی دس برس پہلے یہ سب کچھ سوچنا محال تھا۔

برصغیر ہند و پاکستان کے باہر نئی دنیا میں اردو زبان، ادب اور میڈیا کی فتوحات کے تذکروں پر مشتمل مضمون ''اردو میڈیا کے بیرونی جزیرے'' بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ ظاہر ہے ان معلومات کو اکٹھا کرنے اور مرتب کرنے میں صاحبِ تصنیف نے قابلِ قدر کاوش کی ہے۔ یوروپ کے مختلف شہروں بالخصوص لندن اور برمنگھم کے علاوہ

امریکہ، کناڈا اور عرب دنیا کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے اردو اخبارات اور رسائل اور نشریات اور چینلوں کے آغاز اور ان کی کامیابیوں کی داستانیں دلچسپ اور حوصلہ افزا ہیں۔ دراصل جب اردو کی بقا یا فنا کی بات کی جاتی ہے تو شعور کے حاشیہ پر کہیں نہ کہیں شمالی ہند کا تصور موجود ہوتا ہے جہاں اس کی جڑوں پر کلہاڑا چلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ جبکہ اردو بھی انگریزی کی طرح اپنی گونا گونیوں کے ساتھ ایک عالمگیر زبان بن چکی ہے۔ ''بیرونی جزیروں'' والے مضمون سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں بھی مجاہدین اردو کو بہت ایثار اور قربانیاں پیش کرنی ہوتی ہیں جسے وہ خوشی خوشی قبول ہی نہیں کرتے بلکہ خود آگے بڑھ کے پیش کرتے ہیں۔ آج ہندوستان میں اردو اخبارات کی بقا بھی بیشمار قربانیوں کا حاصل ہے، لیکن بنیاد کی ان اینٹوں کا کسی کو پتہ نہیں ہے۔

''اردو میڈیا، رول اور ذمہ داریاں'' کے زیر عنوان مضمون پڑھ کر ایسا لگا کہ میں نے کلکتہ کی اردو صحافت پر اپنی تصنیف میں جو کچھ لکھا ہے جو کہ پچھلی صدی کے عشروں کی صحافت کے متعلق ہے، اسی کے بعض حصوں کی پیرافریزنگ ہے یعنی اخبار کی پیشانی پر نمودار ہونے والے صحافیوں کے نام، حقیقتاً گمنام صحافیوں کی جاں سپاری، اخباروں کی اصلی اور فروعی اشاعتوں کے اعداد و شمار وغیرہ کے تذکرے۔ بس اس جدوجہد کا ذکر نہیں جو پریس کمیشن کے قیام اور اس کی رپورٹ کے بعد اس کی سفارشات کے نفاذ کے لیے شروع ہوئی۔ اس جوکھوں مہم میں گنے چنے اردو صحافیوں کا سخت امتحان تھا۔ ان کی تعداد اتنی نہ تھی کہ محاذ آرائی کے لیے سیدھے کھڑے ہوں، لیکن انھیں حق تلفیوں کا احساس اور اپنے حقوق کے حصول اور تحفظ کے لیے کچھ کرنے کی فکر بھی تھی۔ اب اس کشمکش کا کہیں ذکر نہیں شاید اس کو جاننے والے بھی کم ہوں۔ لیکن اس کی یاددہانی ضروری ہے۔ اسی سلسلے کا دوسرا مضمون ''دہلی کی ہمعصر اردو صحافت ہے'' یہ نہایت اہم مضمون ہے بلکہ اس مضمون کی جو روح ہے وہ اس تصنیف کا محور ہے۔

سہیل انجم کی اس تصنیف میں اردو میڈیا میں ایک طرح کی اجارہ داری کے اندیشے کا کوئی خاص ذکر نہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ یہ کیفیت صحافتی آمریت کی طرف نہ بڑھے

اگر کئی اجارے ہوں، تو ان کی آپسی مسابقت بذاتِ خود ایک توازن پیدا کرتی ہے۔ لیکن اس مسابقت کے بغیر کوئی اجارہ داری اندیشوں سے خالی نہیں۔ ایسے میں درمیانہ درجے کے اخبارات اور اردو میڈیا کے دیگر وسائل جن کا اس تصنیف میں تفصیلی تذکرہ موجود ہے توازن اور کسی ممکنہ آمریت کی مزاحمت کا موجب ہو سکتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے جو کہ صرف خریداروں کی حوصلہ افزائی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس تصنیف میں اردو پریس کی ایک اور کمزوری کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا وہ یہ کہ ہمارے اخبارات کو خود اپنی پبلسٹی کی ضرورت کا کبھی احساس نہیں ہوتا۔ لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے انگریزی اور دیگر زبانوں کے اخباروں کو تو اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے اور طرح طرح سے اس مد میں خطیر رقمیں صرف کرتے ہیں۔ ہمیں سہیل انجم کی کسی آئندہ تصنیف میں ان نکات کی طرف توجہ کا انتظار رہے گا۔ اس کے منظر عام پر آنے تک صحافت کی دنیا میں کچھ اور انکشافات ان کے قلم کی بوقلمونی میں اضافے کا موجب ہوں تو کچھ عجب نہیں۔

باب اول

میڈیا: ایک صورت ہزار جلوے

ہمعصر میڈیا: رجحانات و امکانات

ہمعصر میڈیا اپنے دامن میں اچھے و برے، مثبت و منفی اور خوب و ناخوب تجربات و مشاہدات کا ایک جہان معانی چھپائے ہوئے ہے۔ جوں جوں یہ شعبہ ترقیات کے منازل طے کرتا جا رہا ہے، اس کی وسعت و اثر آفرینی میں بے انتہا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کسی بھی ملک کی جمہوری عمارت چار ستونوں پر کھڑی رہتی ہے۔ پہلا ستون مقنّنہ کا، دوسرا انتظامیہ کا، تیسرا عدلیہ کا اور چوتھا پریس کا ہوتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی آمد نے پریس کے دائرہ کار کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے اور اب اس میں الیکٹرانک میڈیا کا بہت بڑا حلقہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ کوئی بھی واقعہ خواہ وہ معمولی ہو یا غیر معمولی میڈیا کی عقابی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں پرنٹ میڈیا کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ البتہ الیکٹرانک میڈیا ابھی اپنی تاریخ کے اولین مرحلے میں ہے۔ تاہم ہندوستان میں ٹی وی کی آمد کو پچاس سال ہو چکے ہیں۔ البتہ پرائیویٹ نیوز چینلوں کی عمر ابھی زیادہ نہیں ہوئی ہے۔ ان پچاس برسوں میں جمہوریت کا یہ چوتھا ستون ہمیشہ سے بہت مضبوط اور مستحکم رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شائد بیجا نہیں ہوگا کہ یہ چوتھا ستون بقیہ تینوں ستونوں سے زیادہ مضبوط ثابت ہوا ہے اور جب بھی جمہوریت کی عمارت کو کوئی خطرہ لاحق ہوا ہے، اس چوتھے ستون نے بھرپور انداز میں اپنا رول ادا کیا ہے۔

یہ وہ میڈیم ہے جو آج ہماری زندگی کو بری طرح متأثر کر رہا ہے۔ ہم چاہ کر بھی اس کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکتے اور اس کی دسترس سے دور نہیں جا سکتے۔ آج میڈیا کی طاقت میں اتنا

اضافہ ہوا ہے کہ وہ طبقہ بھی اس سے خوفزدہ ہو گیا ہے جو سفید پوش طبقہ کہلاتا ہے اور جس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کسی میں نہیں ہو سکتی۔ میڈیا سیاست دانوں کے اس طبقے کا بھی محاسبہ کر رہا ہے اور اگر دیکھا جائے تو شائد ہی کوئی سیاست داں ہوگا جو میڈیا سے ڈرتا نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب میڈیا ایک واچ ڈاگ میں تبدیل ہو گیا ہے جو سیاست دانوں کی کارستانیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست دانوں کا ایک طبقہ میڈیا کے اسٹنگ آپریشن سے خائف ہے اور جب بھی کوئی اسٹنگ آپریشن ہوتا ہے تو ان کا یہ ڈر اور پختہ ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ بھی اس کی زد میں نہ آجائیں۔ متعدد سیاست دانوں کو اسٹنگ آپریشن سے بے نقاب کیا جا چکا ہے۔ تاہم اسٹنگ آپریشن کی آڑ میں بدعنوانیوں کا کاروبار بھی زور پکڑتا جا رہا ہے اور اسے ذاتی انتقام کے لئے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسٹنگ آپریشن کو جبریہ وصولی کا بھی ایک ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ اس کی مثالیں آئے دن دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ سرو ودے اسکول دریا گنج کی ایک خاتون ٹیچر کے خلاف ایک نیوز چینل کے اسٹنگ آپریشن سے کافی ہنگامہ پیدا تھا اور اس خاتون ٹیچر کو جیل کی بھی ہوا کھانی پڑی تھی۔ جبکہ بعد میں وہ ایک فرضی اور جھوٹا اسٹنگ آپریشن ثابت ہوا تھا۔ اسی طرح ایک چینل کے دو رپورٹر جھوٹا آپریشن کر کے پولیس والوں کو ٹھگنے کے کاروبار میں ملوث تھے اور جب پولیس والوں کو شک ہوا تو وہ دونوں پکڑے گئے اور ان کا راز فاش ہوا۔ اسٹنگ آپریشن کو ایک فیشن اور بدعنوانی کے آلہ کار کے طور پر اختیار کرنے پر سپریم کورٹ نے ایک نیوز چینل کے رپورٹر کو غیر مشروط معافی مانگنے کی ہدایت دی تھی۔ اس رپورٹر نے ذیلی عدالتوں میں کرپشن کے سلسلے میں اسٹنگ آپریشن کیا تھا۔ جس پر چیف جسٹس آف انڈیا کے جی بالا کرشنن نے سخت وارننگ دی تھی۔ اس طرح اسنگ آپریشن کے نام پر بدعنوانیاں بھی پھیلنے لگی ہیں۔ اسی لئے اب کچھ سیاست داں میڈیا کے خلاف بھی اسٹنگ آپریشن کی بات کرنے لگے ہیں۔

تاہم اس کے باوجود میڈیا کی خوبیاں اس کی خامیوں پر بھاری پڑ رہی ہیں اور اب بھی اسے عوام میں بہت زیادہ اعتبار حاصل ہے۔ یہ میڈیا ہی ہے جو فرقہ وارانہ فسادات میں 'اسٹیٹ

ٹیرارزم یعنی سرکاری دہشت گردی کی بھی قلعی کھولتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کیسے کچھ طبقات اور مخصوص فرقوں کو انتظامیہ اور پولیس کے افسران اپنی زیادتیوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ میڈیا رپورٹنگ سے ہی ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ پردہ زنگاری میں کون سا معشوق ہے جو ڈور ہلا ہلا کر افسروں اور غیر سماجی عناصر کو کٹھ پتلیوں کی مانند استعمال کر کے اپنی متعصّبانہ ذہنیت کو آسودہ خاطر کرتا ہے۔ اگر یہ میڈیا نہ ہوتو ہم بہت سے خوں چکاں حقائق سے روبرو نہ ہوسکیں اور بہت سی ننگی سچائیوں کو نہ جان سکیں۔ بلاشبہ میڈیا میں بہت سی خوبیاں ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اسی کے ساتھ اب میڈیا کے خد وخال میں ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جو اس کی خوبصورتی کو بدصورتی میں بدل سکتی ہیں اور یہ تبدیلیاں خود اس کے لئے ہی سمِ قاتل ثابت ہوسکتی ہیں۔ اگر ان تبدیلیوں کو مثبت رخ نہیں دیا گیا تو ان کے نتائج تباہ کن بھی ہو سکتے ہیں اور ان سے نہ صرف عوام کو بلکہ بذات خود میڈیا کو بھی زبردست نقصان سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔ ان تبدیلیوں کی طرف اکثر و بیشتر اشارے کئے جاتے رہے ہیں اور اب تو کھل کر بات کی جانے لگی ہے۔ کیونکہ اشاروں کنایوں میں بات کہنے کا دور جا چکا ہے۔

اگر ہم میڈیا کا گہرائی سے جائزہ لیں اور مختلف اوقات میں اس کی رپورٹنگ کے نشیب و فراز پر باریکی سے نظر ڈالیں تو بلاشبہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ عام حالات میں رپورٹنگ کا انداز دوسرا ہوتا ہے اور خاص حالات میں دوسرا۔ عام حالات میں جہاں اینکروں اور رپورٹروں میں اعتدال اور سنجیدگی دیکھنے کو ملتی ہے وہیں خاص حالات یا ہنگامی حالات میں اعتدال اور سنجیدگی یک لخت غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ بے اعتدالی اور غیر سنجیدگی لے لیتی ہے۔ وہ اینکر اور رپورٹر جو معمول کے ایام میں معمول کا لہجہ اور انداز تکلم اختیار کیے رہتے ہیں وہی غیر معمولی حالات میں یکسر بدل جاتے ہیں اور ان کے لہجے میں جارحیت اور ہنگامہ خیزی کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر کسی واقعہ سے مسلمانوں کا کسی بھی قسم کا تعلق ہے تو وہ پوری مسلم قوم کو اپنے سامنے ایک فریق کی حیثیت سے کھڑا کر دیتے ہیں اور خود ان کے مقابلے میں ایک فریق بن جاتے ہیں۔ اگر ملک میں سلسلے وار بم دھماکے ہوئے ہیں اور پولیس نے کوئی ایسا

بیان دے دیا ہے جس سے کسی مسلمان کے ملوث ہونے کی بو آتی ہے تو پھر مسلمانوں کی خیر نہیں۔ان حالات میں چند لوگوں کو ہی نہیں بلکہ پوری مسلم قوم کو معتوب ٹھہرا دیا جاتا ہے اور پھر بہتان طرازی کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو کہیں رکنے کا نام نہیں لیتا۔

صرف مسلمانوں کے معاملے میں نہیں بلکہ ہر ایسے معاملے میں جو عام حالات سے ذرا مختلف ہوں، میڈیا کے تیور بدل جاتے ہیں اور تقریباً تمام چینلوں پر ایک ہُمہما سا طاری ہو جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور یہ مینہ جو برس رہا ہے اب بند ہونے کا نام نہیں لے گا۔ دہشت گردی اور بم دھماکوں سے الگ ہٹ کر کوئی اور واقعہ ہو تب بھی ان کا انداز غیر معمولی ہو جاتا ہے اور اس وقت ایسا لگتا ہے جیسے ایک خبر کے علاوہ ملک میں کوئی دوسری خبر نہیں ہے۔اگر محکمہ موسمیات کی جانب سے آفات ارضی وسماوی کی پیشین گوئی کی گئی ہے تو آفات کے آنے سے قبل ہی چینلوں پر ان کا سایہ نظر آنے لگتا ہے۔اس بارے میں اس انداز سے خبریں دی جائیں گی کہ اگر کچھ لوگ اس پیشین گوئی سے مرعوب نہیں ہیں تو ان رپورٹوں سے وہ بھی نہ صرف مرعوب ہو جائیں بلکہ خوف زدہ بھی ہو جائیں۔ایسے صبر آزما اوقات میں جبکہ عوام کو تسلی دینے اور ڈھارس بندھانے کی ضرورت ہوتی ہے یہ چینل اور ہوّا کھڑا کر دیتے ہیں۔اگر حکومت یا متعلقہ محکمے نے کوئی احتیاطی تدبیر بتائی ہے تو ان کا زور اس کی تشہیر کے بجائے آنے والے واقعے سے لوگوں کو ڈرانے پر ہوتا ہے۔آفات ارضی وسماوی کی مانند وبائی امراض کے تعلق سے بھی ان کا رویہ یہی ہوتا ہے۔گذشتہ دنوں جب ملک میں سوائن فلو کی وبا نے قدم جمانے شروع کیے تھے یا جب گجرات اور مہاراشٹرا میں سمندری طوفان 'فیان' کی آمد کی پیشین گوئی کی گئی تھی، میڈیا کا رویہ غیر محتاط اور غیر معتدل تھا۔ بہت کم چینل ایسے ہیں جو حکومت کے اعلان کردہ احتیاطی تدابیر کی تشہیر کرتے ہیں، بیشتر ایسے ہیں جو اس کو نظر انداز کر کے ایسے ہنگامہ خیز حالات پیدا کرنے اور ایسی سنسنی خیزی سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں، جو کسی بھی طرح عوام کے حق میں نہیں ہوتا۔ملک کے بیشتر نیوز چینل اسی روش پر قائم رہتے ہیں، البتہ چند ایسے بھی ہیں جو

ان حالات میں تحمل کا دامن نہیں چھوڑتے اور سنسنی خیزی کر کے اپنا ٹی آر پی بڑھانے کی فکر میں نہیں رہتے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت ان نیوز چینلوں کے لئے ضابطہ اخلاق وضع کرے اور ان کو ان ضابطوں پر چلنے کا پابند بنائے۔ نیوز چینلوں کے ذمے داروں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے اینکروں اور رپورٹروں کو سختی سے ہدایت دیں کہ وہ سنسنی خیزی کے بجائے سنجیدگی سے کام لیں اور عام حالات ہوں یا خاص حالات، معمول کی صورت حال ہو یا غیر معمولی، ہر حال میں تحمل کا دامن تھامے رہیں۔ محض ٹی آر پی بڑھانے کی فکر کرنے کے بجائے سنجیدہ رپورٹنگ سے کام لیں اور ماحول کو پراگندہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔

بہر حال بات چل رہی تھی جمہوریت کے اس چوتھے ستون میں آ رہی تبدیلیوں کی۔اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس چوتھے ستون کی بنیادیں بھی کمزور ہونے لگی ہیں اور ان میں بھی کرپشن کی دیمک لگنے لگی ہے۔ یہاں یہ بات یاد دلاتے چلیں کہ میڈیا نے حکومت و انتظامیہ میں کرپشن کی دیمک کو بے نقاب کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے اور بعض میڈیا اداروں کو اس کی پاداش میں زبردست خسارے سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے، انہیں اس نقاب کشائی کی بھیانک سزائیں ملی ہیں۔خواہ وہ بی جے پی حکومت کے دوران رشوت ستانی کی قلعی کھولنے والا تہلکہ ڈاٹ کوم ہو یا پارلیمنٹ میں سوال پوچھنے کے عوض رشوت لینے کے اسکینڈل کو بے نقاب کرنے والے انرودھ بہل وغیرہ ہوں۔ ان تمام کو انصاف کی آواز بلند کرنے کا خمیازہ ادا کرنا پڑا ہے اور اب بھی ادا کرنا پڑ رہا ہے۔لیکن اب بعض میڈیا ادارے بھی انہی برائیوں میں لت پت ہوتے نظر آ رہے ہیں جن کو بے نقاب کرنے کا سہرا ان کے سر بندھتا رہا ہے۔گویا اب مسیحا بھی بیمار ہو گیا ہے اور اسے کسی ایسے معالج کی ضرورت ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کے جسم کو اس بیماری کے جرثومے سے پاک کرے بلکہ اس کو اس کی ذمہ داریوں اور فرائض کی بھی یاد دلائے۔

میڈیا نے حکومت و انتظامیہ اور سیاست دانوں میں جڑ پکڑ چکے کرپشن کو بڑی جرأت مندی سے بے نقاب کیا ہے لیکن اب وہی کرپشن دیمک بن کر اس کے جسم کو چال ڈالنے کی

کوشش کر رہا ہے۔ ایک سرکردہ صحافی اور ہفت روزہ چوتھی دنیا کے مدیر سنتوش بھارتیہ نے راقم الحروف سے ایک بات چیت میں کہا کہ آج کا میڈیا بک گیا ہے۔ اس نے اپنی بولی لگا دی ہے اور نیوز ایجنسیاں ہوں یا سروے ایجنسیاں سب کی سب سیاست دانوں کے ہاتھوں بک چکی ہیں۔ ان کی اس بات کی تائید ایک دوسرے سرکردہ صحافی پی سائی ناتھ کے مضمون سے بھی ہوتی ہے جس میں انھوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ اب میڈیا پیکجنگ (Media Packaging) کا دور آ گیا ہے اور الیکشن کے دنوں میں یہ سلسلہ تیز ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس بارے میں مہاراشٹرا کے اسمبلی انتخابات کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح میڈیا اداروں نے خود کو امیدواروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا انھوں نے بغیر نام لئے ایک اخبار کے ایڈیٹر کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے اپنے ایک کالم نگار سے کہا کہ اب وہ عارضی طور پر لکھنا بند کر دیں۔ اب ان کا کالم الیکشن کے بعد شائع ہوگا کیونکہ اس وقت تک اخبار کا ہر صفحہ بک چکا ہے۔ پی سائی ناتھ کہتے ہیں کہ ایڈیٹر شریف آدمی ہیں اس لئے انھوں نے بہت ہی ایمانداری اور صفائی کے ساتھ اپنے کالم نگار سے معذرت کر لی۔ حالانکہ پورا کا پورا میڈیا ایسا نہیں ہے تاہم بعض چھوٹے اور بڑے اداروں نے اب روایتی اقدار اور صحافتی دیانتداری پر نوٹوں کے تھیلوں کو ترجیح دینی شروع کر دی ہے۔ جن میں اخبارات بھی ہیں اور طاقتور نیوز چینل بھی ہیں۔ کئی امیدواروں نے یہ شکایت کی ہے کہ میڈیا اداروں نے ان سے 'جبریہ وصولی' کرنی چاہی لیکن انھوں نے میڈیا سے 'پنگہ' لینے سے بچتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ پی سائی ناتھ کہتے ہیں کہ اس الیکشن میں اگر کوئی سب سے بڑا فاتح تھا تو وہ میڈیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ پندرہ سے پچیس لاکھ روپے تک کی پیکجنگ کی گئی۔ اس کے لئے الگ الگ شرحیں رکھی گئیں۔ اپنی تشہیر کرانی ہو یا دوسرے کی شبیہ مسخ کرانی ہو، سب کی الگ الگ شرحیں مقرر کی گئی تھیں۔ بقول ان کے اس الیکشن میں عوام کے ساتھ زبردست دھوکہ کیا گیا، انہیں حقیقی ایشوز سے متعارف نہیں کرایا گیا اور نہ ہی ان کے سامنے امیدواروں کے بارے میں صحیح باتیں بتائی گئیں۔

بی جے پی سے وابستہ رہے ایک دانشور سدھیندر کلکرنی نے بھی میڈیا میں کرپشن پر

حیرت و استعجاب کا اظہار کیا ہے اور پی سائی ناتھ کے مضمون کے حوالے سے کہا ہے کہ ان کو بھی لوک سبھا انتخابات کے دوران ایسے تجربے سے گزرنا پڑا تھا۔ تاہم ان کا کہنا ہے کہ سائی ناتھ نے جن حقائق کا انکشاف کیا ہے وہ زیادہ Shoking ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا جمہوریت کے اس چوتھے ستون میں در آئے اس جراثیم سے اسے نجات ملے گی اور وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں جو میڈیا کو اس سے نجات دلا سکتے ہیں؟ وہ خود جواب دیتے ہیں کہ عوام کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ اس ملک کے شہری ہیں اور جمہوریت میں ان کا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ میڈیا اداروں کے مالکان کے اس رویے کے خلاف وہ عوام کو بیدار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پریس کی آزادی نہ صرف پریس کے لئے بلکہ ان کے لئے بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ حکومت اور الیکشن کمیشن کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ عوام اور امیدوار اس رجحان کے خلاف اپنی آواز بلند کر سکیں۔ وہ میڈیا سے وابستہ افراد سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ کھل کر اس رجحان کے خلاف بولیں اور اس کے خلاف لڑائی لڑیں۔ ورنہ یہ رجحان اس پیشے کو بری طرح داغدار کر دے گا اور اسے ایک تاریک سرنگ میں داخل کر دے گا۔ سدھیندر کلکرنی سیاست دانوں سے بھی سوال کرتے ہیں کہ وہ کیوں خاموش ہیں۔ جب میڈیا سیاست میں در آئے کرپشن کو بے نقاب کرتا ہے اور اس کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو کیا یہ ان کا فرض نہیں ہے کہ وہ بھی میڈیا میں کرپشن کے خلاف بولیں اور عوام میں اس پر بحث کا آغاز کروائیں۔ ان کے خیال میں صاف ستھرے اور بے داغ سیاست دانوں کی کمی نہیں ہے اور وہ اگر کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم پارلیمنٹ میں تو آواز اٹھا ہی سکتے ہیں۔

آج کے میڈیا میں یا جمہوریت کے اس چوتھے ستون میں جہاں کرپشن کی دیمک لگ رہی ہے وہیں اس میں اور برائیاں بھی پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ میڈیا جہاں انفارمیشن فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے وہیں اب یہ ڈِس انفارمیشن (Disinformation) کی راہ پر بھی چل پڑا ہے۔ غلط اطلاعات تو کبھی کبھار دیتا ہی ہے، گمراہ کن اطلاعات دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ انفارمیشن سے وہ مِس انفارمیشن اور ڈِس انفارمیشن تک پہنچ گیا ہے۔ اگر معاملہ دہشت

گردی اور مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہو تو پھر کیا کہنے، اس وقت تو اس میں زبردست جوش آجاتا ہے اور وہ کسی بھی خبر کو جانچے بغیر لوگوں تک پہنچاتا ہی ہے جان بوجھ کر مسلمانوں کو بدنام کرنے کا رول بھی ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ 'اینٹی پروپیگنڈا' بھی کرتا ہے اور شبیہ مسخ کرنے کا 'فریضہ' بھی نبھاتا ہے۔ میڈیا میں یہ طاقت ہے کہ وہ شبیہ سازی بھی کر سکتا ہے اور شبیہ شکنی بھی۔ وہ امیج ساز بھی ہے اور امیج شکن بھی۔ وہ بت گر بھی اور بت شکن بھی۔ یہ اس کے اپنے مفادات پر منحصر ہے کہ وہ کب بت سازی کرے گا اور کب بت شکنی کرنے لگے گا۔ وہ کب کسی کی امیج بنائے گا اور کب امیج شکنی پر اتارو ہو جائے گا۔ وہ کب شبیہ ساز کا رول ادا کرے گا اور کب شبیہ شکن بن جائے گا۔ یہ سب کچھ اس کے اپنے مفادات سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور اب تو اس نے خود کو بیچنا بھی شروع کر دیا ہے۔ وہ اتنا چالاک اور عیار ہے کہ 'نرخ بالا کن' کے اصول پر کاربند ہو گیا ہے۔ وہ جتنی اونچی اپنی بولی لگائے گا اتنی ہی گمراہ کن رپورٹنگ کرے گا۔ تاہم اطمینان بخش بات یہ ہے کہ یہ بدعت ابھی زیادہ چینلوں یا زیادہ اخباروں میں نہیں آئی ہے۔ ابھی ایسے ادارے موجود ہیں جو اپنی برادری کی بدعنوانیوں کے خلاف بھی آواز بلند کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ ان میں انگریزی روزنامہ ہندو اور انڈین ایکسپریس قابل ذکر ہیں۔ اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ جب تک ایسے بے باک اور انصاف پسند میڈیا ادارے رہیں گے یہ گندی مچھلیاں میڈیا کے وسیع سمندر کو گندا نہیں کر سکیں گی۔

میڈیا کی گرفت چیف جسٹس آف انڈیا بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے دہلی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے میڈیا میں ضرورت سے زیادہ جوش و خروش پر شدید انداز میں نکتہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ میڈیا کو ایسی رپورٹنگ سے احتراز کرنا چاہیے جس کا اثر بہت زیادہ پڑتا ہو۔ بالخصوص دہشت گردانہ حملوں کے دوران اپنی رپورٹنگ میں تحمل سے کام لینا چاہئے ورنہ ایسی رپورٹنگ کے نتیجے میں خطرناک ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔ چیف جسٹس آف انڈیا جسٹس بالا کرشنن رپورٹنگ کے فوری اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے کے پھیلتے ہوئے میڈیا میں ہیجان انگیز تصویروں اور بیانات

کا فوری طور پر اثر ہوتا ہے اور اس سے ناپختہ ذہن کے لوگ متأثر ہوتے ہیں۔ وہ مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب کوئی دہشت گردانہ واقعہ کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کی کارستانی کا نتیجہ ہو تو فوری طور پر اس مذہب کے لوگوں کے خلاف عام لوگوں میں غم و غصہ پیدا ہوسکتا ہے اور ردعمل کا سلسلہ شروع ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ نائن الیون کا واقعہ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں رپورٹنگ کی وجہ سے ہندوستان میں کئی مقامات پر فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات ہوئے تھے۔ میڈیا کے 'اوور ایکٹی وزم' پر ہمیشہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ اس کے خطرناک نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ دراصل اس وقت میڈیا میں بے تحاشہ وسعت پیدا ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے میڈیا اداروں میں باہمی مقابلہ بھی بہت تیز ہو گیا ہے۔ ہر چینل چاہتا ہے کہ کوئی بھی واقعہ سب سے پہلے وہی دکھائے۔ دوسروں پر سبقت لے جانے کی ہوس میں بعض اوقات صحافتی اصولوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور روایتی اقدار کو پیروں تلے روند دیا جاتا ہے۔ میڈیا کے اس رویے کے خلاف اکثر و بیشتر آوازیں اٹھتی رہتی ہیں اور حکومت ضابطہ اخلاق وضع کرنے کی بھی بات کرتی ہے۔ لیکن معاملہ ٹھنڈا ہو جانے کے بعد ساری باتیں دب جاتی ہیں۔ بہر حال اس وقت میڈیا کے ہاتھوں میں زبردست طاقت ہے جو کہ سماج میں پھیلی برائیوں کو ختم بھی کرسکتا ہے اور ان کو اور بڑھاوا بھی دے سکتا ہے۔ یہ میڈیا کے اوپر ہے کہ وہ کس معاملے کو کس طرح لیتا ہے اور اپنے فرض کی ادائیگی کس طرح کرتا ہے۔

جرأت مند میڈیا کا نیا چہرہ

(ممبئی پر دہشت پسندانہ حملوں کے تناظر میں)

ممبئی میں دہشت گردانہ حملوں کے دوران فائیو اسٹار ہوٹلوں تاج اور اوبرائے ٹرائڈنٹ اور یہودی مرکز نریمن ہاؤس میں دہشت گردوں کے خلاف کمانڈو فورس نے جو جنگ لڑی وہ شجاعت و بہادری کی ایک نادر مثال ہے۔ تاریخ اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی اور جب بھی ممبئی کی اس خوفناک جنگ کا ذکر ہوگا' بہادر کمانڈوز کی داستانیں بھی سنائی جائیں گی۔ لیکن اس جنگ کے متوازی ایک اور جنگ جاری رہی۔ اس محاذ پر جو سپاہی تعینات تھے وہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ مائک اور کیمروں سے لیس تھے اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر پل پل کی خبر پوری دنیا تک پہنچا رہے تھے۔

یوں تو صحافت جرأت مندی کے مظاہرے کا ہی دوسرا نام ہے اور غیر معمولی یا ہنگامی حالات ہی میں رپورٹنگ کا اصل مزہ آتا ہے۔ عام حالات میں شاندار اور پر تعیش دفاتر میں بیٹھ کر رپورٹ بنانے اور میدان جنگ سے رپورٹنگ کرنے میں بہت فرق ہے۔ اگر دشمن سے لڑنے میں شجاعت و بہادری کا مظاہرہ فوجی جوان کرتے ہیں تو آج کے چوبیس گھنٹے کی لائیو ٹی وی رپورٹنگ کے عہد میں میڈیا رپورٹر بھی اپنی بہادری کا کم مظاہرہ نہیں کرتے۔ بعض اوقات ان رپورٹروں کو اپنے فرض کی ادائگی میں اپنی جانوں تک کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ افغانستان اور عراق کی جنگ میں رپورٹنگ کرتے ہوئے جانے کتنے رپورٹر کام آئے تھے۔ اسی طرح ہوٹل تاج اور اوبرائے ٹرائڈنٹ اور نریمن ہاؤس کے چاروں طرف بکھرے

ہوئے بھوکے پیاسے رپورٹروں کی قربانیوں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جان جوکھوں میں ڈال کر رپورٹنگ کرنے والے نوجوانوں کی بدولت ہی ہم اپنے عیش کدوں میں ٹی وی پر ایک ایک واقعے اور ایک ایک لمحے کی سچائی سے روبرو ہوتے رہے۔ ان کی شجاعت اور جوش و جذبے اور اپنے فرض کی ادائگی کے تئیں دھن، لگن اور لگاؤ کے تناظر میں اگر ہم یہ کہیں کہ جرأت مند میڈیا کی ایک نئی صبح طلوع ہو رہی ہے تو شائد بیجا نہیں ہوگا۔

آج جب بھی ہنگامی حالات پیدا ہوتے ہیں تو ایک طرف جہاں پولیس جوانوں اور سیکورٹی حکام میں ہلچل مچ جاتی ہے اور وہ جلد از جلد موقع واردات پر پہنچ کر اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے بے تاب رہتے ہیں، وہیں دوسری طرف رپورٹروں اور بالخصوص ٹی وی رپورٹروں میں بھی ہلچل شروع ہو جاتی ہے اور وہ بھی جلد از جلد موقع پر پہنچ کر کوریج کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں۔ صرف کمانڈوز اور فوجی جوانوں کو ہی راتوں میں نہیں جگایا جاتا بلکہ رپورٹروں کو بھی اس تجربے سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ بھی آناً فاناً تیار ہو کر اپنے ہتھیاروں سے لیس محاذ پر پہنچنے کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ ممبئی میں دہشت گردانہ حملوں کی خبر آنے کے بعد دہلی سے ممبئی کے لئے متعدد پروازیں انہی رپورٹروں اور جرنلسٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔

ہم نے جہاں یہ دیکھا کہ اس جنگ میں کب کون ہلاک ہوا اور کس کی شہادت ہوئی اور اس خطرناک محاصرے کو ختم کرانے کے لئے کمانڈوز نے کس طرح حکمت عملی بنائی اور دہشت گردوں کو ڈھیر کر کے یرغمالوں اور ہوٹلوں کو ان سے رہا کروایا وہیں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح بعض کیمرہ مین اور رپورٹر گرینیڈ دھماکوں کے درمیان زمین پر لیٹ کر رپورٹنگ کر رہے ہیں۔ 26 نومبر 2008 کی رات میں دس بجے سے لے کر 29 نومبر کی صبح ساڑھے آٹھ بجے تک جاری اس جنگ میں ایسے کتنے جرنلسٹ اور رپورٹر تھے جو سوئے نہیں اور جن کو اس کی پروا نہیں تھی کہ ان کو چائے ناشتہ مل رہا ہے یا نہیں۔ جو بارہ بارہ اور چوبیس چوبیس گھنٹے تک بھوکے رہے اور پھر بھی رپورٹنگ بند نہیں کی۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک بھی گرینیڈ گرتے رہے لیکن ان کے جذبے میں ذرا بھی فرق واقع نہیں ہوا اور ان کے عزائم

ذرا بھی متزلزل نہیں ہوئے۔ رات میں جب یہ خبر آئی کہ ممبئی میں دہشت گردانہ حملہ ہوا ہے تو اسی وقت صحافیوں کی ٹیم نکل پڑی۔ بعض نے کسی رپورٹنگ کو چھوڑ کر وزیر اعظم یا کسی دوسرے سیاست داں کا ردعمل حاصل کیا اور پھر اسی حالت میں وہاں سے ممبئی نکل جانے کو ترجیح دی۔ بعض کو ان کے گھروں سے بلایا گیا اور فوراً ممبئی روانہ کر دیا گیا۔

اس محاذ پر سینئر رپورٹرس بھی موجود تھے اور کم عمر اور جونیئر رپورٹرس بھی۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ نوجوان رپورٹروں نے اپنی جرأت مندی کے مظاہرے میں کوئی کمی نہیں دکھائی۔ بعض نوجوان رپورٹروں نے اپنے حیرت انگیز تجربات بیان کئے ہیں۔ جن میں سی این این آئی بی این، ڈی ڈی نیوز، انڈیا ٹی وی، ہیڈ لائن ٹوڈے اور نیوز ایکس وغیرہ کے رپورٹر شامل ہیں۔ انھوں نے جو تجربات بیان کئے ہیں وہ دلچسپ بھی ہیں اور حیرت انگیز بھی۔ ان میں بیشتر چوبیس گھنٹے تک جاگتے رہے اور بعض کو پورے پورے دن کھانے پینے کو کچھ بھی نصیب نہیں ہوا۔ بعض کے نزدیک لاشیں بھی گریں اور گرینیڈ بھی پھٹے لیکن ان کا جذبہ کمزور نہیں پڑا۔ تین تین دن تک ایک ہی کپڑے میں اور بغیر نہائے دھوئے کام کرنا اور ایسے حالات میں جب یہ پتہ نہ ہو کہ اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے، اپنے آپ میں کمال سے کم نہیں ہے۔ بائیس تئیس سال سے لے کر اٹھائیس تیس سال کے نوجوانوں نے جو کارنامے دکھائے ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔

دراصل یہ چوبیس گھنٹے کے لائیو ٹی وی کوریج کا زمانہ ہے اور اس میں جو پچھڑ گیا وہ ختم ہو گیا۔ مقابلے کے اس دور نے بھی ان نوجوانوں میں حرکت و عمل میں اضافہ کیا ہے اور ان میں کام کرنے کے جذبے کو تقویت فراہم کی ہے۔ اس جنگ کے دوران ہونے والی رپورٹنگ کا ہی نتیجہ تھا کہ اس دوران لوگوں نے کوئی سیریئل نہیں دیکھا کوئی فلم نہیں دیکھی۔ اگر وہ دیکھتے رہے تو صرف رپورٹنگ۔ اور رپورٹنگ ہمیشہ پر لطف نہیں ہوتی وہ خشک بھی ہوتی ہے اور بے مزہ بھی ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح ایک ایک چیز اور ایک ایک اینگل کو ٹی وی پر دکھایا جاتا رہا وہ کسی سنسنی خیز فلم سے کم نہیں تھا۔ تجسس اور ڈرامائیت کے عناصر بھی اس

میں موجود تھے اور سچائی کو بے نقاب کرنے والے فوٹیج بھی دکھائے جاتے رہے۔ کمانڈوز کس طرح جان پر کھیل کر یرغمالوں کو نکال رہے تھے اور کس طرح خونخوار دہشت گرد اپنی چالاکیوں اور چالبازیوں سے کمانڈوز کو چھکاتے رہے، وہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس لائیو ٹی وی کوریج کی بدولت ہی ہم نے پہلی بار میرین کمانڈوز (مارکوز) کو پریس کانفرنس کرتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ کس طرح گاگل لگائے، اسکارف باندھے اور منھ چھپائے ہوئے انتہائی پراسرار لگ رہے تھے۔ اس رپورٹنگ کی بدولت ہی ہم نے دیکھا کہ کس طرح اے ٹی ایس کے سربراہ اور ان کے افسران مورچے پر جانے کے لئے تیاری کر رہے ہیں اور کس طرح دہشت گردوں نے ان پر فائرنگ کر کے انہیں ہلاک کیا اور ان کو گاڑی سے نکال کر زمین پر پھینکا اور گاڑی لے کر اور گولیاں چلاتے ہوئے فرار ہو گئے۔ کس طرح ایک فوجی ہیلی کاپٹر سے رسّی کی بدولت کمانڈوز نریمن ہاؤس کی چھت پر اتر رہے ہیں، بالکل فلمی سین کی طرح۔ اس کوریج کے سبب ہی ٹی وی چینلوں کے گراس ریٹنگ پوائنٹ میں 278 فیصد کا اضافہ ہوا۔ کیونکہ چار دنوں تک لوگوں نے اس لائیو رپورٹنگ کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔

اس مختصر سے جائزے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب میڈیا کا جو دور آیا ہے وہ ہر چیز کو بے نقاب کر دینے والا ہے اور کسی بھی واقعہ کے تمام تر پہلوؤں کو ہمارے سامنے رکھ دینے والا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ میڈیا میں جرأت مند صحافت اور حیرت انگیز رپورٹنگ کا ایک نیا سورج طلوع ہو رہا ہے جو اس پیشے کے بہت سے نئے گوشوں کو ہمارے سامنے رکھے گا اور اس میں نئے نئے پہلوؤں کا اضافہ کرے گا۔

جرأت مند میڈیا

جوش کے ساتھ ہوش بھی ضروری

آئی ٹی انقلاب کے اس دور میں الیکٹرانک میڈیا ایک دو دھاری تلوار ہے۔ اگر اس کا صحیح استعمال نہ ہو یا ضرورت سے زیادہ جوش کا مظاہرہ کیا جائے تو اس کے خطرناک نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا کے لئے وقتاً فوقتاً ضابطہ اخلاق کی بات اٹھتی رہتی ہے اور حکومت کے ساتھ ساتھ میڈیا اداروں کے ذمے داران کی جانب سے بھی کوڈ آف کنڈکٹ پر زور دیا جاتا ہے۔ ممبئی میں دہشت پسندانہ حملوں اور ساٹھ گھنٹے تک چلی کمانڈو کارروائی کی لائیو ٹی وی کوریج کے تناظر میں ایک بار پھر یہ بحث اٹھ کھڑی ہوئی ہے کہ میڈیا کے لئے ضابطہ اخلاق ہونا چاہئے یا نہیں۔ اس سلسلے میں نیوز براڈ کاسٹرس ایسوسی ایشن کی میٹنگوں میں بھی اس پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لائیو ٹی وی کوریج کی بدولت نہ صرف پورے ملک بلکہ تقریباً پوری دنیا کو اس خطرناک جنگ کے ایک ایک لمحے کے مشاہدے کا موقع ملا اور جہاں دہشت گردوں کے خطرناک عزائم اور ان کی سفاکیوں کو بے نقاب کیا گیا اور ان کے تئیں عوامی نفرت اور غصے کا لاوا ابل پڑا وہیں ملک کے تئیں وفاداری اور کمانڈوز کے تئیں عزت و احترام کے جذبے میں ہزار چند اضافہ بھی ہوا۔ اسی کے ساتھ اہل وطن نے دیکھا کہ کس طرح ہمارے جاں باز سپاہی اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر موت کے منھ میں کودتے ہیں

اور ملک کو بچانے کے لئے کسی بھی حد سے گزر جانے سے گریز نہیں کرتے۔

لیکن اس لائیو کوریج کے تعلق سے بہت سے سوالات بھی اٹھائے جا رہے ہیں۔ میڈیا پر سب سے زیادہ برہم اور مشتعل بحریہ کے اس وقت کے سربراہ ایڈمرل سریش مہتہ ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ میڈیا نے رپورٹنگ کے دوران ''عجلت پسندی اور عدم تحمل'' کا جو مظاہرہ کیا اس سے کمانڈوز کارروائی کو بہت نقصان پہنچا۔ وہ ہیلی کاپٹر سے کمانڈوز کو اترنے کی لائیو تصویر دکھانے پر بے حد غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے ہماری سیکورٹی کو نقصان اور دہشت گردوں کو فائدہ پہنچا۔ایک روز بعد ایک انٹرویو کے دوران انھوں نے ان دور پورٹروں کے سر قلم کر دینے کی بات کہی جنھوں نے ان کے انٹرویو کو قبل از وقت دکھا دیا تھا۔ایڈمرل سریش مہتہ نے میڈیا نمائندوں کو ایک ناکارہ فوج قرار دیا اور ایک روز بعد جب نامہ نگاروں نے ان سے سوال کرنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ وہ احمقوں سے بات کرنا نہیں چاہتے۔

میڈیا پر عجلت پسندی اور عدم تحمل کے ارتکاب کا الزام میڈیا سے وابستہ لوگ بھی عائد کرتے ہیں۔ایک ٹی وی جرنلسٹ اور یونیورسٹی آف برسٹل کے شعبہ میڈیا اسٹڈیز میں پروفیسر پرسون سونوالکر کہتے ہیں کہ ابتدا میں کوریج کا مزاج ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد زبردست مقابلہ آرائی نے تمام نظم وضبط کو پامال کر دیا۔اور اس سنگین واقعہ کو انفارمیشن انٹرٹینمنٹ میں تبدیل کر دیا۔اس طرح لائیو رپورٹنگ پر سنسنی خیزی حاوی ہو گئی۔ سی این این آئی بی این کے ایڈیٹر انچارج اور ایڈیٹرس گلڈ آف انڈیا کے صدر راج دیپ سردیسائی بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیں مزید تحمل اور اخلاقی معیار کی ضرورت ہے۔سینٹ اینڈ ریوز کالج برطانیہ میں دہشت گردی اور سیاسی تشدد کے مطالعہ کے مرکز میں سینئر ریسرچر ڈاکٹر پیٹر لہر برطانیہ میں میڈیا کے لئے دفاعی ایڈوائزری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے کوڈ آف کنڈکٹ میں کہا گیا ہے کہ میڈیا کو چاہئے کہ وہ حساس نوعیت کی رپورٹنگ اس ہوشیاری سے کرے کہ کوئی آپریشن متأثر نہ ہو اور نہ ہی دہشت گردوں کو اس سلسلے میں کوئی اطلاع حاصل ہو سکے۔

بتایا جاتا ہے کہ اس لائیو ٹی وی کوریج سے دہشت گردوں نے کافی فائدہ اٹھایا۔ ان کا آقا مسلسل سب کچھ ٹی وی پر دیکھتا رہا اور اس کی روشنی میں ہدایتیں دیتا رہا۔ اس کی تصدیق یرغمالوں نے بھی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ مسلسل موبائیل پر باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے یہ بھی سنا کہ ''اڑا دیں؟ ہاں اڑا دو''۔ اور پھر بہت سے لوگوں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی ماردی گئی۔

لیکن سبھی ماہرین میڈیا کے نکتہ چیں ہوں ایسا نہیں ہے۔ نیو یارک ٹائمز کی رپورٹر سومنی سین گپتا' جو کہ موقع پر موجود تھیں' کہتی ہیں کہ اس مقابلہ جاتی فیلڈ میں غضب کی اور زبردست اسٹوریز چلائی گئیں۔ لیکن وہ بھی کوڈ آف کنڈکٹ پر اصرار کرتی ہیں۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا میڈیا دو دھاری تلوار ہے' یہ اس تلوار کا ایک رخ یا سکے کا ایک پہلو ہے۔ اس کے دوسرے پہلو کی نمائندگی این ڈی ٹی وی کی مینیجنگ ایڈیٹر برکھا دت کرتی ہیں۔ وہ ان تمام الزامات کا ایک ایک کر کے جواب دیتی ہیں اور میڈیا کے بےقصور ہونے پر اصرار کرتی ہیں۔ بقول ان کے جب تک وہ ممبئی میں رہیں لوگ انھیں مبارکباد دیتے رہے اور جوں ہی وہ دہلی آئیں نفرت کی ایک مہم دیکھی گئی۔ وہ اپنی برادری کا دفاع کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ان کی رپورٹنگ کا شکریہ خود این ایس جی کے ذمے داروں نے کیا۔ کسی پولیس افسر یا ذمے دار نے میڈیا سے آکر یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ دور سے رپورٹنگ کریں نہ ہی وہاں بیری کیٹنگ کی گئی۔ اس دوران پولیس یا حکومت نے کوئی ایسا مرکز قائم نہیں کیا جہاں سے اطلاعات حاصل کی جاسکیں۔ ان کی دلیل ہے کہ صرف میڈیا پر ہی کیوں الزام لگایا جاتا ہے' خود پولیس اور فوج والے برابر میڈیا سے آآکر بات کرتے رہے۔ یہاں تک کہ کارروائی کے دوران ہی میرین کمانڈوز (مارکوز) نے ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔ ایڈمرل مہتہ کہتے ہیں کہ رہا کرائے جانے والے یرغمالوں سے میڈیا کو بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لیکن یرغمال بنائے جانے والے خود بات کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کے اہل خانہ کو میڈیا کے ذریعے ان کی خبر مل سکے۔ کوڈ آف کنڈکٹ کے سوال پر ان کا کہنا

ہے کہ ایسے ہنگامی حالات میں انتظامیہ کی جانب سے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی جاتی کہ یہ کرنا ہے اور وہ نہیں کرنا ہے۔ این ڈی ٹی وی کے چیئر مین پرنے رائے نے سریش مہتہ کے بیان پر ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے ان سے اپنا بیان واپس لینے اور عوامی معافی مانگنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ویسے اگر ہم دیکھیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ میڈیا نے غیر ضروری جوش کا مظاہرہ کیا اور کئی رپورٹروں نے صرف جوش سے ہی کام لیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایڈمرل سریش مہتہ جیسے اعلی عہدے پر فائز شخص نے اپنے ردعمل میں عدم تحمل اور ہلکے پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ نامہ نگاروں کے سر قلم کرنے کی بات کرتے ہیں اور ان کو ایک احمق اور ناکارہ فوج بتاتے ہیں۔ ان سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

میڈیا کے لوگوں پر اور خاص کر جونیئر نامہ نگاروں پر ضرورت سے زیادہ پر جوش ہونے کا الزام لگتا رہتا ہے اور یہ غلط بھی نہیں ہے۔ زیادہ دور نہ جائیں بٹلہ ہاؤس انکاونٹر ہی کو دیکھ لیں۔ کس طرح میڈیا نے غیر ذمے دارانہ رپورٹنگ کی تھی۔ بغیر ثبوت اور بغیر کیس چلے نوجوان طلبہ کو دہشت گرد ثابت کرنے اور جامعہ ملیہ کو دہشت گردوں کا اڈہ بتانے کی کیسی کوشش کی گئی۔ دراصل میڈیا خود ہی استغاثہ بن جاتا ہے، وکیل بن جاتا ہے، جج بن جاتا ہے اور خود ہی فیصلہ بھی سنا دیتا ہے۔ اس بارے میں بھی میڈیا کو خود احتسابی کرنی چاہئے۔

جہاں تک کوڈ آف کنڈکٹ کی بات ہے تو اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ ہونا چاہئے۔ حکومت بھی ضابطہ اخلاق وضع کرنے کی بات کرتی ہے اور میڈیا ادارے بھی اور پھر سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ امریکی اور برطانوی کوڈ آف کنڈکٹ کو ملا کر جو ضابطہ اخلاق بنایا گیا ہے اس پر بھی پوری طرح عمل نہیں کیا جاتا۔ بلاشبہ میڈیا کے لئے ضابطہ اخلاق بننا چاہئے اور جو نیوز چینل یا نامہ نگار اس کی خلاف ورزی کریں ان کے خلاف سخت ترین کارروائی بھی ہونی چاہئے۔ کیونکہ بہرحال آج کے جرأت مند میڈیا کے لئے جوش بھی ضروری ہے اور ہوش بھی۔ ورنہ ضرورت سے زیادہ تیزی سنگین نتائج کا شاخسانہ بھی بن سکتی ہے۔

جان ہتھیلی پر رکھ کر رپورٹنگ کا جذبہ

آج کے دور میں جب کہ دہشت گردی اور قتل وخوں ریزی کا بازار گرم ہے، میدان عمل سے رپورٹنگ کرنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی ہے۔ آسان اس لئے کہ آج انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی نے بہت سی سہولیات فراہم کر دی ہیں اور کسی بھی مقام تک پہنچنا اور پھر وہاں سے رپورٹنگ کرنا زیادہ مشکل نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن انفرااسٹرکچر کی سہولیات کے ساتھ ساتھ جس قدر حالات مخدوش ہو گئے ہیں یا ہو رہے ہیں، یہ کام بہت ہی صبر آزما بھی ہو گیا ہے۔ اگر آپ نے ذرا بھی بے پروائی کی تو آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی اور ممکن ہے کہ اپنے فرض کی ادائگی کرتے کرتے چلی بھی جائے۔ لیکن اس کے باوجود صحافیوں کی ٹیم کہیں بھی پہنچنے اور حقائق کو عوام تک پہنچانے سے دریغ نہیں کرتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق ہے، وہ اپنے کام سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ اس کی ان کو قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ خطرات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر صحافی میدان جنگ سے رپورٹنگ کر رہا ہے یا کسی ایسے ملک سے کر رہا ہے جہاں خانہ جنگی چھڑی ہوئی ہے یا مختلف گروہ آپس میں متحارب ہیں تو میدان عمل میں نکلا ہوا صحافی کسی بھی وقت کراس فائرنگ کی زد میں آ سکتا ہے یا زمینی سرنگوں کا شکار بن سکتا ہے۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اگر متحارب گروہ کے عزائم ایسے ہیں کہ وہ میڈیا کو اپنے حق میں جھکانا چاہتے ہیں اور اس کی مدد سے اپنے مخالفین پر حاوی ہونا چاہتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے حق میں رپورٹنگ کی جائے اور صرف انہی کی بات لوگوں تک پہنچائی جائے یا دوسروں کی بات بھی اگر کی جائے تو اس انداز سے کی جائے

کہ اس سے انہی کا فائدہ ہو مخالف گروہ کا نہ ہو۔ ایسی صورت میں صحافی اور رپورٹر پر بہت بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا کام انتہائی ایمانداری کے ساتھ کرے اور کسی کی حمایت کرنے کے بجائے حق کی حمایت کرے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے، اس میں بہت خطرات ہیں اور اس کا حوصلہ ہر صحافی کے دل میں نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی رپورٹر کسی ایسی جگہ پر تعینات ہے جہاں دہشت گردی کا راج ہے تو دہشت گردوں کی خواہش ہوگی کہ وہ ان کے حق میں رپورٹنگ کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ صحافیوں کا اصل امتحان ایسے ہی مقامات پر ہوتا ہے۔ تاہم دیکھا گیا ہے کہ ایماندار صحافی اپنی جان خطرے میں ڈال دے گا اور ضرورت پڑی تو اسے نچھاور بھی کر دے گا لیکن وہ حق گوئی کی راہ سے نہیں ہٹے گا۔

پاکستان کے وادی سوات میں جیو ٹی وی کے نامہ نگار موسی خان کا بہیمانہ قتل حق گوئی کی خاطر اپنی جان قربان کر دینے کی ایک اور زندہ و تابندہ مثال ہے۔ سرفروش اور جاں باز صحافیوں کی صف میں موسی خان تنہا نہیں ہیں بلکہ اپنے فرض کی ادائگی کے دوران اپنی جان نچھاور کر دینے والوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ستون دار پر اپنے سروں کے چراغ روشن کرنے والے پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ ایسے صحافی ہر جگہ موجود ہیں۔ ہندوستان ہو یا پاکستان، عراق ہو یا افغانستان، سری لنکا ہو یا صومالیہ، روس ہو یا غزہ کی پٹی۔ کسی بھی جگہ جان کی بازی لگا کر رپورٹنگ کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

اکبر الہ آبادی نے تو بہت پہلے قلم اور میڈیا کی طاقت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو۔ آج قلم کے ساتھ ساتھ مائک اور کیمرے بھی آ گئے ہیں اور توپ و تفنگ کا مقابلہ آج ان اوزاروں سے بھی کیا جا رہا ہے۔ حق و انصاف کی آواز دبانے والے پہلے جہاں قلم اور اخبار سے خائف رہا کرتے تھے، وہ آج قلم اور اخبار کے علاوہ مائک اور کیمروں سے بھی خوفزدہ ہیں اور جان ہتھیلی پر لے کر رپورٹنگ کے لئے نکلنے والوں کی آواز دبانے اور ان کا حوصلہ پست کرنے کے لئے آج بھی ظلم و استبداد کی وہ

روایت اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے ساتھ موجود ہے جو انگریزوں نے مولانا باقر اور دوسرے صحافیوں کے سروں کو قلم کرنے کے ساتھ قائم کی تھی۔

وادی سوات واحد علاقہ نہیں ہے جہاں کسی صحافی کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑا ہے۔آج پوری دنیا میں صدائے حق بلند کرنے والوں کو اس کی بھرپور قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ان کی آواز دبانے کے لئے صرف دہشت گرد اور انتہا پسند تنظیمیں ہی سرگرم نہیں ہیں بلکہ بعض حکومتوں کی جانب سے بھی صحافیوں پر یہ ظلم روا رکھا جا رہا ہے۔طاقتور حکومتیں ان کی آواز کو خریدنے کی بھی کوشش کرتی ہیں اور اس کے لئے منھ مانگی رقم اور دنیا جہان کی آسائشیں دینے کو تیار رہتی ہیں۔لیکن ان صحافیوں کے بیچ میں ایسے گندم نما جو فروشوں کی بھی کمی نہ پہلے تھی نہ آج ہے جو قلم کے تقدس کا سودا کرنے کو تیار رہتے ہیں۔آج جہاں صدائے حق بلند کرنے والوں کی کمی نہیں ہے وہیں سکوں کی جھنکار میں حق و انصاف کا گلا دبا دینے والے اور اپنی گمراہ کن تحریروں سے لوگوں کو بھٹکا دینے والوں کی بھی ایک فوج موجود ہے۔

لیکن بہرحال موسی خان کے قتل کے بعد پاکستانی صحافیوں نے جس جرات و حوصلے کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔جیو ٹی وی کے ایگزیکیٹو ایڈیٹر حامد میر نے سوات میں پریس کانفرنس کر کے انسانیت دشمنوں کو ان کی ماند میں للکارنے کی جرات دکھائی ہے۔انہوں نے کہا کہ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے اور اپنا کام کرتے رہیں گے اور یہ کہ ہم یہاں قلم مائک اور کیمرے کے ساتھ آئیں گے اور جس کو ہمیں مارنا ہو اور ہمیں قتل کرنا ہو وہ آئے اور ہمیں حق گوئی کی سزا دے۔ان کا یہ اعلان اس بات کا گواہ ہے کہ پاکستان میں بھی اب جرات مند میڈیا کا دور آ گیا ہے اور اب فوجی بوٹوں سے بھی اس کا سر کچلا نہیں جا سکتا۔ممبئی حملوں میں زندہ پکڑے گئے اجمل عامر قصاب کے گھر اور اس کے گاؤں کا پتہ سب سے پہلے جیو ٹی وی ہی نے لگایا اور خفیہ کیمرے سے شوٹنگ کر کے دنیا کے سامنے سچائی رکھ دی۔اسی طرح ڈان نیوز بھی صحافتی کارنامے انجام دے رہا ہے۔ایک وقت تھا جب پاکستان میں پی ٹی وی ہی کا زمانہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میڈیا کے

شعبے میں پی ٹی وی کی اجارہ داری تھی۔لیکن پاک میڈیا کو احسان مند ہونا چاہئے سابق صدر پرویز مشرف کا، جنھوں نے پی ٹی وی کی اجارہ داری توڑی اور پرائیویٹ چینلوں کا دور شروع کیا۔حالانکہ ان کو اسی پرائیویٹ میڈیا نے صدائے حق بلند کرتے ہوئے شدید تنقیدوں کا نشانہ بھی بنایا تھا اور اس پر انھوں نے اپنے آخری دور میں اظہار شکوہ بھی کیا تھا۔لیکن بہر حال میڈیا کو اپنا کام کرنا ہے اور وہ کر رہا ہے۔جس دباؤ اور جس خطرے کے ماحول میں پاکستانی صحافی کام کر رہے ہیں، اس کے لئے انہیں خراج تحسین پیش کرنا چاہئے۔موسی خان سے پہلے بھی لوگوں کو رپورٹنگ کی سزا ملی ہے۔ابھی کچھ دنوں قبل ہی ساوتھ ایشیا فری میڈیا ایسوسی ایشن یعنی سافما سے وابستہ سینئر صحافی امتیاز عالم پر حملہ کیا گیا اور ان پر حکم صادر کیا گیا کہ وہ خاموش رہیں، اپنی زبان بند رکھیں۔لیکن انہوں نے بھی صحافیوں کے احتجاج میں حصہ لیا۔گویا انھوں نے اپنے عمل سے یہ بتا اور جتا دیا کہ انہیں دھمکیوں اور حملوں سے ڈرایا اور دبایا نہیں جا سکتا۔اس سے قبل بھی ملکی اور غیر ملکی صحافیوں کو نشانہ بنایا جا تا رہا ہے۔وال اسٹریٹ جرنل سے وابستہ امریکی صحافی ڈینیل پرل کا اغوا اور پھر اس کے قتل کا واقعہ ابھی تک لوگوں کو یاد ہوگا۔جس پر امریکی جاسوس ہونے کا الزام تھا۔ ڈینیل پرل کی تقرری ممبئی میں تھی اور وہ آئی ایس آئی اور القاعدہ کے مابین رشتے کی سچائی جاننے کے لئے پاکستان گیا تھا جہاں کراچی میں اس کا اغوا کیا گیا اور پھر کچھ دنوں کے بعد یکم فروری 2002 کو اس کا سر قلم کر دیا گیا تھا۔اس کے قتل کے الزام میں اسی سال جولائی میں ایک برطانوی شہری احمد قمر شیخ سعید کو موت کی سزا دی گئی۔

رپورٹوں کے مطابق میدان جنگ سے یا ایسے ملکوں سے رپورٹنگ کرنا جان کو جوکھم میں ڈالنا ہے جہاں مختلف گروہ آپس میں متحارب ہوں۔اس وقت صحافیوں کے لئے سب سے مخدوش ملک عراق ہے جہاں ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے سب سے زیادہ صحافی مارے جا رہے ہیں۔جنیوا کے ایک میڈیا ادارے Press Emblem Campaign (پی ای سی) کے مطابق سال 2007 میں عراق میں سب سے زیادہ صحافی مارے گئے تھے۔اس کا

کہنا ہے کہ عراق کے بعد دوسرا مخدوش ملک صومالیہ ہے۔تیسرا سری لنکا، چوتھا پاکستان، پانچواں فلپینس، چھٹا ہیٹی، ساتواں کولمبیا اور آٹھواں میکسکو ہے۔افغانستان بھی صحافیوں کے لئے مخدوش ملک ہے۔وہاں بھی ان کا قتل ہوتا رہتا ہے۔مذکورہ ادارے نے 27 ملکوں کی ایک فہرست بنائی ہے جس میں ہندوستان، نیپال، امریکہ، روس، اریٹیریا، اور گواٹے مالا وغیرہ بھی شامل ہیں۔میڈیا کے ایک بین الاقوامی ادارے انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹ(آئی ایف جے) کے مطابق 2007 میں عراق میں سب سے زیادہ 175 صحافی ہلاک کئے گئے تھے۔ جبکہ 2006 میں 96اور 2005 میں 68 صحافیوں کو ہلاک کیا گیا تھا۔اور وہاں 1995 میں جنگ کے آغاز سے لے کر اب تک ڈھائی سو سے زیادہ صحافی مارے گئے ہیں۔ پی ای سی کا کہنا ہے کہ غزہ کی پٹی بھی صحافیوں کے لئے بہت مخدوش ہے کیونکہ وہاں اسرائیلی فوجی صحافیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔اس کا مزید کہنا ہے کہ اس سال غزہ میں چار اور روس اور وینیزویلا میں دو دو صحافیوں کو ہلاک کیا گیا ہے۔جبکہ پاکستان میں بھی چار مارے گئے ہیں جن میں دو خودکش حملے کے شکار بن گئے اور دو رپورٹروں کا قتل کیا گیا۔صومالیہ میں نئے سال پر ایک صحافی مارا گیا۔اس ادارے کا کہنا ہے کہ گذشتہ سال صحافیوں کی ہلاکت میں کمی آئی تھی اور 91 صحافیوں کا قتل کیا گیا۔

پی ای سی کا کہنا ہے کہ متعدد صحافیوں کو سیاسی اختلافات کے سبب بھی ہلاک کر دیا جاتا ہے۔اس نے اس سلسلے میں روس کی مثال پیش کی ہے جہاں 2006 میں روسی صحافی Anna Politkovskaia کو قتل کیا گیا۔اس کی دوسری مثالیں بھی موجود ہیں۔استنبول ترکی میں Hrant Dink کو، زمبابوے میں Edward Chikombo کو، ہیٹی میں Francois Latour کو، بوکاؤ میں Serge Okapi کو اور رنگون میں Kenji Nagai کو قتل کیا گیا۔

پی ای سی کے صدر ہدایت عبد النبی نے صحافیوں کے تحفظ پر زور دیا ہے اور ایک مسودہ اقوام متحدہ کے حوالے کیا ہے۔صحافیوں کو لاحق خطرات کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ

عراق جنگ کے دوران بیشتر صحافی اپنے ہوٹلوں سے ہی رپورٹنگ کرتے رہے، وہ محاذ جنگ پر نہیں جا سکتے تھے یا ان کو جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ایسی صورت حال میں صحافی وہی بات لوگوں تک پہنچا سکتا ہے جو اسے سرکاری طور پر حاصل ہوگی۔ وہاں کے معاملات میں عمل دخل رکھنے والے طبقے سے حاصل ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں خبر کا ذریعہ اور کوئی نہیں رہ جاتا۔

بہر حال فرائض منصبی کی ادائگی اپنی جگہ پر اور خطرات و خدشات اپنی جگہ پر۔ یہ بھی ایک سچائی ہے کہ حق کی آواز جس قدر دبائی جاتی ہے، اسی قدر بلند ہوتی ہے۔ یہاں برسبیل تذکرہ ایک بات اور کہہ دینی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ آج عالمی میڈیا پر یہودی لابی کا قبضہ ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے بہت سی گمراہ کن باتیں بھی پیش کی جاتی ہیں اور ان کی شبیہ داغدار کی جاتی ہے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سچ کا ساتھ دینے والے بھی کم نہیں ہیں۔ اور پھر قتل و خوں ریزی کی زبان میں اپنی بات نہیں کہی جا سکتی۔ گمراہ کن میڈیا کا جواب انصاف پسند میڈیا سے دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال آج جو صورت حال پوری دنیا میں ہے، بالخصوص صحافیوں کے تحفظ کے تعلق سے، اس پر انسانی حقوق کے علمبرداروں کو بجا طور پر تشویش ہے۔

محاذ جنگ کے تجربات

محاذ جنگ پر کام کرنا کتنا دشوار اور موت کو دعوت دینے والا ہوتا ہے اس کا اندازہ Stephen Hess اور Marvin Kalb کی کتاب The Media And The War On Terrorism کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔اس کتاب میں ایسے صحافیوں کے تجربات بیان کئے گئے ہیں جو نائن الیون کے بعد مختلف ملکوں سے رپورٹنگ کر رہے ہیں۔ ان میں افغانستان اور فلسطین و اسرائیل میں تعینات صحافیوں کے ذاتی تجربات قابل مطالعہ ہیں۔ مائکل گورڈن (Michel Gordon) ایک مصنف اور نیو یارک ٹائمز

کے لندن کے رپورٹر ہیں۔ جب نائن الیون کے بعد افغانستان پر امریکی حملہ ہوا تو وہ بھی ایمبڈ ڈ صحافیوں کے ساتھ افغانستان سے رپورٹنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب القاعدہ کے گڑھ تورابورا کی پہاڑیوں پر اتحادی افواج کا قبضہ ہو گیا تو ہم لوگوں نے اس پہاڑی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ صحافیوں کا گروپ مقامی باشندوں کے ساتھ تھا جو ترجمے کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تورابورا کی پہاڑیوں میں چند میل کی مسافت طے کرنے کے بعد اچانک ایک عجیب وغریب صورت حال پیدا ہو گئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہم لوگ ایک نیم تاریک چوکی کے پاس تھے اور ہمارے ساتھ فائٹرس کا ایک گروپ تھا۔ ہم ان سے بات کرنا اور ان سے انٹرویو کرنا چاہتے تھے کہ اچانک ریڈیو پر ایک پیغام نشر ہوا اور پھر ہر شخص اپنے ہتھیاروں اور اے کے 47 رائفلوں کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ لوگ ہتھیار لے کر باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ ہم نے سوچا کوئی بات نہیں یہ القاعدہ کا گڑھ ہے۔ یہ سب تو ہونا ہی ہے۔ جنگ تو جیت لی گئی لیکن لڑائی اب بھی جاری ہے۔ ہم القاعدہ کے جوانوں کو دیکھنا چاہ رہے تھے۔ لیکن پتا چلا کہ لڑائی القاعدہ والوں سے نہیں ہو رہی ہے بلکہ ایسے دو متحارب افغان گروہ آپس میں لڑ پڑے ہیں جو امریکی افواج کے حلیف تھے اور جنھوں نے ان کی مدد کر کے القاعدہ کو شکست دینے میں تعاون دیا تھا۔ ہم ان کے درمیان پھنس گئے تھے۔ دراصل یہ لڑائی اس لئے ہو رہی تھی کہ مال غنیمت پر کس کا قبضہ ہوگا۔ ہم لوگوں نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔

اسی طرح واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹر کیرول موریلو (Carol Morello) نے اپنے تجربات بیان کئے ہیں جس میں انھوں نے یہ تو بتایا ہی ہے کہ محاذ جنگ سے رپورٹنگ کتنی مشکل ہوتی ہے ساتھ ہی اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ افغانستان کی جنگ کے دوران کس طرح اصلی رپورٹنگ سے باز رکھا جاتا تھا اور صرف وہی چیزیں لکھنے کی اجازت تھی جو اتحادی افواج کو سوٹ کرتی تھیں۔ موریلو کہتی ہیں کہ میں صحافیوں کے ایک ایسے گروپ کے ساتھ تھی جو امریکی بحری افواج کے ساتھ چل رہا تھا۔ ایک روز ہم لوگوں کو Camp

Rhino جانے کی اجازت مل گئی۔ اسے پنٹاگن کی بریفنگ کے دوران کیمپ رائنو کہا جاتا تھا لیکن ہم لوگ یہ نام استعمال نہیں کرتے تھے۔ بلکہ قندھار سے دور ایک ریگستانی علاقہ کہتے تھے۔ وہاں ہم نے پانچ روز گزارے۔ ہم جنگ زدہ خطے میں جا رہے تھے اور فوج نے ہمیں ہیلمٹ، فلیک جیکٹ، بائیو کیم وار سوٹ اور گیس ماسک دے رکھے تھے تاکہ بوقت ضرورت ان کو استعمال کیا جا سکے۔ ہم ایک فیچر اسٹوری سے دوسری فیچر اسٹوری کے لئے جگہ جگہ بھاگتے رہے۔ بارہا ایسے مواقع آئے کہ بریکنگ نیوز ہمارے سامنے تھی لیکن ہمیں اس کی رپورٹنگ سے منع کر دیا جاتا۔ ہم ایک کھوہ میں اپنی راتیں گزارتے۔

ایک روز ہمیں رکھائی کے ساتھ بلایا گیا اور کہا گیا کہ اب ہمیں دوسری جگہ جانا ہے۔ ہم لوگ ایک وسیع وئیر ہاوس میں اپنی اسٹوری تیار کرنے لگے کہ رابطہ عامہ کے ایک افسر نے آکر ہم سے کہا کہ سب لوگ یہاں آجائیں آپ لوگوں کے لئے میرے پاس ایک خبر ہے۔ کچھ لوگوں کی موت ہو گئی ہے جنھیں کیمپ رائنو میں لایا گیا ہے۔ مرنے والوں میں امریکی اور افغان دونوں ہیں۔ ہر رپورٹر کو ایک امید بندھ گئی۔ اتنے میں ایک دوسرا افسر آیا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ سیٹ کیا اور ایک پریس ریلیز نکالی۔ یہ پریس ریلیز یہاں سے سات ہزار میل دور فلوریڈا کے ٹامپا میں تیار کی گئی تھی۔ بہر حال مرنے والوں کی لاشیں ہم سے سوفٹ کے پیچھے ایک طبی خیمے میں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ باتیں کرنے لگے اور افسر سات ہزار میل دور تیار کردہ ریلیز پڑھنے لگا جس میں کہا گیا تھا کہ ایک دوستانہ جنگ میں یہ ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ اور جنگ کے دوران بی 52 بمبار طیارے استعمال ہوئے ہیں۔

اس وقت رپورٹروں کی حالت بھوکے کتوں جیسی تھی جو خبر حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھے۔ ایک فوٹو گرافر نے کہا کہ کیا میں ان کی تصویریں لے سکتا ہوں؟ جواب دیا گیا نہیں۔ ایک پرنٹ رپورٹر نے پوچھا کہ کیا ہم وہاں جا کر کھڑے ہو سکتے ہیں؟ جواب دیا گیا نہیں۔ افسر نے ہم سے پوچھا کہ کیا تم مردہ امریکیوں کو دیکھنا چاہتے ہو؟ ہم نے کہا، نہیں، یہ تو ہماری ڈیوٹی ہے۔ پھر ہم نے پوچھا کہ کیا ہم اس پائلٹ سے بات کر سکتے ہیں جو

ان لاشوں کو لایا ہے؟ پھر کہا گیا نہیں۔ کیا ہم ڈاکٹروں میں سے کسی سے بات کر سکتے ہیں؟ نہیں وہ سب بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کتنی عجیب وغریب صورت حال تھی کہ ہم سے سوفٹ کی دوری پر بریکنگ نیوز موجود تھی اور ہم بے بس تھے، کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں صرف وہی خبریں ملتی تھیں جو واشنگٹن سے آتی تھیں۔ ہم آزادانہ طور پر کوئی خبر نہیں دے سکتے تھے، ہماری تمام درخواستیں رد کر دی جاتی تھیں۔

بیشتر رپورٹر مقامی لوگوں سے دوستی کر لیتے اور ان سے بہت سی اطلاعات ان تک پہنچتی رہتی تھیں۔ کئی رپورٹروں نے بتایا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر ایسی صورت حال میں گرفتار ہو جاتے ہیں جہاں زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ اگر آپ سڑک کے اس طرف ہیں تو محفوظ ہیں اور اگر دوسری طرف چلے گئے تو موت آپ کے استقبال کو موجود ہے۔ اسی طرح مشرق وسطی میں رپورٹنگ کے دوران پیش آمدہ مشکلات اور موت سے بار بار واسطہ پڑنے کے تجربات بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ میدان جنگ سے رپورٹنگ کرنے والے صحافی کس طرح اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر چلتے ہیں۔

رپورٹنگ کے حوالے سے خطرناک ترین علاقہ

آزادی صحافت اور صحافیوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی عالمی تنظیم کا کہنا ہے کہ آج کا سوات صحافیوں کے لیے دنیا کے خطرناک ترین علاقوں میں سے ایک ہے جہاں 'دہشت کے راج' کی وجہ سے عورتوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کے واقعات میڈیا میں کم سے کم رپورٹ ہو رہے ہیں۔ فرانس میں قائم رپورٹرز سانس فرنٹئرز (آر ایس ایف) نامی تنظیم نے یہ بات اپنی ایک تازہ رپورٹ میں کہی ہے۔ تنظیم کے مطابق یہ رپورٹ آر ایس ایف کے نمائندوں نے سوات کا دورہ کر کے وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد مرتب کی ہے۔

رپورٹ میں وفاقی اور صوبائی حکومت اور عسکریت پسند رہنماؤں سے مطالبہ کیا گیا

ہے کہ وہ علاقے میں صحافیوں کی آزادی اور تحفظ کو یقینی بنائیں۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 'سوات میں شریعت کے نفاذ کا جو اثر آزادی صحافت پر ہو رہا ہے اس پر آر ایس ایف کو سخت تشویش ہے۔ علاقے میں تشدد کے استعمال کے بڑھتے ہوئے رجحان نے جو موسیٰ خان کے قتل کا سبب بنا، دہشت اور زبان بندی کے ساتھ مل کر سوات کو صحافیوں کے لئے دنیا کے خطرناک ترین علاقوں میں لا کھڑا کیا ہے'۔

تنظیم کا کہنا ہے کہ اگر مقامی طالبان شریعت کے نفاذ کو علاقے کے باشندوں اور صحافیوں کے اظہار رائے کی آزادی کو چھیننے کے لیے استعمال کرتے ہیں تو یہ افسوسناک ہوگا۔ 'طالبان اور عسکریت پسند رہنما مولانا فضل اللہ نے اپنے غیر قانونی ایف ایم ریڈیو چینل کے ذریعے وادی میں دہشت کی جو فضاء قائم کی ہے وہ اظہار رائے کی آزادی کو براہ راست متاثر کر رہی ہے اور اس سے صحافیوں میں زبان بندی کا رجحان بڑھا ہے'۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سوات میں نفاذ شریعت کے لیے صوبائی حکومت سے معاہدہ کرنے والے تحریک نفاذ شریعت محمدی کے سربراہ مولانا صوفی محمد نے آر ایس ایف کی ٹیم کو بتایا کہ وہ صحافت کی آزادی پر یقین رکھتے ہیں تاہم انہوں نے یہ دعوی بھی کیا کہ شریعت طالبان کی کارروائیوں سمیت ماضی کے واقعات پر بات کرنے سے منع کرتی ہے۔

رپورٹ میں سوات کے موجودہ ماحول پر مقامی صحافیوں کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ ایک ٹی وی رپورٹر کے بقول 'آزاد صحافت دن بدن مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے ان طالبان جنگجوؤں سے کون بچائے گا جو کھلے عام قصبوں اور دیہات میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اب ہم طالبان کی کارروائیوں کی آزادانہ رپورٹنگ نہیں کر سکتے'۔

مقامی اخبارات کو خبروں کی اشاعت میں الفاظ اور اصطلاحات کے چناؤ پر بھی دباؤ اور دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ طالبان خودکش بمبار کی اصطلاح پسند نہیں کرتے

بلکہ وہ خود کو فدائین لکھوانا پسند کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف فدائی کا لفظ فوج کو ناگوار گزرتا ہے۔

آر ایس ایف کا کہنا ہے کہ سوات میں دو سالوں سے جاری لڑائی نے مقامی میڈیا کو بری طرح مجروح کیا ہے اور اس دوران صحافی فوج اور عسکریت پسندوں کی بندوقوں سے نکلنے والے بارود کے بیچ پھنس کے رہ گئے ہیں اور ’لڑائی کے فریقین نے میڈیا کو ان زیادتیوں کے بارے میں بات کرنے سے روکا ہوا ہے جو نفاذ شریعت یا دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر ہو رہی ہیں‘۔ رپورٹ میں علاقے کے ایک اور صحافی کے تاثرات کچھ یوں بیان کیے گئے ہیں کہ ’اپنی زندگی بچانے کے لیے ہمیں اپنے آپ کو سنسر کرنا پڑے گا اور فریقین ہمیں پہلے ہی خبردار کر چکے ہیں کہ آپ سنسنی خیزی سے گریز کریں تاکہ امن معاہدہ خطرے میں نہ پڑے‘۔

رپورٹ کے مطابق سوات میں چھ اخبارات شائع ہوتے ہیں اور اخبار تقسیم کرنے والے ایک ادارے کے اہلکار کے بقول وادی میں دوسرے اضلاع کے مقابلے میں اخبار پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ’مقامی روزنامہ شمل کی یومیہ آٹھ ہزار اور روزنامہ آزادی کی پانچ ہزار کاپیاں شائع ہوتی ہیں‘۔ آر ایس ایف کا کہنا ہے کہ علاقے میں نفاذ شریعت کے معاہدے نے علاقے کے لوگوں کے لیے معلومات تک رسائی کے عمل پر منفی اثر ڈالا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سوات میں صحافیوں اور اخباری اداروں پر ہونے والے حملوں کی ذمہ داری قبول کرنے سے طالبان اور فوج دونوں تردید کرتے رہے ہیں لیکن اصل میں دونوں ہی ان واقعات میں ملوث پائے گئے۔

آن لائن میڈیا: ایک جائزہ

اکیسویں صدی میں انٹرنیٹ کے شعبے میں بھی زبردست ترقی ہوئی ہے۔ انٹرنیٹ آج ہماری زندگی کو پوری طرح محیط ہو گیا ہے۔ تعلیم ہو یا تجارت، سیاست ہو یا محبت آج ہر شعبہ زندگی آن لائن ہوتا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے کام کرنے کی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور کاروبار زندگی کی رفتار میں بھی تیزی آئی ہے۔ کوئی سرکاری ادارہ ہو یا پرائیویٹ، چھوٹا ہو یا بڑا ہر جگہ انٹرنیٹ نے اپنے قدم جما لئے ہیں۔ یہاں تک کہ یک نفری ادارے بھی آن لائن ہو کر اچھی خاصی کمائی کر رہے ہیں۔ نوکری ڈاٹ کوم پر آپ ملازمت تلاش کر سکتے ہیں اور جیون ساتھی ڈاٹ کوم پر اپنی پسند کی شریک حیات ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اس قسم کی دوسری اور بھی بہت سی سائٹس ہیں جو آپ کو زندگی کے دوسرے شعبوں میں رہنمائی کے لئے موجود ہیں۔

انٹرنیٹ بھی میڈیا کا ایک حصہ ہے لہذا میڈیا پر بھی اس کے اثرات پڑے ہیں اور آن لائن صحافت یا آن لائن جرنلزم کا دائرہ بھی کافی وسیع ہوا ہے۔ آج دنیا بھر میں بے شمار آن لائن اخبارات ورسائل ہماری معلومات میں اضافہ کے لئے موجود ہیں۔ اور ایک اہم بات یہ ہے کہ آن لائن اخبارات ورسائل اپنی سوچ اور اپنے نقطہ نظر کے حوالے سے کافی وسیع القلب اور وسیع النظر ثابت ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے تعلق سے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی تنگ نظری آن لائن جرنلزم میں کم نظر آتی ہے۔ جو لوگ اس شعبہ صحافت سے وابستہ ہیں ان کی سوچ کافی کھلی ہوئی ہے اور وہ کافی لبرل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں موضوعات کا تنوع بھی

ہے اور مخالف نقطہ نظر کے لئے بہت حد تک گنجائش بھی ہے۔ اگر کسی مضمون پر کسی کی مخالفانہ رائے آتی ہے تو اسے بھی مناسب انداز میں جگہ دی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں معاندانہ مضامین اس میڈیم میں بھی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان کے جواب میں بھرپور اور مدلل مضامین بھی دکھائی دیتے ہیں جو مسلمانوں کے موقف کو بہتر انداز میں پیش کرتے ہیں۔

انٹرنیٹ کی توسیع اور اس کی فوری رسائی نے ہر شعبے کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ اور اب تو انٹرنیٹ پر تعلیمی سلسلہ بھی تیز ہو گیا ہے۔ آن لائن ٹیوشن کا سلسلہ تو پہلے سے موجود تھا اب یونیورسٹیوں کی جانب سے ای ایجوکیشن کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ آپ کو کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہے آپ گھر بیٹھے اپنی تعلیم مکمل کر سکتے ہیں اور ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی بھی اس قسم کے کورسوں میں داخلہ دے رہی ہے۔ آپ اب گھر بیٹھے نہ صرف وہ کورس کر سکتے ہیں بلکہ انٹرنیٹ کی مدد سے ہی دنیا بھر میں ہزاروں افراد سے رابطہ بھی قائم کر سکتے ہیں اور ان سے تعلیمی سلسلے میں مشورہ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ انٹرنیٹ کے اچھے جانکار ہیں تو اپنے گھر سے ہی ای ٹیوشن کے ذریعے کافی کمائی کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے گھر سے دنیا کے کسی بھی ملک کے طلبا کو پڑھا سکتے ہیں۔ گرچہ ای ٹیوشن ابھی امریکہ اور برطانیہ میں زیادہ رائج ہے تاہم ہندوستان میں بھی اب اس کا چلن تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ آپ دن میں کہیں اور کام کر سکتے ہیں اور رات میں ای ٹیوشن دے سکتے ہیں۔ کیونکہ بیرونی ممالک کے طلبہ کو ای ٹیوشن دینے کا سب سے بہتر وقت رات کا ہوتا ہے۔

انٹرنیٹ کی مدد سے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے بھی کئے جا رہے ہیں۔ اس کے لئے آپ کا دوسری زبانوں میں ماہر ہونا ضروری نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ ایسے لوگوں تک رسائی حاصل کریں جو دوسری زبانوں میں ترجمے کے فن سے آگاہ ہوں۔ ملٹی ٹرانس میڈیا دہلی کے محمد زماں نے اپنے ایک دوست کے اشتراک سے تقریباً دو سال قبل مختلف زبانوں سے ترجمے کا اپنا ادارہ قیام کیا تھا۔ انہوں نے اس کے لئے الگ سے کوئی دفتر نہیں بنایا

بلکہ اپنے گھر سے اسے شروع کیا اور آج ان کے پاس دنیا کی درجنوں زبانوں کے ترجمے کا کام آرہا ہے اور وہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کلائنٹس کے کام کر کے ان کو مطمئن بھی کر رہے ہیں۔ایک سوال کے جواب میں انہوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ ان لوگوں نے بہت ہی قلیل سرمایے سے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ایک کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کنکشن کی مدد سے اس کام کا آغاز کیا تھا۔ انٹرنیٹ کی غواصی کرنے والوں کو جب ان کے ادارے کا علم ہوا تو انہوں نے ان کے پاس کام بھیجنا شروع کیا۔ابتدا میں ان کو کچھ پریشانی ہوئی خاص طور پر انگریزی سے یوروپی زبانوں میں ترجمے کے سلسلے میں۔لیکن یہ کام اس طرح آسان ہو گیا کہ انفرادی مترجمین بھی آن لائن موجود ہیں اور اداروں سے وابستہ لوگ بھی۔انہوں نے ایسے لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔رفتہ رفتہ ایک نیٹ ورک بن گیا اور آج برصغیر ہندو پاک کی زبانوں کے علاوہ یوروپی زبانوں میں بھی ترجمے کا کام ان کے ادارے میں ہو رہا ہے۔انہوں نے بتایا کہ اس کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے انہوں نے کسی بھی کلائنٹ کو جانے نہیں دیا اور خواہ نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑا انہوں نے سب کے کام کر کے دیے۔ایسا کام زیادہ تر رات میں آتا ہے اور اگر فوری طور پر معاملات طے نہ کر لئے جائیں تو کلائنٹ کے کسی اور کے پاس چلے جانے کا خطرہ بنا رہتا ہے۔چونکہ اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں کسی کے پاس فالتو وقت نہیں ہے اس لئے کوئی اس کا انتظار نہیں کرتا کہ کون سی پارٹی کب جواب دے گی۔ بلکہ جو پارٹی فوراً اور سب سے پہلے جواب دے دے کام اسی کے پاس جائے گا۔محمد زماں کے مطابق زیادہ تر کام ادویہ ساز کمپنیوں کی جانب سے آتا ہے۔

انٹرنیٹ پر ہندوستانی زبانیں

انٹرنیٹ جاننے اور اس پر کام کرنے کے لئے اب انگریزی کا جاننا ضروری نہیں رہ گیا بلکہ اب کئی ہندوستانی زبانیں بھی انٹرنیٹ پر آ گئی ہیں اور وہ لوگ بھی جو چند سال قبل انٹرنیٹ سے گھبراتے تھے، اب انٹرنیٹ پر کام کرنے لگے ہیں۔ وہ ای پیپرس پڑھ رہے ہیں، ای میل بھیج اور وصول رہے ہیں، بلاگ لکھ رہے ہیں اور اپنی زبانوں میں ویب سائٹ

لانچ کر رہے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دو امریکی کمپنیوں مائکروسافٹ اور گوگل نے اسے ممکن کر دکھایا ہے۔ ایک دہائی قبل تک انٹرنیٹ پر ہندوستانی زبانوں کے استعمال میں بہت دشواریاں تھیں۔فونٹس اور کی بورڈ یکساں نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے کسی بھی ہندوستانی زبان کو پڑھنا آسان نہیں تھا۔لیکن ہندی اور اردو کے لئے یونی کوڈ سپورٹ کی ایجاد نے سب کچھ بدل دیا ہے اور اب یہ سارا مرحلہ بہت آسان ہو گیا ہے۔ یونی کوڈ کنسورٹیم کیلی فورنیا کی ایک غیر منفعت بخش کمپنی ہے۔ جس کے ارکان میں گوگل، آئی۔ بی۔ ایم، مائکروسافٹ، اوریکل، سن مائکروسسٹم، یاہو اور حکومت ہند شامل ہیں۔ اس کا حروف کی کوڈنگ کا نیا تصور ہندوستانی زبانوں کے لئے کافی مفید ثابت ہوا ہے۔

انٹرنیٹ پر اردو کا بڑھتا دائرہ

انٹرنیٹ پر اردو کے سلسلے میں بھی بہت کچھ کام ہوا ہے اور اس بارے میں اہم رول اردو لائف ڈاٹ کوم نے ادا کیا ہے۔ اردو لائف ڈاٹ کوم سویڈن کا ایک غیر منفعت بخش ادارہ ہے اور اسے اپنی مدد آپ کے اصولوں پر چلایا جا رہا ہے۔ اس ادارے کا عزم اردو کو دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلے پر لانا ہے۔ اس کا قیام ایک اسکینڈے نیوین کمپنی کے زیر اہتمام کیا گیا۔ آغاز میں یہ ایک سویڈش ویب سائٹ سے منسلک تھا۔ اردو لائف ڈاٹ کوم کو اگست 2000 میں الگ کر کے باقاعدہ ایک مکمل اردو سائٹ کے طور پر پیش کیا گیا۔ شروع میں اس پر صرف اردو کارڈ اور فیکس کی سہولیات میسر تھیں۔لیکن بعد میں اس کا دائرہ بڑھایا گیا اور اور سب سے پہلے اردو کا ایک پلگ ان ڈیولپ کیا گیا۔ جس کے ذریعے ٹروٹائپ اردو فونٹس کو ویب سائٹ پر متعارف کرایا گیا۔ بعد میں اس میں محفل مشاعرہ اور دوسری بہت سی ادبی چیزیں شامل کی گئیں۔ اردو فونٹس کی تیاری ایک صبر آزما اور دشوار گزار مرحلہ تھا مگر اردو لائف نے اس میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔ اردو زبان کا سب سے بڑا مسئلہ ایک عالمی اردو ٹائپ رائٹر کا ہے۔ اس ادارے نے اس بارے میں کافی محنت کی ہے۔ اس نے اس کا حل تلاش کر لیا ہے اور ادارے کے مطابق بہت جلد اردو کے عالمی

ٹائپ رائٹر سے اردو دنیا کو متعارف کرایا جائے گا۔ دنیا کا پہلا اردو کی بورڈ سسٹم، جو کہ ایک عام براوزر کے ذریعے کام کرتا ہے اور جسے استعمال کرنے کے لئے سوائے اردو فونٹ کے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، تکمیل کے آخری مرحلے میں ہے۔

اردو ای میل

اردو لائف ڈاٹ کوم نے اردو ای میل کے لئے اردو پیڈ ڈاٹ کوم (urdupad.com) بنایا ہے۔ جس کے ذریعے آپ یونی کورڈ میں اردو ای میل بھیج سکتے ہیں۔ دنیا بھر میں یہ کافی مقبول ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے کسی چیز کو ڈاؤن لوڈ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ کمپیوٹر میں اردو کی بورڈ ہونا چاہئے۔ اس سے قبل انٹرنیٹ پر اردو لکھنے کا کوئی موثر ذریعہ نہیں تھا۔ اب آپ بغیر کچھ ڈاؤن لوڈ کئے اردو لکھ سکتے ہیں اور یہ یونی کورڈ اردو کسی بھی پروگرام میں کاپی کی جاسکتی ہے بالکل کسی دوسری زبان کی مانند۔

آپ اردو پیڈ کو اس طرح استعمال کر سکتے ہیں:

اردو پیڈ ڈاٹ کوم پر اردو ای میل کو کلک کریں۔ اردو پیڈ پر اردو زبان سلیکٹ (Select) ہے۔ آپ مہیا کئے گئے باکس میں کلک کریں اور اردو لکھنا شروع کر دیں۔

آپ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ سکتے ہیں۔ لیکن بہتر ہوگا کہ آپ ایک لائن پر ایک ہی زبان استعمال کریں۔ اگر انگریزی میں کچھ الفاظ لکھنے ہیں تو نئی لائن کا استعمال کریں۔ اردو پیڈ کے ساتھ کی بورڈ بھی مہیا کیا گیا ہے۔ آپ حروف پر ماوس لائیں گے تو آپ کو لکھا ہوا لفظ نظر آئے گا کہ کس حرف کو دبانے سے اردو کا کون سا حرف لکھا جائے گا۔ انٹرنیٹ کے میدان میں یونی کورڈ ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اس نے اردو اور ہندی زبانوں کے لئے بڑی آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس سے قبل جو سسٹم استعمال کیا جاتا تھا وہ ہندی کے صرف 127 کیرکٹر شامل کر سکتا تھا۔ لیکن یونی کورڈ

سسٹم 56 ہزار کیرکٹرس کو جوڑ سکتا ہے۔ 2006 میں مائکروسافٹ نے، جس کے مرکزی دفاتر ریڈمنڈ واشنگٹن میں ہیں، ہندی زبان کے ابتدائی پورٹلوں میں سے ایک webdunia.com کے ساتھ اپنے ایم ایس این ہندی پورٹل کی شروعات کی۔ اندور کی اس کمپنی کا ایک دفتر امریکا میں بھی ہے۔ مائکروسافٹ نے ہندی کو بنیاد فراہم کی تو گوگل نے اس کی عمارت سازی میں اہم رول ادا کیا۔ کیلی فورنیا کی اس کمپنی نے ہندوستانی زبانوں کی افادیت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے متعدد مصنوعات لانچ کی ہیں۔ گوگل کے ہندی اور اردو سرچ انجن کے توسط سے کوئی بھی شخص انٹرنیٹ پر موجود ہندی اور اردو کے تمام ویب صفحات کو تلاش کر سکتا ہے، یہاں تک کہ انہیں بھی جو یونی کورڈ فونٹ میں نہیں ہیں۔ گوگل انڈیا کے پروجکٹ منیجر راہل رائے چودھری کے مطابق گوگل تیرہ زبانوں میں سرچ کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ جی میل پانچ زبانوں میں اور گوگل ٹرانس لٹریشن گیارہ زبانوں میں، جن میں اردو بھی ہے۔ اردو تازہ ترین زبان ہے جس کا گوگل نے اپنی پیشکش میں اضافہ کیا ہے۔

آج ویب پر صفحات دیکھنے والوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ہندی وکی پیڈیا کی مقبولیت بڑھی ہے۔ اس کا آغاز جولائی 2003 میں ہوا تھا اور اب تک اس میں 36 ہزار سے زائد مضامین ہو چکے ہیں۔ جبکہ اردو وکی پیڈیا کا آغاز جنوری 2004 میں ہوا اور اس میں تقریباً بارہ ہزار مضامین موجود ہیں۔ کوئی بھی ایسا شخص جو انگریزی نہیں جانتا ہے، اردو وکی پیڈیا سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کے لئے http://ur.wikipedia.org/ پر جا کر مضامین تلاش کرکے ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی سے ناواقف افراد کے لئے جدید معلومات حاصل کرنے کا یہ ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ اس پر عربی اور فارسی زبانوں میں بھی سہولیات موجود ہیں۔

ہندوستان میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کو گذشتہ چند برسوں میں کافی فروغ حاصل ہوا ہے اور کروڑوں افراد انٹرنیٹ پر صفحات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان عالمی سطح پر انٹرنیٹ کے استعمال میں بہت پیچھے ہے۔ AKAI Technologies ایک عالمی ادارہ ہے جو پوری دنیا میں انٹرنیٹ کے استعمال پر گہری نظر

رکھتا ہے اور عالمی سطح پر اپنی رپورٹ جاری کرتا ہے۔اس ادارے کی جانب سے اکتوبر 2009 میں جاری رپورٹ کے مطابق ہندوستان انٹرنیٹ استعمال کرنے کے معاملے میں عالمی سطح پر 107 ویں مقام پر ہے۔اور ہندوستان کے اندر سب سے زیادہ انٹرنیٹ استعمال کرنے والی ریاست ہریانہ ہے۔ دہلی چھٹویں نمبر ہے۔ ملک میں جو دس ریاستیں سب سے زیادہ انٹرنیٹ کا استعمال کرتی ہیں، وہ علی الترتیب اس طرح ہیں: ہریانہ، کرناٹک، کیرالہ، گجرات، جموں و کشمیر، دہلی، اڑیسہ، مہاراشٹرا، تمل ناڈو اور اتر پردیش۔ ہریانہ میں انٹرنیٹ استعمال کی اسپیڈ 1271 کے بی پی ایس ہے جبکہ دہلی میں 946 اور اتر پردیش میں 781 کے بی پی ایس۔تاہم انٹرنیٹ اٹیک میں ہندوستان چوتھے نمبر پر ہے۔اس فہرست میں چین سب سے اوپر ہے اور امریکا دوسرے نمبر پر ہے۔چین میں انٹرنیٹ اٹیک 31.35 فیصد ہے، امریکا میں 14.63 اور ہندوستان میں 3.9 فیصد ہے۔

میڈیا کی ایک نئی جہت ای میل صحافت

انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی نے میڈیا کے شعبے میں انقلاب آفریں تبدیلی رونما کردی ہے۔صحافت کے ذرائع جہاں پہلے بہت محدود تھے اب ان میں کافی وسعت آگئی ہے۔انٹرنیٹ نے میڈیا میں کئی جہات پیدا کی ہیں،اور کئی ابعاد جوڑے ہیں۔ان میں ایک اہم جہت ای میل صحافت بھی ہے۔ای میل نے میڈیا کی فوریت، تیز رفتاری اوراثر انگیزی میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔آج کا نوجوان صحافی ای میل کی مدد سے ایسی اسٹوریز سامنے لانے میں کامیاب ہورہا ہے جواس سے پہلے اتنی جلدی ممکن نہیں تھا۔ ہندوستان میں ای میل صحافت کا رواج گزشتہ کچھ برسوں سے بڑھتا جا رہا ہے۔لیکن امریکہ میں ای میل صحافت کا آغاز 1996ہی میں ہوگیا تھا۔اب یہ میڈیم تقریباً پوری دنیائے صحافت میں رواج پاتا جارہا ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ایک بحث کا دروازہ بھی کھل گیا ہے۔دوطبقات پیدا ہوگئے ہیں۔ایک طبقہ ای میل صحافت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہےاوراس کی مدد سے اسٹوریز کرنے کوترجیح دیتا ہے۔ جبکہ دوسرا طبقہ ای میل صحافت کا سخت مخالف ہے۔وہ اسے کاہل صحافیوں کا میڈیم تصورکرتا ہےاور کہتا ہے کہ صحافیوں کو چاہئے کہ وہ فیلڈ میں اتریں،تحقیقاتی رپورٹنگ کریں،محض اسٹینونہ بنیں۔

میڈیا ماہرین کاایک طبقہ ای میل کی مدد سے جرنلزم کرنے کی مخالفت کرتا ہے اوراس میں بہت سے عیوب دیکھتا ہے۔جبکہ دوسرے طبقے کے نزدیک ای میل

صحافت کی کئی خوبیاں ہیں۔ جو دو محاذ قائم ہو گئے ہیں ان میں سے ایک میں صحافیوں کی قدیم یا روایتی نسل ہے تو دوسرے میں نوجوان یا ماڈرن نسل ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ای میل کی حمایت اور مخالفت کے نام پر قدیم اور جدید صحافیوں میں ایک جنگ چھڑی ہوئی ہے تو شائد بیجا نہیں ہوگا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انٹرویو تو بالمشافہ ہونا چاہئے یا زیادہ سے زیادہ ٹیلی فون کے ذریعے ہونا چاہئے، ای میل سے ہرگز نہیں۔ لیکن دوسرا فریق ای میل سے انٹرویو میں بہت سے فوائد اور خوبیاں دیکھتا ہے۔ ای میل کے استعمال پر گہری نظر رکھنے والوں کا خیال ہے کہ خبر نگاری کے دوران ٹیلی فون کے استعمال میں اب ای میل نے مداخلت شروع کر دی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ای میل اور فون انٹرویو میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ کچھ لوگوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر ای میل کے استعمال کا سلسلہ اسی طرح بڑھتا رہا تو وہ صحافت کے پرانے اصولوں پر پانی پھیر دے گا۔ روایتی صحافیوں کا ایک طبقہ تو ای میل ذریعے کا اتنا سخت مخالف ہے کہ وہ اسے پاگل پن کہتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ای میل آئی ڈی کو ہیک کر کے اس کے غلط استعمال کا سلسلہ چل پڑا ہے جو انتہائی خطرناک ہے۔ اس لئے ای میل سے موصول ہونے والی اطلاع پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس سلسلے میں دہشت گرد تنظیموں کی جانب سے ای میل آئی ڈیز کو ہیک کرنے کے واقعات کی مثالیں دیتے ہیں۔ سائبر جرائم نے کئی بے قصور لوگوں کو بھی قصوروار بنا دیا ہے۔ انٹرنیٹ کے فن کی باریکیوں سے واقف دہشت گرد تنظیموں کی جانب سے انجانے لوگوں کے نام سے ای میل کرنے سے ایک خطرناک صورت حال سامنے آ رہی ہے۔ اب اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ کسی کی آئی ڈی پر جو میل آیا ہے وہ واقعی حقیقی ہے یا جعلی۔ لیکن ایسا سوچنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہی ہو رہے ہیں اور سائبر جرائم کے ان واقعات کی وجہ سے ای میل کی افادیت کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ ای میل کی حمایت کرتے ہیں وہ اس سلسلے میں کچھ اس قسم کے دلائل دیتے ہیں: آج کے الیکٹرانک مواصلات فوری، آسان، اثر انگیز اور قابل رسائی ہیں۔ جو مزے ان میں ہیں وہ دوسرے ذرائع میں کہاں۔ ان میں ای میل بھی ہے اور اس کی مدد سے ایسے بہت سے حقائق منظر عام پر لائے جا سکتے ہیں جو ٹیلی فونک انٹرویو سے نہیں لائے جا سکتے۔ کچھ لوگ زبان سے ادا کئے گئے جملوں سے کہیں زیادہ بہتر تحریر کئے گئے جملوں میں نظر آتے ہیں۔ ای میل انٹرویو میں بات چیت کا ریکارڈ رہتا ہے اور ان کے استعمال میں خامیوں اور غلطیوں کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اس کے تحریری ریکارڈ کی وجہ سے کوئی آپ پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آپ نے اس کی باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ ای میل کسی عدالتی مقدمے کی تحریری دستاویز جیسا ہوتا ہے۔ آپ کے سوالوں کے جواب دینے والا کبھی نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے غلط لکھا ہے۔ ای میل سے زبان، مسافت اور وقت کی رکاوٹیں گر جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ ٹیلی فون پر جلد دستیاب نہیں ہو سکتے ایسے لوگ ای میل پر آسانی سے مل جاتے ہیں۔ مصروف ترین لوگوں تک ٹیلی فون سے رسائی آسان نہیں ہوتی یا وہ ملاقات کا وقت جلدی نہیں دے پاتے۔ ایسے لوگوں سے ای میل کے ذریعے آسانی سے ملا جا سکتا ہے۔ ای میل ان تک رسائی کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ جو لوگ انتہائی مصروف ہوتے ہیں اور کسی سے ملنے کا وقت بمشکل نکال پاتے ہیں وہ بھی اپنا ای میل ضرور دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگ ای میل کے ذریعے زیادہ تسلی بخش انداز میں جواب دے پاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جو لوگ بالمشافہ انٹرویو کے حامی ہیں ان کے نزدیک ٹیلی فون سے یا ذاتی ملاقات کر کے انٹرویو کرنے کی بات ہی اور ہے۔ اس سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ بالمشافہ انٹرویو کے دوران جواب دینے والا بے تکلفانہ جواب دیتا ہے۔ (لیکن اس میں ایک خامی کو لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ آپ سامنے

والے کی باتیں تو سن رہے ہیں لیکن اس کی باتوں کو اسی رفتار سے نوٹ کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے جس سے بہت سی باتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ ہاں اگر آپ ٹیپ ریکارڈ استعمال کر رہے ہیں تو یہ دشواری نہیں ہوتی۔ تاہم ٹیپ ریکارڈ استعمال کرنے کی صورت میں اس کو بعد میں سننا اور لکھنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔) ای میل کی مخالفت کرنے والوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک چیز باڈی لینگوئج ہوتی ہے جو ای میل میں دکھائی نہیں دیتی جبکہ بالمشافہ انٹرویو کے دوران آپ باڈی لینگوئج سے بھی روبرو ہوتے ہیں اور اس کو پڑھتے بھی ہیں اور اس کا مفہوم بھی نکالتے ہیں۔ اس کے علاوہ سامنے گفتگو کرنے میں آواز اور شخصیت کا ایک احساس ہوتا ہے۔ آواز کا زیر و بم اور اتار چڑھاؤ بھی بہت کچھ کہتا ہے اور بہت سی باتیں واضح ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی کو آپ کے سوال کا جواب نہیں دینا ہے اور اس نے کہا 'نو کمنٹ'۔ تو اس لفظ کی ادائگی کے انداز اور لہجے سے بھی مفہوم میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور اس کے الگ الگ مطلب نکالے جا سکتے ہیں۔ جبکہ ای میل میں یہ سب باتیں پردۂ راز میں رہتی ہیں۔ ای میل کے ذریعے کوئی فرضی آدمی بھی خوف و ہراس پھیلا سکتا ہے جبکہ ٹیلی فون یا بالمشافہ ملاقات کے دوران ایسے خطرے نہیں ہوتے۔ خبر نگاری کے روایتی طریقے کے مقابلے میں یہ طریقہ کم شفاف اور کم معتبر ہے۔ ای میل کے ذریعے فطری مکالمے کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ بات چیت کے دوران کسی کو بھی سوالوں میں الجھا کر ایسی بات نکلوائی بلکہ اگلوائی جا سکتی ہے جو ایکسکلوسیو خبر بن جائے اور جس کو پڑھنے کے لئے قاری مجبور ہو جائے۔

حالیہ برسوں کے دوران ای میل کے سلسلے میں ہونے والی بحث زیادہ گرم ہو گئی ہے کیونکہ آج کے صحافی اس ٹیکنالوجی کا استعمال رپورٹنگ کا ایک ناگزیر آلہ سمجھ کر رہے ہیں۔ یہ لڑائی کمپیوٹر کے سامنے بڑے ہونے والے رپورٹروں کی نئی نسل اور نیوز روم میں بیٹھ کر کام کرنے والے روایتی رپورٹروں کے درمیان تیز ہوتی جا رہی ہے۔ پرانے

لوگ اس پر مصر ہیں کہ براہ راست بات چیت، وہ خواہ ٹیلی فون پر ہو یا روبرو، سائبر اسپیس مواصلات سے کافی بہتر ہے۔

ٹرانس ورلڈ فیچر کی ایڈیٹر رنجیتا بسواس کہتی ہیں کہ اگر کسی اسٹوری میں کوئی اہم ڈاٹا یا اطلاع ہو تو اسے دوبارہ چیک کرنے کے لئے واپس بھیجا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا عام طور پر فون کے انٹرویو میں ہوا کرتا ہے۔ ای میل انٹرویو میں یہ خرابی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے بیان سے اچانک پھر جائے تو آپ کو ایک تحفظ حاصل رہتا ہے۔ اس کا تحریری ریکارڈ آپ کے پاس ہوتا ہے۔ اسٹوری کے چھپنے تک بلکہ بعد میں بھی حوالے کے لئے ہم سارے جوابات محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

لیکن روزنامہ دی ہندو کے خصوصی نامہ نگار سشانتا تعلقدار بتاتے ہیں کہ میرے سامنے اپنے کسی قریبی دوست کی ایسی کئی مثالیں ہیں جنھیں ہیک کیا گیا تھا اور چند گمراہ کن ای میل بھی ملے جو معلوم آئی ڈی سے جو میری ایڈریس بک میں درج تھے، ارسال کئے گئے تھے لیکن در اصل انھوں نے بھیجا ہی نہیں تھا۔ اس لئے میں رپورٹنگ میں ای میل استعمال کرنے میں زیادہ احتیاط کرتا ہوں۔

وہیں روزنامہ ایشین ایج کولکاتہ کے ایڈیٹر پرویز حفیظ کہتے ہیں کہ بلا شبہہ انٹرنیٹ نے صحافت کے میدان میں ایک انقلاب آفریں تبدیلی پیدا کی ہے۔ ای میل انٹرویو جدید صحافت میں بہت کارآمد ثابت ہوا ہے۔ ای میل نے وقت اور مسافت کو ختم کر دیا ہے۔ بلاشبہہ ای میل انٹرویو اس دور میں ایک بڑی نعمت ہے۔

روزنامہ امر اجالا کے ایکزیکیٹو ایڈیٹر گووند سنگھ بھی ای میل کی ستائش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نے اخبار نویسوں کو زیادہ بااختیار بنا دیا ہے۔ یہ ان لوگوں تک رسائی حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے جن تک آسانی سے نہیں پہنچا جا سکتا۔ وہیں نیوز مڈ ڈے کی ایڈیٹر جینا بندو پادھیائے کے خیال میں ہم ہمیشہ لفظوں ہی سے نہیں بولتے۔ ہم اپنی جسمانی حرکات، چہرے کے آثار اور آواز کے اتار چڑھاؤ کے ذریعے

بھی بہت کچھ اظہار کرتے ہیں۔ یہ خوبی ای میل انٹرویو میں نہیں ہے۔

امریکن پریس انسٹی ٹیوٹ میں ٹیلرڈ پروگرام کے ڈائرکٹر اسٹیو بری نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ ای میل کے منفی پہلو بھی ہیں لیکن وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ٹیلی فون کے نہیں ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ ای میل ٹیلی فون سے بدتر یا بہتر ہے۔ میں ایسا نہیں سمجھتا کہ ای میل صحافت کے پرانے اصولوں پر پانی پھیر دے گا۔بعض ذرائع اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ ای میل مختصر رپورٹنگ کے لئے بہتر ہے۔اس کی تائید ایک بیمہ کمپنی کے نمائندوں نے بھی کی ہے۔ان کے مطابق ای میل سے جواب دینے میں ان کی مصنوعات کے فروخت ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

لیکن ایک سرکردہ اخباری رپورٹر میلون منچر، جو کہ تیس برس تک کولمبیا یونیورسٹی کے گریجویٹ اسکول آف جرنلزم میں پڑھا چکے ہیں اور جنھوں نے رپورٹنگ پر ایک کتاب بھی لکھی ہے، ای میل صحافت کی زبردست مخالفت کرتے ہیں۔ان کے مطابق ای میل پر انٹرویو کرنا پاگل پن ہے۔ یہ سوچ کر ہی خوف ہونے لگتا ہے کہ بہت سارے لوگ دفتروں سے یا گھروں سے باہر نکلنے اور انسانی سرگرمیوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ اس رجحان کا حصہ ہے جس کے تحت ایک رپورٹرز زندگی کی سچائیوں سے منقطع ہوکر رہ جاتا ہے جبکہ ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم زندگی کی سچائیوں کی ہی چھان پھٹک کر رہے ہیں۔

بہرحال اگر ہم گہرائی میں جا کر تجزیہ کریں تو پائیں گے کہ ای میل کے استعمال کی حمایت اور مخالفت اس بات پر منحصر ہے کہ وہ شخص کس دور سے تعلق رکھتا ہے۔اگر ہم نوجوان نسل کے صحافیوں سے بات کریں تو وہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی حمایت کریں گے اور اسی لئے وہ ای میل ذریعے کو بھی پسند کریں گے۔لیکن اگر ہم پرانے یا بہ الفاظ دیگر روایتی صحافیوں سے بات کریں تو وہ اس کی مخالفت کریں گے۔مجموعی طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے۔

میں اس سلسلے میں ایک مثال دینا چاہوں گا۔ سینئر آئی پی ایس آفیسر ایم ڈبلیو انصاری، جو کہ رائے پور میں آئی جی کے عہدے پر فائز ہیں، چند ماہ قبل دہلی آئے اور انہوں نے بعض مسلم صحافیوں سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے اس گروپ میں راقم الحروف بھی تھا۔ آخر میں ہم نے ان سے کہا کہ آپ کو جو چیزیں چاہئیں وہ ہم آپ کو ای میل کر دیں گے۔ اس پر انہوں نے چھوٹتے ہی کہا کہ نہیں بھائی ای میل مت کرنا، بذریعہ ڈاک بھیج دینا۔ ہم نے کہا کہ ای میل سے آپ کو دو سیکنڈ میں تمام معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ کہنے لگے کہ چاہے دو ہفتے لگیں مگر ڈاک سے ہی بھیجنا۔ استفسار کرنے پر انہوں نے شرماتے ہوئے کہا کہ ارے یار ہم لوگوں کو انٹرنیٹ چلانا کہاں آتا ہے۔ لیکن ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر کسی نوجوان سے کسی چیز کی فرمائش کیجئے یا مطالبہ کیجئے تو وہ برجستہ کہے گا کہ میں آپ کو میل کر دوں گا یا آپ میل کر دیجئے۔ گویا یہ محض ٹیکنالوجی کا فرق نہیں ہے بلکہ وقت کا بھی اس میں عمل دخل ہے۔ وقت اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ کون سی چیز آگے چلنے والی ہے اور کون سی نہیں۔

میں ایک مثال اور دینا چاہوں گا۔ جب اردو دنیا میں کمپیوٹر نے قدم رکھا اور ان پیج نے کتابت کی جگہ لینی شروع کی تو ابتدا میں کمپیوٹر کے حروف عجیب سے لگتے تھے۔ اور بعض اخبارات نے خبروں کا میٹر تو کمپوز کرانا شروع کر دیا لیکن سرخیاں ہاتھ ہی سے لکھی جاتی تھیں۔ یہ کہا جاتا تھا اور اس میں بہت حد تک صداقت بھی تھی کہ کتابت اور خطاطی میں جو خوبصورتی ہے وہ کمپوزنگ میں نہیں ہے۔ لیکن وقت نے کتابت کے فن کو ختم کر دیا اور آج کمپوزنگ نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اب نہ تو کمپوزڈ میٹر نگاہوں میں چبھتا ہے اور نہ ہی ہاتھ سے سرخیاں لکھوانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ گویا تبدیلی ایک ناگزیر عمل ہے۔

اسی طرح جب ٹیلی فون کا رواج زیادہ نہیں تھا تو خبر نگاری کے دوسرے ذرائع تھے اور لوگ انھیں ذرائع پر انحصار اور اعتبار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ٹیلی فونک

انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا تو بعض حلقوں نے اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کہا کہ خبر نگاری کے لئے روایتی ذرائع ہی زیادہ موثر اور معتبر ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ روایتی نسل ختم ہوتی گئی اور اس کی جگہ اس نسل نے لے لی جو فون کا استعمال زیادہ کرتی تھی۔ اسی طرح وہ روایتی نسل بھی جو ای میل کی مخالفت کرتی ہے، اپنی جگہ اس نئی نسل کے صحافیوں کے لئے چھوڑ جائے گی جو ای میل کو زیادہ پسند کرتی ہے۔

دراصل دوسرے شعبوں کی مانند صحافت بھی ایسا شعبہ ہے جو زمانے کی تبدیلیوں سے متاثر ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور نئی نئی ٹیکنالوجی سے مستفید بھی ہوتا ہے۔ کمپیوٹر انقلاب نے جہاں دوسرے شعبوں کو زبردست انداز میں متاثر کیا ہے وہیں اس نے صحافت کو بھی متاثر کیا ہے، اور جو شعبہ زمانے کی ترقیات سے فائدہ اٹھانے کے سلیقے سے محروم ہوگا وہ تیز رفتار تبدیل ہوتی دنیا کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ اس لئے اگر آج ای میل ذریعہ روایتی صحافیوں کے لئے کم کشش رکھتا ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ کل کوئی اور ذریعہ کوئی اور میڈیم ایسا پیدا ہو جائے جو ای میل سے بھی زیادہ موثر، زود اثر، پرکشش اور تیز رفتار ہو اور آنے والی نسل ای میل کو فرسودہ قرار دے کر نئے میڈیم سے کام کرنے کو ترجیح دے۔ آج جو چیز نئی ہے کل وہ پرانی ہونے والی ہے اور اس کی جگہ دوسری نئی چیزیں لینے والی ہیں۔ دنیا جمود کا نام نہیں تغیر پذیری کا نام ہے اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے زمانے کا نام ہے۔ جو اس تبدیلی کا ساتھ نہیں دے گا وہ انجماد کا شکار ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھے گا۔

آئی ٹی انقلاب اور
حیات و ممات کے بدلتے آداب

کیا میڈیا کی ترقی ایک روز اسے اس مقام پر پہنچا دے گی کہ برسر کیمرہ تماشائے مرگ ہونے لگے گا اور اسے بنیادی انسانی حقوق کا ایک حصہ مان لیا جائے گا۔ کیا اب وہ دن دور نہیں جب لوگ اپنی وصیت میں یہ بھی لکھا کریں گے کہ ان کی زندگی کے آخری لمحات فلاں ٹی وی چینل کے سامنے گزریں گے اور کیا اب اہم اور سرکردہ شخصیات کی حقیقی موت کی فلم بندی کے حقوق خریدنے کے لئے مقابلہ آرائی ہونے لگے گی؟

یہ سوالات اگرچہ سر دست بہت ہی دوراز کار معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ذہنوں میں اس قسم کے سوالات کے اٹھنے کی ایک وجہ بھی ہے اور وہ وجہ فراہم کی ہے ٹی وی کی ایک اداکارہ ایک سلیبریٹی Jade Guddi (جیڈ گوڈی) نے۔ جس نے اپنی اس عجیب و غریب خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس کی موت کو کیمرے میں ریکارڈ کیا جائے۔ چونکہ اس نے اپنی زندگی کے بیشتر شب و روز کیمرے کے سامنے گزارے ہیں لہٰذا اس کی موت بھی کیمرے کے سامنے ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ کیمرے یا ویب کیم کے سامنے خودکشی کے واقعات بھی ہونے لگے ہیں۔ یہ رجحانات کس جانب اشارہ کرتے ہیں اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی یہ جائزہ بھی ضروری ہے کہ کیا میڈیا یا ریئلٹی ٹی وی کی چکا چوندھ انسانی خواہشات کو ایک ایسی دلدل میں تو نہیں لے جا رہی ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی؟

جیڈ گوڈی کی اس عجیب وغریب خواہش نے پوری دنیا میں ایک بحث کا دروازہ کھول دیا تھا۔اس بحث نے امریکہ اور برطانیہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہندوستان کو بھی۔خاص طور پر انٹرنیٹ حلقوں میں یہ بحث تیز ہوگئی۔اب اس کا دائرہ کافی آگے تک بڑھ گیا ہے۔بحث یہ ہو رہی ہے کہ کیا کسی کی موت کا لائیو ٹیلی کاسٹ مناسب ہے یا نا مناسب، جائز ہے یا ناجائز، قانونی ہے یا غیر قانونی، اخلاقی ہے یا غیر اخلاقی؟ ویب کیمرے کے سامنے خودکشی کا رجحان ہمیں بالخصوص نوجوان نسل کو کہاں لے جائے گا۔

جیڈ گوڈی برطانیہ کی باشندہ تھی۔اس نے پوری زندگی ٹی وی کے رئیلٹی شوز میں کام کیا تھا لہٰذا وہ اپنی موت کو بھی ایک رئیلٹی شو بنادینا چاہتی تھی۔اسے کینسر تھا اور ڈاکٹروں کی پیشین گوئی کے مطابق اس کی زندگی چند دنوں میں ختم ہوگئی۔27 سالہ جیڈ گوڈی دو بچوں کی ماں تھی اور مرنے سے عین قبل اس نے اپنے منگیتر جیک ٹویڈ سے شادی کی تھی۔اطلاعات کے مطابق اس کی موت کے لائیو ٹیلی کاسٹ کے حقوق برطانیہ کے لیونگ ٹی وی نے بھاری قیمت دے کر خرید لئے تھے۔اس کی شادی کی تصاویر بھی فروخت ہوئی تھیں۔OK میگزین نے انہیں سات لاکھ پونڈ میں خریدا تھا۔جبکہ ITV پروڈکشن کمپنی گریناڈا میڈیا نے شادی کی فلم بندی کی تھی۔جیڈ گوڈی کے ایجنٹ میکس کلیفورڈ کے مطابق یہ رقوم جیڈ کے بچوں کا مستقبل سنوارنے میں کام آئے گی۔

جیڈ کے بارے میں ہندوستانیوں کو پہلے کچھ پتہ نہیں تھا۔لیکن 2002ء میں لندن کے ایک رئیلٹی شو Big Brother (بگ بردر) سے یہاں کے لوگوں کو اس کے بارے میں پتہ چلا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس شو میں ہندوستان کی بھی ایک تیسرے درجے کی ٹی وی اداکارہ شلپا شیٹی نے شرکت کی تھی اور اس شو کے دوران جیڈ نے شلپا کے خلاف ایک نسل پرستانہ فقرہ پاس کیا تھا۔جس پر زبردست ہنگامہ ہوا اور بالآخر جیڈ کو اس شو سے جانا پڑا اور شلپا شیٹی شو کی فاتح قرار پائی تھی۔جیڈ کے ریمارکس نے اس وقت بھی ہندوستان میں ایک بحث چھیڑ دی تھی کہ کیا برطانیہ کے لوگوں کے دل و دماغ میں اب بھی نسل پرستانہ جذبات

پہلے کی مانند موجود ہیں؟ اس کے بعد سال 2007 میں ہندوستان میں بھی اسی قسم کا ایک شو کیا گیا جو 90 دنوں تک چلا۔ اتفاق دیکھئے کہ اس شو کی میزبان شلپا شیٹی تھی اور جیڈ گوڈی ایک فیملی ممبر کے طور پر اس میں شامل ہوئی تھی۔ جیڈ کے بارے میں یہاں کے لوگوں کے خیالات اچھے نہیں تھے لیکن اس نے شلپا سے معافی مانگی اور پھر اپنے اخلاق سے بگ باس کے فیملی ممبران کے دل جیت لئے۔

لیکن اسی دوران، جبکہ جیڈ کو بگ باس کے گھر میں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اس کی زندگی میں ایک بھیانک طوفان آ گیا۔ بگ باس کے گھر والے بھی اس طوفان سے متاثر ہو گئے۔ طوفان کینسر کی شکل میں آیا تھا۔ جیڈ کے ڈاکٹروں نے اسے بتایا تھا کہ اسے سروائکل کینسر ہے جو اپنے آخری مرحلے میں ہے اور اس کے پاس اب زیادہ دن نہیں ہیں۔ جیڈ واقعتاً ٹوٹ گئی تھی اور چند دنوں کے بعد بگ باس کا گھر چھوڑ کر برطانیہ چلی گئی تھی۔ جہاں اس کا علاج چل رہا تھا۔ لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس کی عجیب و غریب خواہش نے پوری دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا اور پھر تقریباً پورا ہندوستان اس کے غم میں شریک ہو گیا اور سب کو اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

فلموں میں تو موت کے مناظر دھڑلے سے دکھائے جاتے ہیں۔ چونکہ وہ نقلی اور مصنوعی ہوتے ہیں اس لئے ناظرین کے دل و دماغ پر اس کے منفی اثرات نہیں پڑتے۔ لیکن حقیقی موت کو ٹی وی پر دکھانا؟ ایک شخص کو لمحہ بہ لمحہ مرتے ہوئے ریکارڈ کرنا، اس کی جاں کنی کے عالم کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھنا اور پھر اس کو دنیا کو دکھانا، یہ عجیب و غریب معاملہ ہے۔ فلموں میں موت کے مناظر اس لئے ناظرین کے دلوں پر کوئی دھچکہ نہیں لگاتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جو شخص مر رہا ہے وہ حقیقتاً نہیں مر رہا ہے بلکہ وہ مرنے کی ایکٹنگ کر رہا ہے۔ لیکن جیڈ کو تو حقیقتاً مرنا تھا۔ اس لئے اس کی اس خواہش نے پوری دنیا میں ایک سنسنی خیز ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

جیڈ کی خواہش پر ٹی وی چینلوں پر بھی بحث ہوئی اور سوال کیا گیا کہ کیا کسی کی موت

کا لائیو ٹیلی کاسٹ ہونا چاہئے۔اس معاملے میں قانون کیا کہتا ہے، اخلاقیات کا کیا تقاضہ ہے اور کیا یہ موت جیسی ایک اٹل اور تکلیف دہ حقیقت کو بیچنا نہیں ہے۔کیا اب موت کی بھی سوداگری ہوگی اور کیا آئندہ چل کر ایسے ٹی وی چینل بھی شروع ہو جائیں گے جو صرف حقیقی اموات کو دکھائیں گے اور کیا ان چینلوں کے نام موت ٹی وی، موت کے سوداگر اور ڈیتھ چینل ہوا کریں گے۔اس بحث میں نہ صرف ٹی وی سلیبریٹیز کو شامل کیا گیا بلکہ ان لوگوں کو بھی اس میں حصے دار بنالیا گیا تھا جو بگ بردر اور بگ باس جیسے شوز میں شریک ہوئے تھے۔ قانون دانوں کو بھی اس میں شامل کیا گیا تھا اور میڈیا اداروں کے لئے گائڈ لائنس بنانے یا ان پر زور دینے والے بھی اس بحث کے حصے دار بن گئے تھے۔بگ باس کے فیملی ممبران نے جیڈ کی موت کے حوالے سے کہا کہ موت کے لائیو ٹیلی کاسٹ میں کوئی برائی نہیں ہے اور اگر ایسا کچھ ٹیلی کاسٹ ہوا تو وہ اس کو ضرور دیکھیں گے۔ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر ایک فنکار ایک تلخ سچائی کو اور اس کی اذیتوں کو کیمرے کے سامنے ریکارڈ کروا کر دنیا کو دکھانا چاہتا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔اگر جیڈ ایسا کر کے اپنے بچوں کے لئے کچھ پیسوں کا بندوبست کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنی اولاد کے تئیں ایک ماں کی قربانی کے طور پر بھی دیکھنا چاہئے۔جبکہ بعض ٹی وی اداکارروں کے خیال میں ایسے شوز کی اجازت بالکل نہیں ہونی چاہئے۔ان کے نزدیک یہ تو موت کو بیچنا ہے۔

بعض ماہرین قانون بھی لائیو ٹیلی کاسٹ کے حق میں ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ قانون اس بارے میں خاموش ہے کہ کسی کو اپنی موت کے لائیو ٹیلی کاسٹ کا حق ہے یا نہیں۔نہ تو برطانیہ میں اس سلسلے میں کوئی قانون ہے اور نہ ہی ہندوستان میں۔ہاں اگر کوئی خودکشی کرتا ہے تو اس کے خلاف قانون ہے۔اگر خودکشی کرنے والا کامیاب ہو گیا تو ٹھیک، اور اگر ناکام ہو گیا تو اس کو اس جرم کی پاداش میں سزا ملے گی۔لیکن اپنی موت کو دنیا کو دکھانے کے بارے میں ابھی تک کوئی قانون نہیں بنا ہے۔اس لئے اس کی اجازت ہے۔ٹیلی ویژن پر صارفیت کو فروغ دینے کا الزام لگانے والوں کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ اسی ٹی وی کلچر کی وجہ سے ہو رہا

ہے۔اب ہر چیز بیچی جائے گی اور ہر چیز کی قیمت لگے گی۔خواہ وہ زندگی ہو یا موت۔اب یہ بھی صارفیت کے کلچر کے شکار ہو گئے ہیں۔اس کی اجازت دینا اس کلچر کو اور فروغ دینا ہے جو کہ معاشرے کے لئے کوئی بہتر مثال نہیں ہوگی۔

ویب کیم خودکشی

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب نے جینے کے آداب بدلے ہیں اور مرنے کے انداز بھی۔اب اگر زندگی جینے کی امنگوں میں کئی پہلو جڑ گئے ہیں تو مرنے کے اطوار بھی تبدیل ہونے لگے ہیں۔اور خواہش مرگ میں جو نیا پہلو جڑا ہے وہ انتہائی خطرناک اور تشویشناک ہے۔وہ پہلو ہے خودکشی کے بڑھتے رجحان کا۔اب خودکشی بھی ویب کیم یا انٹرنیٹ کیمرے کے سامنے ہونے لگی ہے۔تاکہ لوگ دیکھیں اور ایسی موتوں سے محظوظ ہوں،سبق حاصل کریں یا پھر انٹرنیٹ یوزرس اگر اس موت میں کوئی نیا پہلو نکال سکیں تو نکالیں۔خودکشی کے رجحان کو روکنے کی کوشش کرنے والے ایک فلاحی ادارے کے مطابق صرف برطانیہ میں 2001ء سے 2008 تک انٹرنیٹ کیمرے کے سامنے خودکشی کے کم از کم بیس واقعات ہو چکے ہیں۔ایسے واقعات امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ممالک ہی میں نہیں ہو رہے ہیں بلکہ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں بھی ہونے لگے ہیں۔

یوں تو انٹرنیٹ کیمرے کے سامنے خودکشی کے واقعات کا آغاز تقریباً 2001ء سے ہی ہو گیا تھا لیکن ایسی اموات کو شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب گذشتہ سال فلوریڈا کے ایک انیس سالہ نوجوان نے کئی روز کی پلاننگ اور انٹرنیٹ یوزرس سے مشورے کے بعد Just In Tv کے سامنے خودکشی کی۔اس نے اپنے پرسنل کمپیوٹر کے کیمرے کو آن کر کے بڑی مقدار میں خواب آور گولیاں کھائیں اور پھر اپنے بستر پر جا کر آرام سے لیٹ گیا۔گھنٹوں تک اس واقعہ کو تماشہ سمجھ کر دیکھنے والے اسے تماشہ اور مذاق ہی سمجھتے رہے اور جب کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تب لوگ چونکے اور

انھوں نے پولیس کو فون کیا۔تقریباً پندرہ سو افراد نے اپنے انٹرنیٹ پر اس موت کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ پولیس کیسے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئی اور پھر اس نے اس نوجوان کو جس کا نام ابراہم بگس تھا، مردہ پایا۔اس نے سوسائڈ نوٹ بھی لکھا جس میں اس نے کہا کہ اس کی زندگی کسی کے کام کی نہیں ہے اور وہ اپنی جان دے کر لوگوں کو اذیت سے بچانا چاہتا ہے۔ابراہم بگس باڈی بلڈنگ ڈاٹ کوم کا ممبر تھا اور اسے اس سائٹ والے کینڈی جنگی کے نام سے جانتے تھے۔

امریکہ کی ایک تیرہ سالہ طالبہ نے محض اس بنا پر خودکشی کر لی کہ اس کے ایک دوست لڑکے نے انٹرنیٹ کے ذریعے اس پر طنز کیا تھا۔ وہ اس سے اس قدر بد دل ہوئی کہ بیلٹ گلے میں باندھ کر لٹک گئی۔اسی طرح برطانیہ کی ایک سائبر خودکشی نے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ خودکشی کرنے والا ناپختہ ذہن نوجوان نہیں بلکہ ایک 42 سالہ شادی شدہ شخص اور دو بچوں کا باپ تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کی بیوی سے اس کی ان بن ہو گئی تھی اور اس نے کیمرے کے سامنے پھانسی لگا لی۔اب ایک واقعہ ہندوستان کا بھی ملاحظہ فرمائیں۔یہ کیرالہ کا واقعہ ہے۔اور خودکشی کرنے والا ایک اکیس سالہ ڈینٹل طالب علم ہے۔رپورٹ کے مطابق مارچ 2007 میں تیسرے سال کے اس اسٹوڈنٹ نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا۔انٹرنیٹ کیمرہ آن کیا۔اپنی گرل فرینڈ سے بات چیت شروع کی اور چیٹنگ کے دوران اٹھ کر چھت کے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی۔جس وقت لوگوں کو پتہ چلا اور اس کی لاش اتاری گئی اس وقت بھی کیمرہ آن تھا اور اس کا رخ پنکھے اور پھندے کی طرف تھا۔کیرالہ کے پریارم ڈینٹل کالج کے اسٹوڈنٹ کارتک کی گرل فرینڈ نے بعد میں بتایا کہ اس نے اس کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔اس کو اندیشہ تھا کہ اس کی محبت کے بارے میں دونوں کے والدین کو علم ہو گیا ہے اور اب کچھ نہیں ہوسکتا۔لہٰذا اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنی جان دے دے۔فلوریڈا میں تو ایک شخص نے آن لائن ناظرین کے سامنے یعنی اپنا ویب کیمرہ آن کر کے اپنے سر میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔یہ واقعہ انتہائی

بھیانک تھا اور دیکھنے والوں کو بہت دنوں تک اپنی خوفناک یادوں سے بے چین کرتا رہا۔

خودکشی کے مشورے کی ویب سائٹس

ایسے بہت سے واقعات ہو رہے ہیں لیکن ان پر قدغن لگانے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ایسی کئی سائٹیں بن گئی ہیں جہاں خودکشی کے طریقہ کار پر مشورہ دیا جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ خودکشی کریں یا نہ کریں اور اگر کرنا ہی چاہتے ہیں تو کیسے کریں کیسے نہ کریں۔ کون سا طریقہ زیادہ بہتر ہے کون سا نہیں۔ ایسی سائٹیں یہ بھی بتانے لگی ہیں کہ کس طریقہ کار کو اپنانے سے فائدہ ہے اور کس کو اپنانے سے نقصان۔ صرف ناپختہ اذہان والے ہی ان طریقوں سے متاثر نہیں ہیں بلکہ بعض پختہ کار لوگ بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ فلوریڈا کے ابراہم بگس کی خودکشی پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے Bowling Green State یونیورسٹی اوہیو میں شعبہ پاپولر کلچر میں اسسٹنٹ پروفیسر مونٹانا ملر کا کہنا ہے کہ بگس کی خودکشی سے اسے کوئی دھچکہ نہیں لگا۔ کیونکہ Face Book اور My Space جیسی سائٹوں کے ممبران زندگی کے اچھے اور برے، ہر پہلو کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسے واقعات کی ریکارڈنگ نہ ہو یا ان کی کوئی ڈاکیومنٹری نہ بنے تو ان کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ محترمہ مزید کہتی ہیں کہ آج کی نئی نسل کوئی چیز پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتی بلکہ وہ موت و زیست کے ہر پہلو کا نظارہ کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں خودکشی کے دیگر طریقوں کے مقابلے بگس کا طریقہ زیادہ اچھا لگا۔ کم از کم اس نے پنکھے سے لٹک کر یا چھت سے یا کسی پل سے کود کر تو خودکشی نہیں کی۔ گویا ان کے نزدیک خودکشی کے طریقے بھی اچھے اور برے ہوتے ہیں۔

چیٹنگ نے بھی اس رجحان کو بڑھایا ہے اور ویب کیم نے بھی۔ لیکن اس سلسلے میں قانون دانوں کا کیا کہنا ہے اور کیا ایسے واقعات کو روکنے کا کوئی قانون ہے یا نہیں، اس پر بھی بحث ہونے لگی ہے۔ میامی کے ایک قانون داں ولیم ہل کہتے ہیں کہ جو لوگ انٹرنیٹ پر

خودکشی ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے، ان کے خلاف شائد کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ ان سائٹوں کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا جن پر ایسے واقعات ہوتے ہوں۔ کیونکہ انہوں نے جو ضابطے بنا رکھے ہیں ان میں خودکشی کے رجحان کی حوصلہ شکنی موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے گھر میں یا کہیں اور ویب کیم کے سامنے خودکشی کرتا ہے تو کوئی اس کو کیسے روک سکتا ہے۔ یا مذکورہ سائٹ اس کی ذمے دار کیسے ہوسکتی ہے؟ ہاں جو لوگ دیکھ رہے ہوں اور وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ روک سکیں اور اس کے باوجود نہیں روکتے تو ان کو کسی حد تک ذمے دار مانا جاسکتا ہے۔ خیال رہے کہ ولیم ہل سائبر جرائم کے معاملات دیکھتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک بھی ایسے واقعات کو روکنے کی کوئی موثر صورت نہیں بن سکتی۔ حالانکہ ایسی بعض اموات میں انٹرنیٹ یوزرس کا ہی ہاتھ ثابت ہوا ہے جنھوں نے خودکشی کا ارادہ ظاہر کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ یا پھر انہوں نے ایسے لوگوں پر طنز و تشنیع کے تیر چلائے اور کہا کہ جاؤ مر جاؤ کم از کم تم سے دنیا کا پیچھا تو چھوٹے گا۔ ابراہم بگس کے کیس میں یہی ہوا۔ اس نے پہلے بھی خودکشی کی باتیں کی تھیں اور واردات کے روز تو انٹرنیٹ یوزرس اس کو للکارتے رہے اور طعنہ دیتے رہے کہ جاؤ خودکشی کرو، بیٹھے کیوں ہو، تمھارے اندر ہمت ہی نہیں ہے اور تم خودکشی کر ہی نہیں سکتے۔ بالآخر اس طعنہ زنی نے اس کی جان لے لی۔

لیکن کیا ان جرائم کے لئے ہم براہ راست انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی کو ذمے دار قرار دے سکتے ہیں؟ شائد نہیں۔ اس انقلاب کے دامن میں انسانیت کے لئے بہت سے فوائد بھی پنہاں ہیں بلکہ فوائد زیادہ ہیں اور نقصانات کم ہیں۔ اگر اس کا ایماندارانہ انداز میں استعمال کیا جائے تو اس سے بہت سے ایسے کام لئے جاسکتے ہیں جو معاشرے کے لئے اور انسانیت کے لئے بہتر نتائج کے حامل ہوں گے۔ اس انقلاب نے زندگی جینے کے لئے جو آسانیاں، سہولتیں اور آسائشیں فراہم کی ہیں ان کو کم کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ لیکن ہمارے سماج میں ایک ایسا طبقہ ہمیشہ سے رہا ہے جو کسی بھی مفید چیز کے غیر مفید بلکہ نقصاندہ پہلو کا

متلاشی رہا ہے اور جس نے ہر اچھی چیز کے منفی پہلو کو ہی پروجکٹ کیا ہے۔ انٹرنیٹ کیمرے کے سامنے خودکشی کا رجحان بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔

ان واقعات سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اطلاعاتی تکنالوجی کا انقلاب ضرر رساں ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تاہم جیڈ گوڈی کا معاملہ ہو یا ابراہم بگس اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے اقدامات ہوں، سوال ضرور کھڑے کرتے ہیں اور ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہمارے اذہان میں ایسی باتوں کا اٹھنا غیر فطری بھی نہیں ہے کہ کیا اب وہ وقت آنے والا ہے جب انٹرنیٹ کی ترقی تمام قدروں اور اصولوں کو پامال کر دے گی اور حیات و ممات کی حقیقتوں کو نئے معنی و مفاہیم پہنائے جائیں گے؟ ایک شاعر نے اپنی آخری خواہش کا اظہار یوں کیا تھا: مرے مرنے سے کچھ پہلے صف ماتم بچھا دینا۔ کہ میں بھی دیکھ لوں کس کس کی چشم نم برستی ہے۔ لیکن انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب نے اس خواہش کو نئے معنی پہنا دئے ہیں اور ذہنوں میں یہ سوال اٹھنے لگا ہے کہ کیا اب آخری خواہش یہ نہیں ہوا کرے گی بلکہ مرنے والا جیڈ گوڈی اور ابراہم بگس کے انداز میں اپنی آخری خواہش کا اظہار کرے گا اور انٹرنیٹ کی مدد سے اسے پورا بھی کرے گا؟

گلی کوچوں میں نیوز چینلوں کا قیام

ٹی وی چینلوں کی کئی اقسام ہیں۔ جن میں نیشنل چینل اور علاقائی زبانوں کے چینل قابل ذکر ہیں۔ لیکن اب اس شعبے میں ایک نئے پہلو نے دستک دی ہے۔ یہ پہلو مقامی چینلوں کے قیام سے وابستہ ہے۔ جس طرح پرنٹ میڈیا میں قومی اخباروں کے علاوہ مقامی سطح پر اخبار یا مقامی اور علاقائی زبانوں کے اخبار نکل رہے ہیں، اسی طرح قومی چینلوں اور علاقائی زبانوں کے چینلوں کے علاوہ مقامی چینل بھی سینکڑوں کی تعداد میں قائم ہو گئے ہیں۔ جن میں سے بیشتر ہندی زبان میں ہیں۔ کچھ مقامی زبانوں میں بھی ہیں۔ اب ان چینلوں کی تعداد اور ان کا دائرہ دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ قومی سطح پر شدت کے ساتھ اپنی موجودگی درج نہیں کرا پا رہے ہیں اور مقامی ہونے کی وجہ سے کروا بھی نہیں سکتے، لیکن اس شعبے میں جو ترقی ہوئی ہے اور جس طرح ان چینلوں کی تعداد بڑھتی جا رہی اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب ان چینلوں کا بھی ایک بازار ہوگا اور ان کے ناظرین کی بھی خاصی تعداد ہوگی اور وہ بھی مقامی سطح پر ہی سہی لوگوں کو متاثر کرنا شروع کر دیں گے۔

ان چینلوں کے قیام کی ایک بڑی وجہ قومی نیوز چینلوں کا رویہ ہے۔ مقامی چینلوں سے وابستہ افراد کا کہنا ہے کہ جب ہم لوگوں نے یہ دیکھا کہ قومی نیوز چینل مقامی ایشوز اور مسائل کو یکسر نظر انداز کرتے ہیں اور ان کی دلچسپی ان مسائل کو اٹھانے میں نہیں ہے تو ہمیں مجبور ہو کر مقامی چینل قائم کرنے پڑے۔ در اصل قومی چینل صرف انہی مقامی ایشوز

کو اٹھاتے اور ان پر توجہ دیتے ہیں جن میں قومی سطح پر اثر انگیزی کی صلاحیت ہو یا جو جذباتی اور سنسنی خیز انداز میں عوام کو متاثر کر سکیں۔ انہیں ان ایشوز سے کوئی دلچسپی نہیں جو عوام کے مسائل سے متعلق ہوں۔ ان میں ان کے نزدیک کوئی کشش نہیں ہوتی۔ نیشنل چینل مقامی ایشوز پر اسٹوری نہ کرتے ہوں ایسا نہیں ہے۔ وہ اسٹوری تو کرتے ہیں لیکن ان کو بہت کم دکھاتے ہیں۔ اگر دکھاتے بھی ہیں تو کبھی کبھار۔

ہندوستان میں میڈیا انقلاب نے دوسرے ملکوں کے لوگوں کی بھی توجہ اپنی جانب مبذول کی ہے۔ یہاں تک کہ غیر ملکی تجزیہ نگار بھی اس کو نظر انداز نہیں کر پا رہے ہیں۔ ہندوستان کا کیبل مارکیٹ ایک بہت بڑا مارکیٹ بنتا جا رہا ہے اور اس میں وسعت کے ابھی بہت امکانات ہیں۔ ہانگ کانگ کے ایک میڈیا ادارے 'میڈیا پارٹنرس ایشیا' کے ایک عہدے دار کے مطابق ہندوستان 2010 تک ایشیا کا سب سے بڑا کیبل مارکیٹ بن جائے گا اور 2015 تک سب سے بڑا منافع بخش پے ٹیلی ویژن مارکیٹ ہو جائے گا۔ 2010 تک کیبل ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے اشتہارات کا ریونیو 1.8 ارب ڈالر تک پہنچنے والا ہے۔ لیکن اس کا بیشتر حصہ اسٹار، زی ٹیلی فلم اور سونی انٹرٹینمنٹ ورک کی جھولی میں جاتا ہے۔ یہ ادارے اشتہارات کے ریونیو کے ساٹھ فیصد پر قابض ہیں۔

ایک میڈیا واچ ڈاگ 'دی ہوٹ' (The Hoot) کے چیئرمین اور نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے سابق ممبر بی جی ورگیز کے خیال میں مقامی کوریج کی اہمیت کو کم کر کے دیکھا جا رہا ہے۔ حالانکہ تمام بڑے علاقے مقامی خطوں سے مل کر ہی بنتے ہیں۔ لیکن نیشنل خبروں کی بھیڑ میں مقامی خبروں اور ان کے ایشوز کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مقامی چینلوں سے وابستہ لوگوں کا کہنا ہے کہ عام آدمی کے مسائل کو عام آدمی کی زبان میں اٹھانا چاہئے۔ وہ اس سلسلے میں بعض چینلوں کے اینکرس کی مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ عوامی زبان میں بات کرتے ہیں اس لئے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔ ورگیز مزید کہتے ہیں کہ مقامی چینل ان مسائل کی بات کرتے ہیں جو لوگوں کے مسائل ہیں اور لوگوں

کے قریب ہیں اس لئے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ مقامی چینل راجدھانی دہلی میں بھی قائم ہیں جو کہ نیشنل چینلوں کا بہت بڑا بازار ہے اور مغربی بنگال کے بول پور، اتر پردیش کے میرٹھ اور جموں کشمیر کے ڈوڈا میں بھی واقع ہیں اور سب کی اپنی اہمیت ہے۔ دہلی میں جمنا پار کے علاقے سیلم پور میں بھی مقامی چینل کام کر رہا ہے۔ یہاں جو چینل چل رہا ہے اس کا نام 'بھارت ٹی وی' ہے اور اس کے ایڈیٹر انچیف انل شرما ہیں۔ پچاس سالہ انل شرما 1990 سے شاہدرہ میل کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار بھی نکالتے ہیں۔ انہوں نے ایک بات چیت میں بتایا کہ ان کے خیال میں ساحل جمنا کے اس علاقے کو نیشنل چینلوں نے نظر انداز کیا ہے۔ بڑے چینل یہاں کی اسٹوری تو کرتے ہیں لیکن وہ ان کو دکھاتے نہیں ہیں۔ انہوں نے مقامی ایشوز کو ہائی لائٹ کرنے کے لئے 2005 کے یوم آزادی پر اس چینل کا قیام کیا تھا اور اس وقت سے یہ مسلسل اپنا کام کر رہا ہے۔

اسی طرح جموں و کشمیر کے پسماندہ اضلاع میں سے ایک ضلع ڈوڈا ہے۔ 10 جنوری 2005 کو یہاں ایک مقامی چینل قائم کیا گیا جس کا نام 'سٹی چینل' ہے۔ اس کا قیام ریاض احمد اندرابی، اشتیاق احمد دیو، جاوید اقبال خان اور محمد الیاس اندرابی نے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس علاقے میں ہونے والے بڑے واقعات کی کوریج کے لئے یہ چینل قائم کیا ہے۔ یہ مقامی چینل جو کہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں، اگر چہ الگ الگ علاقوں میں قائم ہیں لیکن مقصد کے اعتبار سے سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ اور یہ مقصد مقامی مسائل کو اٹھانا، مقامی واقعات کو پیش کرنا، ان کے تئیں حکومت اور عوام کو بیدار کرنا ہے۔ وہ لوکل نیوز اور ویوز پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور ان کے وجود کا مکمل دارومدار مقامی بزنس مینوں پر ہوتا ہے۔ ان کے اشتہارات سے ان کو ریونیو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان چینلوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر لوگ رضا کارانہ طور پر کام کرتے ہیں، وہ اپنے کام کی کوئی اجرت نہیں لیتے۔

ان چینلوں کے اشتہارات کی شرحیں کیا ہیں، اس کا اندازہ بھارت ٹی وی کی شرح

سے لگایا جاسکتا ہے۔ان کے یہاں ایک ڈسپلے اشتہار کی قیمت تین ہزار روپے ماہانہ ہے۔اور ایک اسکرول ایڈ کا معاوضہ ایک ہزار سے پندرہ سو روپے کے درمیان ہے۔اس چینل میں کل بارہ ملازمین ہیں اور اس کا ماہانہ خرچہ 80 ہزار روپے سے اوپر ہے۔یہ صرف لوکل نیوز کور کرتا ہے۔اس نے ریونیو حاصل کرنے کے لئے ایک اسکیم نکالی ہے جس کے مطابق ہفتے کے روز کسی ایک شخص کا انٹرویو دکھاتا ہے۔اور انٹرویو دینے والے سے دو ہزار روپے فیس لیتا ہے۔ڈوڈا میں جو چینل کام کر رہا ہے اس کا ریونیو بہت کم ہے۔ایک رپورٹ کے مطابق اسے صرف پچاس سے ساٹھ ہزار روپے سالانہ ریونیو حاصل ہوتا ہے۔

ان چینلوں کو مالی فائدہ ہوتا ہوا ایسا نہیں ہے۔مثال کے طور پر' مہا کال کیبل' ہے۔ اس کے منیجر ابھے دھرم کا کہنا ہے کہ ہم ایک سے دو لاکھ روپے ماہانہ خسارہ اٹھا رہے ہیں۔اس چینل کے 27 لاکھ روپے ماہانہ آپریشنل اخراجات پر صرف ہوتے ہیں اور ریونیو 19 لاکھ روپے ماہانہ آتا ہے۔مینیجنگ ڈائرکٹر وویک جیسوال کہتے ہیں کہ ہم اس چینل کے مستقبل کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔دراصل ان چینلوں کا قیام پیسہ کمانے کے لئے نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کا مقصد مقامی مسائل کو اٹھانا ہے اور اس کے ساتھ اس سے وابستہ افراد کے صحافتی ذوق کی تکمیل کرنا ہے۔

دہلی کے شاہدرہ علاقے میں ایک چینل ہے جس کا نام اے ٹو زیڈ (A to Z) ہے۔ جسے بہت سے لوگ اے ٹو زی کہتے ہیں۔اسے 28 سالہ چاندنی خان اور پراگ مہیشوری نے قائم کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ مقامی مسائل سے مقامی چینل ہی بحث کر سکتے ہیں وہی انہیں اٹھا سکتے ہیں۔ان دونوں نے پانچ سال تک پرنٹ میڈیا میں کام کیا اس کے بعد الیکٹرانک میڈیا میں منتقل ہو گئے۔ان کہ کہنا ہے کہ ہم جب فیلڈ میں ہوتے تھے تو لوگ ہم سے اپنے مسائل حل کروانے کو کہتے تھے لہذا ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ایک چینل قائم کیا جائے۔پراگ مہیشوری کے مطابق میں جو کچھ کر رہا ہوں اس پر میرے گھر والوں کو فخر ہے۔ لوگ آتے ہیں اور میرے والد سے کہتے ہیں کہ پلیز اپنے بیٹے سے کہئے کہ وہ فلاں معاملے

میں ہماری مدد کرے۔لیکن ریونیو حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا اشتہار پوری دہلی میں دکھایا جائے جبکہ ہمارا چینل ایک خاص علاقے تک محدود ہے۔ایسے لوگوں کو سمجھانا آسان نہیں ہوتا۔چاندنی خان کے مطابق کیبل آپریٹر اس میں ہماری مدد کرتے ہیں ان میں سے کچھ لوگ ہمارے پروگرام فری میں دکھا دیتے ہیں۔

مہیشوری نے ان ایشوز کے بارے میں بتاتے ہوئے ،جن کو وہ لوگ اٹھاتے ہیں، کہا کہ ابھی حال ہی میں انہوں نے علاقے میں ایم بی بی ایس ڈگری والے ڈاکٹروں کا ایک سروے کیا۔جس کے مطابق پانچ فیصد سے بھی کم ایسے ڈاکٹر ملے جوایلو پیتھک دوائیں تجویز کرنے کے مجاز ہیں۔خان اور مہیشوری نے مزید بتایا کہ اسٹوریز کے سلسلے میں ان کو دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔بعض اوقات فرضی ٹیلی فون کال آتے ہیں۔کبھی کبھار ہمارے رپورٹر فرضی اسٹوری کر ڈالتے ہیں۔لہذا اسٹوریز کو چیک کرنا پڑتا ہے۔الیکشن کے زمانوں میں شہری مسائل سیاسی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ہم پر کسی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہوتا بلکہ لوگ مسائل کے لئے درخواست ہی کرتے ہیں۔البتہ ہمیں فون کرنے والوں کے سلسلے میں پتہ لگانا ہوتا ہے کہ کون سچ بول رہا ہے کون نہیں۔

یہ مقامی چینل کس طرح مشن کے طور پر کام کرتے ہیں اس کا اندازہ حاجی پور، بہار کے ایک چینل 'سچ میں' سے لگایا جا سکتا ہے۔اس کے نیوز سربراہ چالیس سالہ چندر بھوشن سنگھ ششی ہیں۔وہ حاجی پور میں 'بیر چند پٹیل اسمارک مہاودیالیہ' میں ہندی کے ٹیچر ہیں۔وہ دن میں ٹیچنگ کرتے ہیں اور شام میں چھ سے آٹھ بجے تک الیکٹرانک جرنلسٹ بن جاتے ہیں۔انہوں نے 2005 میں یہ چینل قائم کیا تھا جس کا مقصد پیسہ کمانا نہیں بلکہ اپنے صحافتی ذوق کی آسودگی ہے۔وہ اس میں کامیاب رہے۔انہوں نے لاتعداد گمشدہ لوگوں کی تلاش کی ہے اور ان کے چینل سے لوگوں کو ڈھونڈنے میں آسانی ہوتی ہے۔وہ گمشدہ شخص کی تصویر اور کنٹیکٹ نمبر خبروں کے درمیان چلاتے ہیں اور اس طرح ایسے لوگوں کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ششی کا خیال ہے کہ کم از کم بیس گمشدہ لوگوں کو ان کے چینل نے تلاش کیا

ہے اور ان کے اہل خانہ سے ملایا ہے۔ انہوں نے سات میڈیا ساتھیوں کی مدد سے یہ کام شروع کیا تھا۔ ان کے پاس دوسرے میڈیا اداروں میں کام کرنے والے آتے ہیں اور مفت میں خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے چونکہ نیشنل چینل مقامی ایشوز کو نہیں چھوتے اس لئے ان کو ہم اٹھاتے ہیں اور لوگ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔

اسی طرح اتر پردیش کے میرٹھ میں گیلکسی نیٹ ورک ایک مقبول نام ہے۔ گیارہ سال قبل قائم کیا گیا یہ ٹی وی اسٹیشن مقامی خبریں پیش کرتا ہے اور چار چینلوں کے ساتھ یہ مکمل آپریٹیو چینل بن گیا ہے۔ اس کے چار چینلوں کے نام ہیں: گیلکسی مووی، گیلکسی فیملی، گیلکسی سانگ آن ڈیمانڈ اور سٹی ہلچل نیوز۔ میڈیا آلات سے لیس یہ چینل اب ماس کمیونی کیشن ٹرینیز کو ملازمت بھی دیتا ہے۔

سہارنپور میں چینل 9 اپنا کام کر رہا ہے۔ اس پر خبروں کے علاوہ صحت، تعلیم اور مذہب پر بھی پروگرام دکھائے جاتے ہیں جس کا لوگوں پر خاصا اثر پڑتا ہے۔ پچیس سالہ صحافتی تجربہ رکھنے والے سبھاش اگروال نے 2008 میں اسے قائم کیا تھا۔ شروع میں اس میں بارہ لاکھ روپے لگائے گئے اس کے بعد یہ چینل اشتہاروں سے ریونیو حاصل کرنے لگا۔ تاہم اتر پردیش میں مقامی چینلوں کا مسئلہ یہ ہے کہ انہیں لائسنس نہیں دئے جا رہے ہیں اور وہ ضلع مجسٹریٹ کے رحم وکرم پر کام کرتے ہیں۔

انہی چینلوں کی مانند مغربی بنگال کے بول پور میں 'جھلک' نامی ایک چینل بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے۔ عام طور پر لوگ اس چینل کے سربراہ کو فون کر کے اپنے مسائل بتاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کہیں آگ لگنے کا واقعہ ہوا ہے تو لوگ فائر بریگیڈ کو فون کرنے کے بجائے اس چینل کو فون کر کے کہتے ہیں کہ وہ فائر بریگیڈ کو واقعے کی اطلاع دے دے۔ یہاں بھی ریونیو اور لائسنس کا مسئلہ ہے اور یہ چینل پھر بھی لوگوں کے مسائل اٹھا رہا ہے اور لوگوں اور حکام کو بیدار کرنے کی مہم میں لگا ہوا ہے۔ اس چینل کو بھی دوسرے میڈیا اداروں میں کام کرنے والے لوگوں کی رضا کارانہ خدمات حاصل ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا اور فحاشی

ایک زمانہ تھا جب ٹی وی سیٹ کو 'ایڈیئیٹ باکس' کہا جاتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ملک میں پرائیویٹ ٹیلی ویژن کی شروعات نہیں ہوئی تھی اور ٹی وی کے نام پر صرف دور درشن موجود تھا۔ اس وقت اس کے پروگرام بہت صاف ستھرے ہوا کرتے تھے اور لوگ فیملی کے ساتھ بیٹھ کر اور گھل مل کر دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت یہ اندیشہ نہیں ہوتا تھا کہ اچانک کوئی فحش منظر اسکرین پر آجائے گا اور بڑوں کو بچوں کے سامنے آنکھیں چرانے کی نوبت آجائے گی۔

آج چار سو سے زائد چینل ہماری تفریح طبع اور معلومات کے لئے موجود ہیں اور پروگراموں کی نوعیت اور کوالٹی میں بھی کافی تبدیلی آگئی ہے۔ پروگراموں کا موڈ بدلا ہے، مواد بدلا ہے، انداز پیشکش بدلا ہے اور کھل کر بات کہنے کا چلن بھی بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اتنا زیادہ کہ یہ کھلا پن فحاشی، عریانیت اور اباحیت کے زمرے میں داخل ہو گیا ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے یہ بحث پھر شروع ہو گئی ہے کہ کیا الیکٹرانک میڈیا، جس میں فلم بھی شامل ہے، ملک میں فحاشی اور بے حیائی و بیہودگی کو پروان چڑھا رہا ہے۔ خاص کر دو نئے ریئلیٹی شوز 'سچ کا سامنا' اور 'مجھے اس جنگل سے بچاؤ' کے تناظر میں یہ بحث خاصی تیز ہو گئی ہے۔ ان شوز کے بارے میں دونوں قسم کی آراء سامنے آرہی ہیں۔ کوئی اس کی مخالفت کر رہا ہے اور کوئی موافقت۔ لیکن تقریباً اسی فیصد لوگوں کا خیال ہے الیکٹرانک میڈیا ملک میں فحاشی کو بڑھاوا دے رہا ہے۔

ملک میں جاری بحث کے نتیجے ہی میں ہندوستان ٹائمز اور سی این این آئی بی این کو پورے ملک کا ایک سروے کرنا پڑا ہے جس کا نتیجہ انتہائی چونکا دینے والا ہے۔اس سروے میں جو کہ میٹرو شہروں کے علاوہ بڑے اور چھوٹے شہروں اور قصبوں پر مشتمل ہے، یہ نتیجہ نکل کر سامنے آیا ہے کہ تقریباً 80 فیصد لوگوں کا خیال ہے کہ فلم، ٹی وی اور انٹرنیٹ نے ملک میں بے حیائی اور فحاشی کو بڑھاوا دیا ہے۔یہ میڈیم ایک ایسے کلچر کو فروغ دے رہا ہے جو نہ تو ہندوستانی ہے اور نہ ہی مہذب سماج میں جس کے لئے کوئی گنجائش ہے۔ساٹھ فیصد سے زائد لوگوں کے مطابق اس نے عریانیت کو ہی فروغ نہیں دیا ہے بلکہ سر عام بوس و کنار کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے۔90 فیصد سے زائد لوگ مانتے ہیں کہ ٹیلی ویژن اور فلموں میں ننگے پن اور فحاشی کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔

اس سروے رپورٹ میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک چار سالہ لڑکے سدھارتھ بھومک نے ایک فلمی گانا سنا جس میں لفظ 'سیکسی' کا بار بار استعمال ہوا ہے۔اس نے اپنی دادی اماں سے اس کا مطلب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ جو دیکھنے میں بہت خوبصورت ہو اسے سیکسی کہتے ہیں۔اس کے بعد اس لڑکے نے اپنے پڑوس کی ایک لڑکی سے دوستی کرنے کے لئے کہا کہ 'تو بہت سیکسی لگ رہی ہے'۔اب سدھارتھ 22 سال کا ہو گیا ہے اور اسے اپنے اس رویے پر بڑی شرمندگی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ ٹیلی ویژن نے لائف اسٹائل ہی تبدیل کر دیا ہے۔اب بچوں کے لئے باہر جا کر کھیلنے کی گنجائش ختم ہوتی جا رہی ہے اور وہ ٹی وی اور انٹرنیٹ پر اپنا زیادہ وقت گزارنے لگے ہیں۔لیکن یہ ذرائع ابلاغ معصوم ذہنوں کو بھی پراگندہ کر رہے ہیں اور وہ بے حیائی اور فحاشی کے دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔

کئی نوجوانوں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ یا والدین ان کے ساتھ ٹی وی کے بہت سے پروگرام نہیں دیکھ سکتے۔ٹی وی پر ایسے موضوعات پر جو بحث ہوتی ہے وہ بھی بدلے ہوئے حالات کا شکار ہو جاتی ہے۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ہم

ٹی وی پر کوئی پروگرام نہیں دیکھنا چاہتے تو ریموٹ ہمارے ہاتھ میں ہے ہم یا تو سوئچ آف کر دیں یا دوسرا چینل لگا لیں۔ لیکن کیا اس بے حیائی اور عریانیت کا یہی جواب ہے۔

آج ٹی وی پر پروگراموں کو تو چھوڑئے جو اشتہارات آتے ہیں ان میں کچھ اتنے فحش ہوتے ہیں کہ وہ دیکھے ہی نہیں جا سکتے۔ سروے کے دوران متعدد لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ان پروگراموں سے شائستگی عنقا ہو گئی ہے اور روز بہ روز خاندانی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ سنسنی خیزی کو بڑھاوا مل رہا ہے۔ توازن کا بالکل فقدان ہے اور ہر چیز کو گلیمر اور سیکس میں لپیٹ کر دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خاص طور پر جو رئیلٹی شوز پیش کئے جاتے ہیں وہ زیادہ بھدے ہوتے ہیں۔ ہاں کچھ شوز ایسے ضرور ہیں جن کے بارے میں اس قسم کی باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔

ٹی وی کے ان پروگراموں کے نتیجے میں سماج میں خطرناک حد تک تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ لوگوں پر ان کے اثرات اس قدر غالب آ رہے ہیں کہ وہ ٹی وی دیکھ کر اپنی پسند اور ناپسند کو طے کرنے لگے ہیں۔ جو پروگرام ٹین ایج کے لئے ہوتے ہیں اور جن میں ٹین ایجرس ہی کام بھی کرتے ہیں ان میں بھی ایسی چیزیں دکھائی جاتی ہیں جو اس طبقے کے مزاج اور اخلاق پر برا اثر ڈالتی ہیں۔ اگر ہم اس عمر کے لوگوں سے پوچھیں تو بیشتر کو ان میں کوئی برائی نظر نہیں آئے گی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے ذوق کو بگاڑ دیا گیا ہے۔ البتہ کچھ نوجوان کہتے ہیں کہ ہم ان کو دیکھنا تو پسند کرتے ہیں لیکن والدین کے آتے ہی چینل بدل دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی اس کو برا سمجھتے ہیں لیکن ان میں جو چٹخارہ پن ہوتا ہے اس سے چپکے چپکے لذت اندوز بھی ہونا چاہتے ہیں۔ یہ لذت اندوزی، ظاہر ہے اس طبقے کے اخلاق پر بھی برا اثر ڈال رہی ہے۔

آج جس بات میں ان کو کچھ برائی نظر آ رہی ہے اور وہ والدین کے سامنے انہیں نہیں دیکھنا چاہتے کل وہی باتیں انہیں ٹھیک لگیں گی اور ان میں اتنی بولڈنیس یا بہ الفاظ دیگر بے حیائی آ جائے گی کہ ان میں انہیں کوئی برائی نظر نہیں آئے گی۔ آج کی بہت سی فلمیں

بھی ایسی بن رہی ہیں جن میں فحش مناظر کو بڑی آسانی سے دکھا دیا جاتا ہے۔ سر عام بوس و کنار میں تو اب کوئی برائی ہی نظر نہیں آتی۔ یہ تمام باتیں سماج میں بہت خطرناک تبدیلی کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ جسے پہلے ایڈیئٹ باکس کہا جاتا تھا وہ آج ایڈیئٹ باکس نہیں رہ گیا ہے بلکہ وہ بہت تیز، شریر اور شاطر ہو گیا ہے۔ اس میں سماج کو توڑنے اور جوڑنے کی زبردست صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر اس کا صحیح استعمال نہیں ہوا اور الیکٹرانک میڈیا نے اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی تو سماجی اور خاندانی قدریں بکھر جائیں گی اور بے حیائی وفحاشی کا راج ہو جائے گا۔

بہر حال ایسے رجحانات پر بند باندھنے کی ضرورت ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ نئے ضوابط تیار کرے اور ٹی وی چینلوں کو پابند کرے کہ وہ دائرے میں رہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی وزیر امبیکا سونی نے کہا ہے کہ حکومت دیکھے گی کہ اسے کیا کرنا چاہئے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر اپنا دامن بھی چھڑانے کی کوشش کی کہ میڈیا کو خود ہی ضابطے بنانے اور ان کی پابندی کرنی چاہئے۔ کیا انہوں نے یہ بیان دے کر یہ اشارہ دیا ہے کہ حکومت کچھ نہیں کرے گی ان کو اپنے حساب سے چلنے کی آزادی حاصل ہے؟

رئیلٹی شوز کا ایک جائزہ

آجکل ایک بار پھر یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ ٹی وی پر کیسے پروگرام دکھائے جانے چاہئیں اور کیا ٹی وی چینلوں کو ٹی آر پی بڑھانے کی ہوس میں ہر اچھی بری چیز دکھانے کی چھوٹ ملنی چاہیئے۔ جب بھی کسی چینل پر کوئی قابل اعتراض پروگرام پیش کیا جاتا ہے، یہ بحث چھڑ جاتی ہے۔ لیکن کسی منطقی انجام تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ حکومت کی جانب سے میڈیا کے لئے رولز اینڈ ریگولیشن وضع کئے جانے کی بات کہی جاتی ہے اور یہ بھی نصیحت کی جاتی ہے کہ میڈیا کو خود اپنے قوانین وضوابط وضع کرنے چاہئیں۔ میڈیا اداروں، میڈیا انجمنوں اور ان کے ذمے داروں کی میٹنگیں ہوتی ہیں اور پھر ایک طویل خاموشی چھا جاتی ہے۔

گذشتہ دنوں پارلیمنٹ میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ ٹی وی چینلوں کو کب نکیل ڈالی جائے گی اور انہیں کب کسی ضابطے کا پابند بنایا جائے گا۔ یہ سوال ایک ٹی وی چینل اسٹار پلس پر دکھائے جانے والے پروگرام 'سچ کا سامنا' کے تناظر میں اٹھایا گیا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے سیریئلوں پر بھی انگشت نمائی کی گئی اور کہا گیا کہ یہ سیریئل ہندوستانی تہذیب و ثقافت پر حملہ ہیں اور ان کے ذریعے قبیح رسوم وروایات کو پروان چڑھایا جا رہا ہے اور یہ کہ بعض پروگراموں اور سیریئلوں کے توسط سے فحاشی اور بے حیائی کی تبلیغ کی جارہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے نجی ٹی وی چینل شتر بے مہار ہیں اور حکومت ان کی ناک میں نکیل ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے یا عمداً نکیل ڈالنے سے گریز کر رہی

ہے۔ سچ کا سامنا واقعی ایک ایسا پروگرام تھا یا رئیلٹی شو تھا جس کی مدد سے اباحیت کو فروغ دیا جا رہا تھا۔ اس میں ہاٹ سیٹ پر بیٹھنے والے سے اس کے اہل خانہ کے سامنے جن میں بھائی، بہن، بیوی، بیٹی اور باپ بھی ہوتے ہیں، ایسے فحش سوال کئے جاتے ہیں جن کے جواب قریبی دوستوں کے سامنے بھی آسانی سے نہیں دئے جا سکتے چہ جائیکہ اہل خانہ کے سامنے دئے جائیں۔ کوئی بھی خوددار اور غیرت مند شخص ان سوالوں کے جواب دینا پسند نہیں کرے گا خواہ ان کے جواب مثبت ہوں یا منفی۔ ذاتی نوعیت کے یہ سوالات اس انداز سے ترتیب دئے گئے ہیں کہ نفی اور اثبات دونوں صورتوں میں کنٹسٹنٹ کو بدنام کر دیتے ہیں۔ وہ ان کے جواب دیتا ہے یا نہیں، ہر حال میں بھرے بازار میں مادرزاد برہنہ ہو جاتا ہے۔ (اس پر سوال سننے کے بعد جواب دینے کی پابندی بھی عائد کر دی گئی ہے۔) طرّہ یہ کہ اسے 'اعتراف حق' قرار دے کر اس کی بھرپور ستائش اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ بیشتر سوالات سامنے بیٹھنے والے کے ان گناہوں کے بارے میں ہوتے ہیں جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ ان گناہوں کے فخریہ اعلان پر انہیں انعام دیا جاتا ہے اور جو شخص کمال بے حیائی کے ساتھ تمام فحش سوالوں کے پولی گرافی مشین کے مطابق صحیح صحیح جواب دے دے اسے ایک کروڑ روپے کے انعام کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ کئی لوگوں کو انتہائی شرمناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دو لوگ تو اس خوف سے کہ کہیں ان کا ازدواجی رشتہ ہی نہ ٹوٹ جائے، مقابلے سے باہر ہو گئے۔ جبکہ کچھ کنٹسٹنٹ نے جب کسی گناہ کے نہ کرنے کے عزم کا اظہار کیا تو اسے غلط جواب قرار دے کر باہر کر دیا گیا۔ یہ شو فیملی کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہے ہی نہیں۔

اس رئیلٹی شو نے ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔ وہ یہ کہ کیا اس طرح سرعام اپنے گناہوں کا فخریہ اعلان سچ کو اپنانا ہے یا سماج میں ایک برائی کو عام کرنا ہے۔ اس سلسلے میں لوگ الگ الگ رائے رکھتے ہیں لیکن بعض ماڈرن لوگ بھی اس طرز تخاطب اور انداز سوال کو غلط مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایسے پروگرام دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔ مختلف مذاہب

کے نمائندوں نے بھی اس کی مخالفت کی ہے۔ دراصل یہ صرف ایک شو ہی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی معاشرے پر اباحیت اور فحاشی کی یلغار کرنا ہے۔ البتہ اسے سچ کا سامنا قرار دے کر اس کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ کسی بھی مذہب میں ایسے سوالات کے جواب کو عام کرنے یا بہ الفاظ دیگر فحاشی کو عام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسلام کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کے مطابق اگر کسی شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ اس پر نادم و شرمندہ ہو، اللہ سے معافی مانگے اور دوبارہ اس گناہ کے عدم ارتکاب کا عہد محکم اور عزم مصمم کرے۔ اگر وہ فخر کے ساتھ اس کو بیان کرتا ہے تو اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن یہاں بالکل اس کا الٹا معاملہ ہے۔ دراصل یہ سچ کا سامنا نہیں بلکہ اس کی آڑ میں معاشرے کو برائی کی طرف ہانکے لئے جانا ہے اور وہ بھی فخر کے ساتھ۔

اس شو کی حمایت کرنے والے یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس طرح وہ سچ سامنے آ رہے ہیں جو ابھی تک پردہ راز میں رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے اور ننگا ہوتا ہے اس لئے اس شو کے نتیجے میں جو جوابات سامنے آ رہے ہیں ان کی مخالفت نہیں کی جانی چاہئے۔ ایسے لوگوں سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ انسان تو ماں کے شکم سے برہنہ پیدا ہوتا ہے اور اس سے بڑی سچائی کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ تو کیا اس سچائی کی آڑ میں لوگوں کو یہ اجازت دے دی جانی چاہئے کہ وہ مادرزاد برہنہ ہو کر سڑکوں پر پھریں اور گلیوں میں گھومیں اور لوگوں کے گھروں میں آمد و رفت رکھیں۔ دراصل یہ ایک ایسی سچائی ہے جو پردے ہی میں اچھی لگتی ہے۔ اسی طرح بہت سی سچائیاں اسی وقت اچھی اور خوبصورت لگتی ہیں جب وہ بے پردہ نہ ہوں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس شو کے ذریعے حقائق کو منظر عام پر لایا جا رہا ہے اور لوگوں کو سچ بولنے کا حوصلہ مل رہا ہے۔ لیکن ایسا سچ اور ایسا حوصلہ کس کام کا جو سماج میں بے حیائی اور بے غیرتی کو پروان چڑھائے۔ جو سماج کو کوئی فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچائے۔ ہاں اگر اس شو کے ذریعے اور سچ کو سامنے لا کر سماج کی کوئی خدمت کی جا سکتی ہے تو ہاٹ سیٹ پر بلایئے نریندر مودی کو اور ان کے سامنے پولی گرافک مشین رکھ کر ان سے سوال کیجئے

کہ انہوں نے گجرات میں کتنے بے گناہ مسلمانوں کا قتل کروایا ہے۔ پوچھئے ان سے کہ انہوں نے کس طرح منظّم سازش کر کے گجرات کے مسلمانوں پر قیامت توڑی ہے۔ بلایئے گجرات کے پولیس افسران کو اور ان سے پوچھئے کہ انہوں نے مودی کے اشارے پر کہاں کہاں اور کس کس طرح مسلمانوں پر گولیاں چلائی ہیں اور انہیں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ کہاں کہاں دنگائیوں کو کھل کھیلنے کی اجازت دی ہے اور مظلوم مسلمانوں کی فریادوں کو سنا ان سنا کر دیا ہے۔ بلایئے گجرات اور دوسری ریاستوں کے پولیس افسران کو اور ان سے پوچھئے کہ انہوں نے کہاں کہاں فرضی انکاونٹر کر کے بے قصوروں کو مارا ہے۔ انہوں نے دہشت گردی کی آڑ میں کتنے مسلمانوں کو فرضی طریقے سے پھنسا کر ان کی زندگی جہنم بنائی ہے۔ ان سے پوچھئے کہ انہوں نے کن سیاستدانوں کے اشارے پر بے قصور مسلمانوں کو نشانہ بنایا ہے۔ بلایئے سیاستدانوں کو اور ان سے معلوم کیجئے کہ انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران فسادیوں کے ساتھ مل کر کہاں کہاں خون کی ہولی کھیلی ہے۔ انہوں نے کہاں کہاں بدعنوانیاں کی ہیں اور ملک کے ساتھ غداری کی ہے۔ کن کن لوگوں کے ہاتھوں ملک کو اور اس کے مفادات کو فروخت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا یہ سوالات نہیں پوچھے جانے چاہئیں اور کیا ان سچائیوں کو جاننے کا حق عوام کو نہیں ہے۔ کیا یہ سچائیاں ملک وقوم کے حق میں مفید نہیں ہوں گی۔ لیکن ان تلخ سچائیوں کو جاننے کے بجائے لوگوں کے گھروں میں جھانکنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ان کے بیڈ روم میں جھانک کر یہ دیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ کوئی گناہ تو نہیں کر رہا ہے۔ اس سے قبل یہ شو امریکہ میں کیا گیا اور اطلاعات کے مطابق اس کی وجہ سے کئی لوگوں کی ازدواجی زندگیاں تباہ ہو گئیں۔

اسی دوران ایک اور ریئلٹی شو موضوع گفتگو بنا۔ اس کا نام تھا 'مجھے اس جنگل سے بچاؤ'۔ یہ ملیشیا کے گھنے جنگلوں میں شوٹ کیا گیا اور اس میں ٹی وی سلیبریٹیز کو، جن میں مرد و خواتین دونوں ہیں، رکھا گیا تھا۔ اس کی تشہیر اس انداز سے کی جاتی کہ جیسے اس شو میں انتہائی خطرناک قسم کے حالات ہوں گے اور ہر کنٹسٹنٹ کسی بھی طرح اس جنگل سے رہائی چاہتا

ہے۔ اس میں کچھ خطرناک سین نظر تو آئے لیکن باقی جو کچھ دکھایا جاتا اسے بے حیائی اور فحاشی کی تبلیغ کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مبصرین کے مطابق اس شو میں خوبصورت اور سیکسی خواتین کو اسی لئے رکھا گیا تھا تا کہ ایک تو کنٹسٹنٹ کا دل لگا رہے اور دوسرے شرمناک مناظر دکھا کر شائقین کو بھی باندھے رکھا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شو میں خوفناک مناظر کم اور فحش اور جنسی مناظر زیادہ نظر آتے تھے۔ یہ تو ابھی موجودہ رئیلٹی شوز ہیں، جبکہ اس سے قبل بھی جانے کتنے ایسے شوز دکھائے جا چکے ہیں۔ ان رئیلٹی شوز میں رئیلٹی کے نام پر وہ رئیلٹیز دکھائی جاتی ہیں جن کو دکھانے کی اجازت کوئی بھی مہذب سماج اور کوئی بھی مذہب نہیں دیتا۔

ان رئیلٹی شوز کا آغاز تقریباً 2003 میں ہوا تھا جب سونی پر 'انڈین آئیڈل' اور اسٹار ون پر 'نچ بلئے' اور 'لافٹر چیلنج' کی شروعات ہوئی تھی۔ ان شوز کی کامیابی کے بعد ٹی وی عملہ پورے ملک میں پھیل گیا اور جگہ جگہ صلاحیتوں کی تلاش ہونے لگی اور ان کی بدولت بہت سی صلاحیتیں سامنے بھی آئیں اور نئے نئے فنکاروں سے لوگ واقف ہوئے۔ لیکن اس کے بعد 2009 میں پیش کئے جانے والے رئیلٹی شوز ان سے بالکل الگ نظر آئے۔ ان میں سیکس پر زیادہ زور دیا گیا اور خوبصورت خواتین کے جسموں کی نمائش سے شوز میں جان ڈالنے کی کوشش کی جانے لگی۔ ان میں بگ بوس، خطروں کے کھلاڑی، سچ کا سامنا، راکھی کا سوئمبر، اس جنگل سے مجھے بچاؤ، روڈیز اور دادا گیری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تمام شوز غیر ملکوں میں کئے جانے والے شوز کی نقل ہیں۔ کوئی فنیر فیکٹر کا چربہ ہے تو کوئی بگ بردر کا، کوئی مومنٹ آف ٹروتھ کی نقل ہے تو کوئی آئی ایم سلیبریٹی گیٹ می آوٹ آف ہئیر کی نقل ہے۔ ان رئیلٹی شوز میں زیادہ تر خوبصورت عورتوں کو شامل کیا جاتا ہے بلکہ اکشے کمار کے شو خطروں کے کھلاڑی میں تمام کے تمام کنٹسٹنٹ خوبصورت خواتین تھیں اور ان کی تعداد تیرہ تھی۔ ان شوز میں حصہ لے کر باہر آنے والے بتاتے ہیں کہ کس طرح ان سے بے حیائیاں کروائی جاتی ہیں اور عورتوں کے جسموں کی نمائش کی جاتی ہے۔ بعض شوز جیسے کہ دادا گیری میں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے بھی ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ کبھی وہ

گالیاں سنسر کر دی جاتی ہیں اور کبھی بے دھڑک دکھا دی جاتی ہیں۔ان شوز کو بنانے والے شرکاء پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ فحش حرکتوں سے ایک دوسرے کو اپنی جانب راغب کریں۔

ان شوز میں شامل ہونے والوں پر پیسے اور گلیمر کا بھوت سوار رہتا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ وہ اگر چہ بے حیائیاں کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن ان کو اس کی اچھی قیمت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ پورا ملک یا بہت زیادہ لوگ ان کو ٹی وی پر دیکھتے ہیں اور اس طرح وہ راتوں رات اسٹار یا سلیبریٹی بن جاتے ہیں۔ یہ رجحان کتنا خطرناک ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محض اسٹار بننے اور پیسہ اور دولت کی خواہش میں نوجوان نسل کس طرح غیر اخلاقی حرکتوں کی مرتکب ہو رہی ہے۔

ادھر ابھی حالیہ دنوں میں میڈیا نے ہم جنس پرستی کے حق میں دہلی ہائی کورٹ کے فیصلے کی حمایت سے بھی ایک بار پھر یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اسے ٹی آر پی بڑھانے کے لئے جو کچھ بھی کرنا پڑے وہ کرے گا۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں کیسے کیسے ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں، یہ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو ٹی وی دیکھتا ہو اور اس پر باریکی سے نظر رکھتا ہو۔ ہم جنس پرستی کے موضوع پر میڈیا نے جو رویہ اختیار کیا اس سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ جیسے پورا سماج اس کی حمایت کر رہا ہے۔ میڈیا نے اس کی مخالفت کرنے والوں کو اس انداز میں پیش کیا جیسے وہ گزرے ہوئے زمانے کے باشندے ہیں اور ان کی سوچ انتہائی دقیانوسی اور فرسودہ ہے۔ وہ آزادی کے مخالف ہیں اور دوسروں کو اپنی پسند کی زندگی جینے کا حق دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ٹی وی چینلوں پر اس خاص طبقے کے حق میں ایسی نادیدہ مہم چلائی گئی کہ الامان والحفیظ۔ دہلی ہائی کورٹ کے فیصلے کو ہندوستانی سماج کے لئے ایک تاریخی فیصلہ قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ اس سے سماج میں ایک تبدیلی پیدا ہوگی۔ جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی ان کو اس انداز سے گھیرنے کی کوشش کی گئی جیسے اگر انہوں نے لوگوں کو ان کی پسند کے مطابق بے حیائی کے ساتھ جینے کا حق نہیں دیا تو قیامت برپا ہو جائے گی اور اس کے ذمے دار یہی لوگ ہوں گے۔

میڈیا گائڈ لائن
کتنی پابندی کتنی خلاف ورزی

انفارمیشن ٹکنالوجی کے انتہائی ترقی یافتہ عہد میں آج الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی کی ساتھ اس کے شانوں پر ذمہ داری کا ایک عظیم بوجھ بھی آ پڑا ہے۔ چونکہ آج لوگ ٹی وی چینل زیادہ دیکھتے ہیں بمقابلہ اخبار بینی کے' لہذا میڈیا کی ذمہ داری میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ آج کا میڈیا نہ صرف ہمارے انداز بود و باش اور پسند و ناپسند کو متاثر کر رہا ہے بلکہ وہ ہماری سوچ پر بھی حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ ہماری ذہنیت کو بھی بدل سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج میڈیا کا سہارا لے کر نہ صرف پورے ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں ایک خاص سوچ تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسی کے ساتھ نیوز چینلوں کے مابین مقابلہ آرائی میں جنون کی حد تک اضافہ ہو گیا ہے۔ آج اپنا ٹی آر پی (ٹیلی ویزن ریٹنگ پوائنٹ) بڑھانے کے لئے ان کے ذمہ داران تمام حدود و قیود سے بھی گزر جانے کو تیار ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ اس کے لئے سنسنی خیز رپورٹنگ ہو یا پھر بے بنیاد رپورٹنگ' ہر وہ حربہ روا ہو گیا ہے جو دوسرے مواقع پر یا دوسروں کے لئے نا روا سمجھا جاتا ہے۔

ایسی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا ان ضابطوں کی کھلی خلاف ورزی کرتا ہے جو پریس کونسل نے بنائے

ہیں اور جن کی پابندی ہر حال میں لازم ہے۔ الیکٹرانک میڈیا پر بار بار اور بجا طور پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ ان معاملات کی رپورٹنگ میں بھی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کرتا جو عدالت میں زیر سماعت ہوں، یا جو فرقہ وارانہ نوعت کے ہوں۔ میڈیا بعض اہم معاملات کی رپورٹنگ میں جانبداری سے کام لیتا ہے اور وہ کسی متنازعہ معاملے میں دوسرے فریق کی رائے اور نقطہ نظر کو جاننے کی کوشش نہیں کرتا یا جان بوجھ کر اس کو نظر انداز کرتا ہے۔ وہ اپنے طور پر ہی ملزموں کو مجرم قرار دے دیتا ہے اور جب معاملہ دہشت گردی کا ہو اور اس میں کوئی مسلمان ملوث ہو تو پھر اس کے جوش خروش کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی۔ ان معاملات کی رپورٹنگ میں وہ از خود فیصلے سنا دیتا ہے اور نام نہاد پولیس ذرائع اور معتبر ذرائع کے حوالے سے ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے کہ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔

میڈیا کو پا بہ زنجیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ کیونکہ وہ جمہوریت کا چوتھا ستون ہے۔ لیکن اس کے لئے ایسے ضابطے وضع کئے جا سکتے ہیں جو اس کو بعض حدود و قیود میں باندھ سکیں۔ ایسے بہت سے ضابطے وضع بھی کئے گئے ہیں جن کی پابندی سے بے راہ روی کا خطرہ کم ہو سکتا ہے۔ لیکن عملاً یہی دیکھا گیا ہے کہ ان کی پابندی نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی طرف سے بھی میڈیا واچ ڈاگ قائم کرنے کی باتیں کی جاتی ہیں اور بعض اوقات عدالتیں بھی میڈیا کی گوشمالی کرتی نظر آتی ہیں۔ سپریم کورٹ نے آروشی قتل کیس کی سماعت کے دوران میڈیا کی غیر ذمہ داری پر شدید تنقید کی تھی۔ جسٹس التمش کبیر اور جسٹس مارکنڈے کاٹجو پر مشتمل بنچ نے مرکزی حکومت' یو پی حکومت' پریس کونسل آف انڈیا' سرکردہ انگریزی روزنامہ اخبارات اور نیوز چینلوں کو ایک نوٹس ارسال کیا تھا اور ان سے زیر سماعت معاملات کی رپورٹنگ کے سلسلے میں ضابطے وضع کرنے پر ان کا نقطہ نظر جاننا چاہا تھا۔ عدالت نے کہا تھا کہ ہم کسی کو نشانہ نہیں بنا رہے ہیں بلکہ ہم ایک جنرل گائڈ لائن چاہتے ہیں۔ عدالت نے میڈیا سے یہ بھی کہا تھا کہ اسے اپنی رپورٹنگ کے دوران ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہئے۔

اسی درمیان نیوز براڈ کاسٹرس ایسوسی ایشن نے اپنے طور پر ایک گائڈ لائن مرتب کی ہے اور نیوز چینلوں سے کہا ہے کہ وہ اس کی پابندی کریں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ پیشہ ور صحافیوں کو اپنے اقدامات کے تئیں پوری طرح جوابدہ ہونا چاہئے۔ لیکن اگر ہم جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ بیشتر نیوز چینل اپنی رپورٹنگ کے تئیں جوابدہ نہیں ہوتے۔ اکثر فرضی اور بے بنیاد رپورٹنگ بھی کی جاتی ہے اور دوسروں کی کردار کشی کی رپورٹنگ سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ طرفہ تماشہ یہ کہ اگر ایسی رپورٹنگ کی قلعی کھل جائے تو اس پر معذرت بھی طلب نہیں کی جاتی۔

مذکورہ گائڈ لائن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ براڈ کاسٹرس اس بات کو یقینی بنائیں کہ وہ کسی متنازعہ عوامی ایشو کی رپورٹنگ کے وقت ایسی خبروں کا انتخاب نہیں کریں گے جن سے کسی کی حوصلہ افزائی یا کسی کی حوصلہ شکنی ہوتی ہو۔ وہ عوام کو اطلاع فراہم کریں ان کو مس گائڈ نہ کریں۔ وہ صاف ستھری رپورٹنگ کریں۔ ایکوریسی کو یقینی بنائیں اور نادرست رپورٹنگ سے گریز کریں۔ کوئی ایسی چیز نہ پیش کریں جس سے کسی کی ہتک ہوتی ہو۔ نیوز چینل اس بات کو یقینی بنائیں کہ وہ فحاشی کو فروغ نہیں دیں گے۔ عریانیت کا پرچار نہیں کریں گے اور جنسی سرگرمیوں کی تصویر دکھانے سے بچیں گے۔ کسی کی ذاتی زندگی میں تاک جھانک نہیں کریں گے اور اسٹنگ آپریشن کے دوران سیکس کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس کے لئے کسی کو دھمکی نہیں دیں گے اور اس سیلف ریگولیشن کی پابندی کریں گے۔ اس کے علاوہ بھی اس میں بہت سی شقیں ہیں جن کی اگر پابندی کی جائے تو میڈیا رپورٹنگ انتہائی صاف ستھری اور بے داغ ہو سکے گی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان گائڈ لائنس کی پابندی کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ضابطوں کی کھلم کھلا پامالی کی جاتی ہے اور میڈیا کے بعض اداروں کو اس کی کوئی پروا بھی نہیں ہوتی کہ ان کی رپورٹنگ سے کیا کیا قیامتیں برپا ہو سکتی ہیں۔ ضابطوں کے مطابق نادرست رپورٹنگ نہیں ہونی چاہئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض معاملات میں درست رپورٹنگ ہوتی

ہی نہیں۔ خاص طور پر جب معاملہ مسلمانوں کا ہو اور دہشت گردی کی رپورٹنگ کا ہو تو میڈیا غیر جانبدار رہ ہی نہیں پاتا۔ بعض چینلوں کو چھوڑ کر بیشتر چینل فرقہ وارنہ اشتعال انگیزی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ گائڈ لائنس کے مطابق جنسی سرگرمیوں کی تصویریں نہیں دکھائی جا سکتیں لیکن اس کی بھی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی جنسی جرم کی کوئی تصویر نہیں ہے تو اس واقعہ کو RE-ENACT کرایا جاتا ہے۔ اور فرضی کرداروں سے اس عمل کی ایکٹنگ کرائی جاتی ہے۔ چند سال قبل گجرات کے ایک مندر میں انڈیا ٹی وی نے ایک اسٹنگ آپریشن کیا تھا جس میں ایک سادھو کو آشیرواد لینے کے لئے آئی ایک خاتون کے ساتھ مباشرت کرتے دکھایا گیا تھا اور یہ منظر گھنٹوں ٹی وی پر چلتا رہا۔ نہ تو اس چینل نے ضابطوں کی کوئی پروا کی اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی۔ بلکہ اس کے برعکس اس چینل کے ٹی آر پی میں اضافہ ہو گیا۔ اسی طرح اس نے دوسرے اسٹنگ آپریشن کر کے بھی فحش تصویریں گھنٹوں ٹی وی پر دکھائیں لیکن کسی نے بھی اس چینل سے نہیں پوچھا کہ اس کے منھ میں کتنے دانت ہیں۔ دراصل نیوز چینل اپنی مقبولیت بڑھانے کی خاطر ایسی اوچھی حرکتیں کرتے رہتے ہیں اور پریس کونسل آف انڈیا اور نیوز براڈ کاسٹرس کی گائڈ لائنس کی بری طرح پامالی کرتے ہیں لیکن ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔

باب دوم

میڈیا اور اُردو

میڈیا کے جدید رجحانات

اردو زبان کے حوالے سے

یہ ٹوئنٹی فور آور نیوز چینلوں کا زمانہ ہے۔ آپ شب و روز کے کسی بھی لمحے میں ٹی وی آن کریں، تازہ ترین خبریں آپ کے استقبال کو موجود ملیں گی۔ خبروں کی کئی اقسام ہوتی ہیں اور عام خبریں کسی خاص طبقے یا مذہب کے لئے نہیں ہوتیں، بلکہ بلاتفریق مذہب وملت سب کے لئے ہوتی ہیں۔ گویا آپ کہہ سکتے ہیں کہ خبریں اپنی فطرت کے اعتبار سے سیکولر ہوتی ہیں۔ جب یہ خبریں عام طبقات کے لئے ہوتی ہیں تو ضروری ہے کہ وہ سب کی سمجھ میں بھی آئیں۔ اگر وہ سب کی سمجھ میں نہیں آتیں یا ان کو کچھ خاص لوگ ہی سمجھ پاتے ہیں تو وہ اپنے مقصد کی تکمیل کی منزل تک پہنچنے سے قاصر ہوتی ہیں اور اگر ایسا ہے تو ان خبروں کا یا خبر دینے والے کا سب سے بڑا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

جب ہم الیکٹرانک میڈیا میں اردو زبان کے استعمال پر غور کرتے ہیں تو اس کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ اول: اردو الیکٹرانک میڈیا میں اردو کی صورت حال اور دوم: غیر اردو الیکٹرانک میڈیا میں اردو کی صورت حال۔ اردو الیکٹرانک میڈیا میں ہم موٹے طور پر ٹی وی اور ریڈیو کو رکھ سکتے ہیں۔ اس وقت اردو ٹی وی کے دو ٹوئنٹی فور آور چینل ہمارے سامنے ہیں۔ ایک ای ٹی وی اردو اور دوسرا ڈی ڈی اردو۔ ہندوستان میں سب سے پہلے اردو ٹی وی شروع کرنے کا سہرا حیدرآباد کے اناڈو ٹی وی کے مالک راموجی راؤ کے سر جاتا ہے جو اردو کے ساتھ ساتھ متعدد دیگر زبانوں میں بھی چینل چلا رہے ہیں۔ ای ٹی وی اردو کا

آغاز اگست ۲۰۰۱ میں ہوا تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک کی اس قلیل مدت میں اس نے مقبولیت کے معیار پر خود کو کھرا ثابت کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجموعی طور پر ای ٹی وی اردو اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ اردو داں طبقے کو بہتر انداز میں ٹارگٹ کرنا ہے۔ اس کے بعض پروگرام کافی مقبول ہیں۔ جن میں خاص بات، عالمی منظر، آپ کے مسائل، ای ٹی وی کشمیر، مشاعرہ اور کسی حد تک گفتگو کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ یہ ٹوئنٹی فور آور چینل تو ہے لیکن مکمل طور پر ٹوئنٹی فور آور نیوز چینل نہیں ہے۔ اس پر دوسرے پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں۔ تاہم خبروں کا حصہ خاصا ہے۔ ہر گھنٹے پر نیوز پیش کی جاتی ہے۔ البتہ کوئی بلیٹن نصف گھنٹے کا ہے تو کوئی دس منٹ کا۔ لیکن نصف گھنٹے کے بلیٹن زیادہ ہیں۔ اس کی خبریں اردو زبان ہی میں ہوتی ہیں۔ نیوز ریڈرس کا تلفظ بھی ٹھیک ٹھاک ہے اور خبروں کا معیار بھی پست نہیں ہے۔ عالمی منظر اور خاص بات کا معیار اونچا ہے۔ اگر ہم اس کی خبروں کی اسکرپٹ پر غور کریں تو پائیں گے کہ وہ قطعی غیر معیاری نہیں ہوتیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ عام فہم اردو کے ساتھ ساتھ معیاری اردو بھی استعمال کی جائے۔ مذکورہ پروگراموں کے علاوہ دوسرے پروگرام بھی آتے ہیں اور ان میں مختلف طبقات کے ناظرین کے ذوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اب چونکہ اردو زبان تقریباً اور عملاً مسلمانوں تک ہی سمٹ کر رہ گئی ہے لہٰذا مسلمانوں کی دلچسپی کی دوسری چیزیں بھی وقتاً ورموسم کے اعتبار سے پیش کی جاتی ہیں اور یہ سارے پروگرام عام فہم اردو میں ہوتے ہیں۔

ای ٹی وی اردو کے مقابلے میں ڈی ڈی اردو کم مقبول ہے۔ چونکہ یہ سرکاری چینل ہے اس لئے اس کا انداز ذرا مختلف ہے اور اس پر جو چیزیں آتی ہیں وہ اردو داں طبقے کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو سامنے رکھ کر پیش کی جاتی ہیں۔ ڈی ڈی اردو سے پہلے دوردرشن پر اور اس سے پہلے ڈی ڈی نیوز پر اردو میں خبریں آتی تھیں۔ ۲۹ نومبر ۲۰۰۲ کو شائع ایک انٹرویو میں دوردرشن سے وابستہ ایک سینئر صحافی چھایہ انی کرشنن نے بتایا تھا کہ انھوں نے بعض دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر دوردرشن اردو کے قیام کی کوشش کی تھی جسے حکومت

نے نامنظور کر دیا تھا۔ بقول ان کے انھوں نے اس سلسلے میں اس وقت کی وزارت اطلاعات و نشریات سے رابطہ قائم کیا تو چند دنوں کے بعد وہاں سے جواب آیا کہ دوردرشن پر اردو پروگرام آتا ہے اور یومیہ پانچ منٹ کی اردو خبریں بھی دی جاتی ہیں جو ان کے مطابق کافی سے زیادہ ہیں۔ لیکن یو پی اے حکومت میں یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا اور ۱۵ اگست ۲۰۰۶ کو دوردرشن کا اردو چینل قائم ہوا جو پہلے سات گھنٹے کا تھا پھر اسے ۱۴ نومبر ۲۰۰۷ کو چوبیس گھنٹے کا کر دیا گیا۔ اس پر خبروں کے دو بلیٹن آتے ہیں۔ ایک صبح ساڑھے نو بجے اور دوسرا رات نو بجے جو امروز کے نام سے آتا ہے۔ جبکہ صبح والا بلیٹن ڈی ڈی نیوز پر بھی آتا ہے۔ خبروں میں زبان کسی حد تک ٹھیک ہوتی ہے لیکن اسے معیاری نہیں کہا جا سکتا۔ اس پر زیادہ تر سیریئل یا کبھی کبھار ادبی پروگرام بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے اردو حلقے کی وابستگی زیادہ نہیں ہے۔ اس کے انٹرٹینمنٹ کے پروگراموں میں عام بول چال کی زبان استعمال ہوتی ہے۔

بہر حال ہمارے سامنے ہندی کے ٹوئنٹی فور آور نیوز چینلوں کا جائزہ مقصود ہے۔ لیکن اردو کا بھی کچھ جائزہ ضروری تھا اس لئے کچھ باتیں اردو چینلوں کے بارے میں گوش گزار کر دی گئیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہندی کے نیوز چینلوں میں کیسی زبان استعمال ہوتی ہے اور اس میں اردو کا حصہ کتنا ہے۔ جہاں تک ان چینلوں کی زبان کی بات ہے تو اسے ہم نہ ہندی کہہ سکتے ہیں، نہ اردو اور نہ ہی انگریزی۔ ان میں جو زبان استعمال ہو رہی ہے وہ ہندی، اردو اور انگریزی کا آمیزہ ہے۔ تاہم ایسی زبان زیادہ استعمال ہوتی ہے جس میں اردو کے الفاظ کی کثرت ہو۔ گویا اردو آمیز ہندی ان چینلوں کی مقبول زبان ہے۔

کچھ دنوں قبل ایک پروگرام میں اردو اور ہندی کے مستقبل پر ہو رہی بحث کے دوران ہندی کے سرکردہ ادیب و دانشور اشوک واجپئی نے اردو والوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندی کی حالت بہت اچھی ہے تو آپ غلط فہمی کے شکار ہیں۔ ہندی کی حالت بھی اردو سے بہتر نہیں ہے۔ ان کا یہ تجزیہ کم از کم نیوز چینلوں پر تو کسی نہ کسی حد تک ضرور صادق آتا ہے۔ کہنے کو تو وہ ہندی نیوز چینل ہیں لیکن ان پر ہندی کے کتنے

الفاظ استعمال ہوتے ہیں اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ہم اردو والوں کا یہ شکوہ ہے کہ ہندی چینل اردو کے الفاظ تو استعمال کرتے ہیں لیکن ان کو بگاڑ دیتے ہیں۔جبکہ ہندی والے بھی ان چینلوں کی زبان سے خوش نہیں ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ہندی نیوز چینلوں سے شدّ ہ ہندی غائب ہو گئی ہے۔ان کی اس شکایت کو اگر مان لیا جائے اور نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے،تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہاں جو ہندی استعمال ہوتی ہے وہ اشدہ ہندی بھی نہیں ہے اور وِشدہ ہندی کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔اردو والوں کا ایک شکوہ یہ بھی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں اردو کے الفاظ خوب استعمال ہوتے ہیں لیکن جب الیکٹرانک میڈیا کی زبان پر بحث ہوتی ہے تو اسے ہندی ہی کہا جاتا ہے۔یا کم از کم ان چینلوں کو اردو ہندی چینل یا بائی لنگوَل چینل نہیں کہا جاتا۔یہ لوگ پوری فیاضی کے ساتھ اردو کے الفاظ پر ہاتھ صاف کرتے ہیں اور موقع ملتے ہی اشعار بھی جڑ دیتے ہیں۔لیکن اگر ان سے گفتگو کیجئے تو ان کا اصرار ہوگا کہ ہم تو وہ زبان استعمال کرتے ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔وہ یہ نہیں کہیں گے کہ چونکہ اردو زبان عام لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے اس لئے ہم اس کا استعمال کرتے ہیں۔وہ اسے اردو کے بجائے ہندوستانی کہیں گے جو کسی حد تک درست بھی ہے۔اسے ہندی والوں کی وسیع القلبی بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کی خود غرضی بھی۔وہ اس لئے کہ دھڑلے سے اردو الفاظ کے استعمال کا مقصد آسان زبان میں عوام تک اپنی بات پہنچانا ہے۔ہندی کے ایک سینئر صحافی کے خیال میں اردو اور ہندی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔بس درمیان میں ایک باریک سی چلمن پڑی ہوئی ہے۔اختلافات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب مسلمان کہتے ہیں کہ اردو کے ساٹھ فیصد الفاظ فارسی کے اور باقی ہندی کے ہیں۔اور ہندی لابی کہتی ہے کہ ہندی کے ساٹھ فیصد الفاظ سنسکرت کے ہیں اور چالیس فیصد ہندی کے۔بقول ان کے ہندی اور اردو کا جھگڑا فطری نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ہندی اور اردو دراصل جڑواں بہنیں ہیں۔

اہل اردو کا شکوہ

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہندی چینلوں نے اردو زبان کی طرف بس ایک ہی کھڑکی کھولی ہے اور وہ کھڑکی اردو الفاظ کے استعمال کے لئے ہے۔ وہ اسے ہندی والوں کی خود غرضی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اردو الفاظ کے استعمال کے باوجود وہ اردو کے لئے مخلص اور سنجیدہ نہیں ہیں۔ اگر اردو کو اس کا حق دینے کی بات آئے گی تو وہ اس کی حمایت نہیں کریں گے۔ ویسے ہندی نیوز چینلوں پر خبریں ہوں یا تجزیے یا مباحثے۔ ان میں اردو الفاظ کا استعمال تو ہوتا ہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ کس طرح استعمال کئے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہندی کے بعض نیوز ریڈر یا رپورٹر کوشش کر کے اردو بولتے ہیں۔ کبھی وہ صحیح اردو ہوتی ہے تو کبھی غلط۔ غلط اردو وہ لوگ بولتے ہیں جو اردو سے واقف نہیں ہیں۔ یعنی وہ لاعلمی کی بنیاد پر غلط اردو بولتے ہیں، جان بوجھ کر نہیں۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ ہندی والے جان بوجھ کر غلط اردو بولتے ہیں تا کہ وہ اردو کے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ خراب کر سکیں۔ یہ بات زیادہ صحیح نہیں ہے۔ کچھ لوگ ممکن ہے کہ ایسا کرتے ہوں لیکن سبھی ایسا نہیں کرتے۔ ہندی والوں کی لاعلمی کی ایک مثال میں اپنے ایک ہندی صحافی دوست کی ایک بات سے دینا چاہوں گا۔ ایک بار وہ کہنے لگے کہ اردو والے ایک لفظ بہت غلط بولتے ہیں۔ میں نے پوچھا کون سا؟ تو انھوں نے کہا کہ حواس فاختہ۔ کہنے لگے کہ فاختہ پرندے کی مانند جب ہوش اڑ جاتے ہیں تو اس کو حواس فاختہ کہتے ہیں۔ لیکن اردو والے حواس باختہ لکھتے ہیں۔ جو کہ سراسر غلط ہے۔ یہاں مزید چند مثالیں دینا بروقت ہوگا۔ ہندی چینلوں میں لفظ مہارت کو 'مہارتھ' بولا جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کو فلاں کام میں بڑی مہارتھ حاصل ہے۔ لفظ قواعد کا بھی تیاّ پانچہ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح خلافت بمعنی مخالفت کا بھی خوب استعمال ہوتا ہے۔ بارش ہونے کو برسات ہونا کہتے ہیں۔ ہندی کے بعض رپورٹر کہتے ہیں کہ دہلی میں خوب برسات ہوئی اور اب

برسات بند ہوگئی ہے۔الفاظ کے جمع الجمع کا تو دھڑلے سے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: جذباتوں،احساساتوں،خیالاتوں،الفاظوں اور علماؤں وغیرہ۔بعض چینلوں کے رپورٹروں اور نیوز ریڈروں کا تلفظ تو انتہائی خراب ہے۔جیسے کہ آج تک اور اسٹار نیوز وغیرہ کا۔لیکن این ڈی ٹی وی کے لوگوں کا تلفظ قدرے بہتر ہے۔اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر اردو زبان سے یا تو واقف ہیں یا اردو والوں سے ان کا زیادہ ربط ضبط ہے۔اسی طرح انڈیا ٹی وی پر بہت ہی سنسنی خیز انداز میں اردو کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کچھ ایسے پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں جن کے نام خالص اردو میں ہوتے ہیں۔جیسے:احساس،واردات،سنسنی،سلام زندگی،گستاخی معاف وغیرہ وغیرہ۔

خبروں کی زبان کیسی ہوگی،الفاظ کیسے ہوں گے،کس زبان کے زیادہ اور کس زبان کے کم ہوں گے؟ اس کا بہت کچھ انحصار اس پر بھی ہوتا ہے کہ خبر ساز کا ذوق کیسا ہے۔وہ خالص ہندی والا ہے یا اردو سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔اس کا تلفظ ٹھیک ہے یا زہر کو جہر،ذلیل کو جلیل اور شانتی کو سانتی بولنے والا ہے۔عوام تک پہنچنے کے تعلق سے اس کا نظریہ کیا ہے۔وہ خبروں کے معیار پر توجہ دیتا ہے یا صرف عوام تک پہنچنے کو۔مثال کو طور پر اگر این ڈی ٹی وی کے رویش کمار کوئی پروگرام لے کر آئیں گے تو اس میں کوئی نہ کوئی نظریہ،کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہوگا اور اسی کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب کیا جائے گا۔وہ عام فہم زبان کا استعمال تو کریں گے لیکن اس میں ہندی کے الفاظ زیادہ ہوں گے۔لیکن ونود دوا،عارفہ اور نغمہ کا پروگرام ہوگا تو اس میں عام فہم اردو الفاظ کا استعمال قدرے زیادہ ہوگا۔اسی طرح اس کے رپورٹر کمال خان اشعار کے ذریعے اپنی بات پہنچانے کی کوشش کریں گے۔اسی طرح اسٹار نیوز کے دیپک چورسیا‘ جو کہ پہلے آج تک میں تھے اور منورنجن بھارتی کے یہاں اردو کے الفاظ تو کم ہوں گے ہی اور جو ہوں گے بھی وہ ان کو غلط تلفظ کے ساتھ ادا کریں گے۔دراصل یہ ان کی مجبوری ہے۔ چاہتے تو وہ بھی ہیں کہ اردو بولیں اور صحیح تلفظ کے ساتھ بولیں لیکن اردو سے مکمل ناواقفیت کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔لیکن آج تک کے شمس طاہر خان کا پروگرام ہوگا تو

اس کا نام بھی اردو میں ہوگا اور رپورٹوں میں اردو کے الفاظ کی کثرت بھی ہوگی۔ اسی کے ساتھ ان کا تلفظ بھی بہتر ہوگا۔ ان کا خاندانی بیک گراؤنڈ اس میں کام آتا ہے۔ اسی نہج پر دور درشن اور آل انڈیا ریڈیو کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

اردو الفاظ کے استعمال کا نمائندہ سروے

راقم الحروف نے نیوز چینلوں میں اردو الفاظ کے استعمال پر ایک چھوٹا سا نمائندہ سروے کیا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ہندی چینلوں پر اردو کے بے شمار الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان کی تعداد پندرہ بیس اور پچیس فیصد تک ہوتی ہے۔ لیکن ٹی وی دیکھنے والے کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ الفاظ روزمرہ استعمال کے الفاظ بن گئے ہیں اور ہماری یومیہ بول چال کی زبان میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ہم چاہیں بھی تو ان کو الگ نہیں کر سکتے۔ یا پھر ہم نیوز چینلوں کی اس زبان کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ہم یہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ وہ اردو کے الفاظ ہیں یا ہندی کے۔ اس نمائندہ سروے کی روشنی میں ایک اور بات کھل کر سامنے آئی کہ سرکاری چینل دور درشن اور آل انڈیا ریڈیو کی ہندی خبروں میں عام فہم اردو الفاظ پر عام فہم ہندی الفاظ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جبکہ پرائیوٹ چینلوں پر اسی زبان کا استعمال ہوتا ہے جو آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ وہ ہندی کے الفاظ ہوں یا اردو کے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

میں یہاں کچھ مثالیں دینا چاہوں گا۔ این ڈی ٹی کے ایک دس منٹ کے نیوز بلیٹن میں جسے رویش کمار نے پیش کیا، پچاس مرتبہ اردو کے الفاظ کا استعمال ہوا۔ جبکہ آج تک کے دس منٹ کے پروگرام میں جسے شمس طاہر خان نے پیش کیا، ۷۵ مرتبہ اردو کے الفاظ استعمال ہوئے۔ لیکن دور درشن کی پندرہ منٹ کی ہندی خبروں میں اردو الفاظ پچاس بار آئے اور آل انڈیا ریڈیو کی پندرہ منٹ کی ہندی خبروں میں اردو کے الفاظ تیس مرتبہ آئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سرکاری میڈیا میں اردو کے الفاظ کا استعمال بمقابلہ پرائیویٹ، کم ہے۔

اردو الفاظ کا استعمال صرف نیوز چینلوں پر ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ خبروں کی ویب سائٹ پر بھی یہی صورت حال ہے۔ ہندی روز نامہ دینک جاگرن کی ویب سائٹ جاگرن ڈاٹ کوم پر تقریباً دوسو الفاظ کی ایک خبر میں کم از کم بیس مرتبہ اردو کے الفاظ آتے ہیں۔ این ڈی ٹی وی کی ہندی ویب سائٹ این ڈی ٹی وی خبر ڈاٹ کوم پر یہ شرح کچھ زیادہ ہے۔ یعنی دو سو الفاظ کی خبر میں کم از کم ۳۰ مرتبہ اردو کے الفاظ آتے ہیں۔ جبکہ خبر رساں ایجنسی پی ٹی آئی کی ہندی ویب سائٹ پی ٹی آئی بھاشا میں ہمیں ۱۵۰ الفاظ کی خبر میں ۲۰ مرتبہ اردو کے الفاظ نظر آئے۔ عام طور پر جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ یہ ہیں: فرمان، گرفتار، خلاف، سازش، منصوبہ، ظاہر، ثابت، تباہی، نیست و نابو، انجام، قائم، مقصد، مسئلہ، قبضہ، موجودگی، دہشت، دہشت گرد، خطرہ، ذریعے، مطابق، خفیہ، تعداد، طاقتور، ماحول، منظوری، فیصلہ، امید، قریب، ذمے داری، قیمت، تحت، طرز، ضروری، سلسلہ، شروعات، ملکیت، شاندار، فتوی، بحث، زندگی، صدیاں، نیت، اعتراض، زمانہ، غصہ، ہاضمہ، معلومات، ملاقات، مضبوط، تازہ ترین، مسودہ، خبریں، سرخیاں، راحت، صفائی، باقاعدہ، شرط، پسند ناپسند، دستاویز، نتیجہ، سوال، جواب، تاریخ، ناراضگی، بیان، صورت حال، عملی جامہ، منشا، بے نقاب وغیرہ وغیرہ۔

یہ جائزہ صرف نیوز چینلوں کا ہے۔ یہی صورت حال انٹرٹینمنٹ چینلوں کی بھی ہے۔ ان پر جو سیریئل آتے ہیں ان میں اردو نام والے بھی مل جائیں گے اور اردو کے الفاظ تو ہوتے ہی ہوتے ہیں۔ ایک ہندی فلم ساز کا کہنا ہے کہ جب ہندی سیریئلوں میں اردو کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو وہ سونے پر سہاگہ کا کام دیتے ہیں۔ وہ اس بات کی وکالت کرتے ہیں کہ سیریئلوں میں اور دوسرے پروگراموں میں بھی اردو کے الفاظ استعمال کئے جانے چاہئیں۔ اس سے اسکرپٹ کی زبان کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ ایسے کئی سیاستداں بھی ہیں جو اپنی باتوں میں وزن اور خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے اشعار کا استعمال تو کرتے ہی ہیں، شتروگھن سنہا جیسے لوگ جو کہ بی جے پی میں ہیں، انشاء اللہ اور ماشاء اللہ کے بغیر جملہ مکمل نہیں کرتے۔ ٹی وی اور ریڈیو کی مانند ایف ایم ریڈیو پر بھی جہاں ذرا زیادہ آزادی

ہے اردو کے الفاظ بہ کثرت استعمال ہوتے ہیں۔

فلمیں بھی الیکٹرانک میڈیا کا حصہ ہیں اور وہاں تو اردو کا زبردست چلن ہے۔ اسکرپٹ ہو یا نغمے یا مکالمے اردو کے بغیر کوئی چیز مکمل نہیں ہوتی۔ لیکن ان فلموں کو سرٹی فکیٹ ہندی کے دئے جاتے ہیں یا لئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں فلم سازوں کا کہنا ہے کہ وہ سرٹی فکیٹ اردو کا لینا چاہتے ہیں لیکن ان کو مجبوراً ہندی کا لینا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ماضی میں فلم فئیر ایوارڈ دینے والوں نے یہ شرط لگا دی تھی کہ صرف انہی فلموں کو ایوارڈ کے لئے نامزد کیا جائے گا جو ہندی سرٹی فکیٹ کی ہوں گی۔ تاہم اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ فلمیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں جن میں ہندی کے بجائے اردو کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ جن مکالموں یا جن نغموں میں اردو الفاظ کی کثرت ہوتی ہے وہ سننے میں اچھے لگتے ہیں۔

بہر حال! اس وقت ہندی چینلوں کے طفیل میں ایک ایسی زبان پیدا ہوگئی ہے یا ہو رہی ہے جس کا ابھی کوئی نام نہیں ہے۔ اسے اگر چہ ہندی کہا جا رہا ہے لیکن وہ خالص ہندی نہیں ہے۔ ایک کھچڑی زبان ہے۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو آمیز ہندی الیکٹرانک میڈیا کی ایک مقبول زبان ہے۔ تاہم جہاں ہم یہ شکوہ کرتے ہیں کہ ہندی چینلوں پر اردو کے الفاظ استعمال تو ہوتے ہیں لیکن ان کو ہندی کہا جاتا ہے، وہیں ہمیں اس لحاظ سے ان چینلوں کی تعریف کرنی ہوگی کہ وہ عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لئے ہر وہ لفظ استعمال کر لیتے ہیں جس سے ترسیل کا مقصد حل ہوتا ہو۔ انہیں اردو کے یا انگریزی کے عام بول چال کے الفاظ کے استعمال میں کوئی عار نہیں اور شائد ان کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

اردو پریس

(کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا)

اردو اخبارات کم از کم شمالی ہند میں مسلمانوں کی لسانی و تہذیبی شناخت کا ایک حصہ رہے ہیں۔ چونکہ اردو نہ صرف سرکاری زبان رہی ہے اور سرکاری دفاتر اور عدالتوں کا کام اسی زبان میں ہوتا رہا ہے، بلکہ مسلم گھروں میں بولی جانے والی اس زبان کی حیثیت رکھتی تھی جس کا رشتہ تہذیب کے ساتھ ساتھ مذہب سے بھی رہا ہے۔ اسی لئے یہ زبان مسلمانوں کے نزدیک بہت عزیز رہی ہے۔ وہ اپنی زبان کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد رفتہ رفتہ اس کا دائرہ اثر سکڑتا جا رہا ہے اور یہ زبان اب بس کچھ مخصوص حلقوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں اردو اخبارات کا حلقہ بھی سکڑتا جا رہا ہے اور اب تو صورت حال یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ جو علاقے اردو کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے وہاں بھی اب نئی نسل ہندی زبان کے قریب ہوتی جا رہی ہے اور ہندی اخبارات کا مطالعہ کرنے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اخبارات کی تعداد اشاعت دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود آج ملک بھر سے ہزاروں اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ جن میں روزنامہ ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہنامہ رسالے بھی شامل ہیں۔

آج اردو کے صحافیوں میں بھی جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کی صلاحیتیں موجود ہیں اور

اردو اخبارات کے دفاتر میں انٹرنیٹ کی سہولیات سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ دہلی میں ایسے کئی اخبارات ہیں جو بیرون ملک کے پریس کی جانب اپنی کھڑکی کھولے ہوئے ہیں اور وہ اس پر نظر رکھتے ہیں کہ ان اخباروں میں کیا کچھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے قارئین کی پسند کا لحاظ کرتے ہوئے ان اخباروں سے بہت سی چیزیں لے کر شائع کر دیتے ہیں۔ اگر چہ اسے Reproduction ہی کہا جائے گا لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ غیر ممالک کے پریس سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں ان سے محدود سطح پر ہی سہی آگاہی ہو جاتی ہے اور بین الاقوامی پریس کے رجحان کا پتا چل جاتا ہے۔ اردو اخبارات میں یہ ایک نیا ٹرینڈ ہے اور اسے غلط نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کی ستائش کی جانی چاہیے۔ عالمی صحافت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور شائع ہونے والے مواد کا علم بھی بہت ضروری ہے۔ کم از کم صحافیوں کو تو عالمی پریس پر نظر رکھنی ہی چاہیے۔ اس کے ساتھ اردو پریس کو دوسرے نئے نئے تجربات کی شاہراہوں کی تلاش اور ان پر گامزن ہونے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ صحافیوں کے علم میں اضافہ ہوگا اور وہ بین الاقوامی صورت حال سے واقف ہوں گے بلکہ وہ اپنے قارئین کو بھی اس سے باخبر رکھ سکیں گے۔

آج اس کے باوجود کہ اردو اخبارات کی سرکولیشن گھٹتی جا رہی ہے اردو کے ایڈیٹروں کو اب ان پریشانیوں سے دوچار نہیں ہونا پڑتا جن سے پہلے کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ ماضی کے اردو مدیر کن سخت حالات میں اخبار یا رسالہ نکالتے تھے اس بارے میں پرانے اور روایتی ایڈیٹروں سے جو کہ اب بہت کم رہ گئے ہیں بات کی جا سکتی ہے اور وہ اس پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ زمانے کی ترقی نے بجا طور پر اردو مدیروں کے حالات میں بھی خوشگوار تبدیلی پیدا کی ہے اور اب ان کے اپنے حالات اس طرح ناگفتہ بہ نہیں ہیں جیسے کہ پہلے ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آج سے تقریباً تیس سال پہلے کے ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ایک ہفت روزہ اخبار کے مدیر نے ایک دوسرے قدرے چھوٹے مدیر کو جب پیدل ہی اسکوٹر لے کر چلتے دیکھا تو انھوں نے اس سے پوچھا کہ کیا

بات ہے اسکوٹر چلا کیوں نہیں رہے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ اسکوٹر ریز رو میں آ گیا ہے۔ اس پر اول الذکر مدیر نے کہا کوئی بات نہیں اردو اخبار والوں کی گاڑی ہمیشہ ریز رو میں ہی رہتی ہے۔ لیکن اب وہ حالات گزر گئے ہیں اور اب کارکنوں کی گاڑی ریز رو میں رہتی ہو تو رہتی ہو ایڈیٹروں کی نہیں رہتی۔ یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے بلکہ خوش آئند پہلو ہے کہ کم از کم اردو کا ایڈیٹر بھی دوسری زبان کے ایڈیٹروں کی مانند فور ویلر سے پریس کانفرنس یا دوسرے پروگرام اٹینڈ کرنے جاتا ہے۔ اب اس زبان کے ایڈیٹر کو دوسروں کے سامنے منھ نہیں چھپانا پڑتا۔ آج اردو اخباروں کو بھی بڑی تعداد میں سرکاری اشتہارات ملتے ہیں، اگر چہ انگریزی وغیرہ کے مقابلے میں ان کا تناسب بہت کم ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اردو اخبارات کا اپنے قارئین پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں لوگوں رائے منفی ہے۔ جو لوگ اردو اخبار پڑھتے ہیں ان کی اکثریت بھی مثبت رائے نہیں رکھتی۔ حالانکہ چھ دسمبر 1992 کے بعد سے ان اخباروں کا لہجہ بدلا ہے اور پہلے جیسی جذباتیت یا حساسیت اب نہیں ہے، اس کے باوجود ان کے بارے میں مثبت رائے رکھنے والوں کی تعداد کم ہی ملے گی۔ بلا شبہ یہ بات خوش آئند نہیں ہے اور ہم صحافیوں اور اخباروں کے مدیروں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ اس پر غور کیا جانا چاہئے کہ آخر ہمارے بارے میں لوگوں کی رائے منفی کیوں ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اردو پریس پر کئے جانے والے اعتراضات پر روایتی ردعمل کا مظاہرہ کریں، ہمیں چاہئے کہ ہم ان پر سنجیدگی سے توجہ دیں اور اگر واقعی ہمیں اپنے لب و لہجے اور انداز میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے تو ہمیں تبدیلی کے عمل سے بھاگنے کے بجائے اس راہ پر چل کر خود کو اس طرح بنانے کی کوشش کرنی چاہئے کہ لوگوں کی زبان بند ہو جائے۔

مسلم پریس کا رویہ منفی

معروف مفکر اور ماہنامہ الرسالہ کے مدیر مولانا وحید الدین خان نے اپنے ایک

انگریزی مضمون میں مسلم پریس کا بھر پور جائزہ لیا ہے۔انھوں نے قرآن کے حوالے سے مسلم پریس کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابتدائے اسلام میں قرآن نے مسلمانوں کو امن کا مشورہ دیا تھا جنگ کا نہیں۔ حالانکہ جو حالات تھے ان میں جنگ کے مشورے کی ہی توقع تھی۔ لیکن قرآن نے مسلمانوں سے کہا کہ امن کی طاقت جنگ کی طاقت سے بڑی ہے۔اس نے ردعمل کا مشورہ بالکل نہیں دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے مثبت خطوط پر بات کی تھی اور آج کا مسلم پریس منفی خطوط پر چل رہا ہے۔ جہاں قرآن نے عمل کی اہمیت اور ردعمل کو نظر انداز کرنے پر زور دیا تھی وہیں موجودہ مسلم پریس مجموعی طور پر ردعمل کی ذہنیت کا شکار ہے۔

مولانا وحیدالدین خان کہتے ہیں موجودہ دور میں مسلمانوں کی جانب سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں اخبارات ورسائل نکل رہے ہیں اوران کے الگ الگ نام ہیں لیکن ان تمام کو ایک ہی ٹائٹل اور ایک ہی نام کے تحت رکھا جا سکتا ہے اور وہ ٹائٹل ہے'احتجاج'۔ان کو احتجاج ڈیلی، احتجاج ویکلی یا احتجاج منتھلی کہا جا سکتا ہے۔ان کے خیال میں ہمارا پریس ایسا طاقتور ہونا چاہئے کہ جو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کر سکے۔آج کا دور مسلمانوں سے صبر وتحمل کا تقاضہ کرتا ہے لیکن مسلمان ہیں کہ احتجاج کے علاوہ کچھ سوچتے ہی نہیں۔مولانا وحیدالدین خان اپنے تجزیے میں صرف اردو اخباروں کی بات نہیں کرتے بلکہ دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے مسلم ملکیت کے اخباروں کی بھی بات کرتے ہیں اور voice of Ummah, Call of the Ummah, Muslim Outlook جیسے ناموں کو فرقہ وارانہ نام قرار دیتے ہیں۔

مسلم یا اردو پریس پر منفی ذہنیت کا الزام دوسرے لوگ بھی لگاتے ہیں۔ وہ بھی جو کہ اردو نہیں جانتے یہی بات کہتے ہیں۔انگریزی روزنامہ پائنیر کے ایڈیٹر چندن مترا اردو اخباروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو اخبار منفی رول ادا کرتے ہیں۔اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ ان کے قارئین بیشتر مدارس کے لوگ ہوتے ہیں

اس لئے وہ وہی کچھ چھاپتے ہیں جو ان کو پسند ہو اور ان کی پسند کیا ہے یہ ہمیں معلوم ہے۔ چندن مترا کے خیال میں اردو اخباروں کی مانند اردو چینل بھی منفی رول ادا کرتے ہیں۔ان کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو وہی مسلمان دیکھتے ہیں جو انگریزی نہیں جانتے۔ان کے مطابق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دہلی سے شائع ہونے والے اردو اخبار مسلمانوں کی نفسیات سمجھتے ہیں لیکن وہ ان کی زندگی میں صرف منفی رول ہی ادا کرتے ہیں۔ جبکہ بعض اردو ٹی وی چینل مسلم متوسط طبقے پر توجہ دیتے ہیں لیکن یہ بھی مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی پھیلاتے ہیں۔ چندن مترا اردو اخباروں کی سرکولیشن کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ زیادہ بڑھا چڑھا کر دکھائے جاتے ہیں اور اس طرح وہ حکومت کا مقصد پورا کرتے ہیں۔حکومت ان اعداد و شمار کے حوالے سے یہ دعوی کرتی ہے کہ ہندوستان میں اردو پھل پھول رہی ہے۔حکومت کی فائلوں میں اردو پریس یقیناً فروغ پا رہا ہے۔مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ وہ اردو کا رشتہ مذہب سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر سیکولر تعلیمی اداروں میں اردو پڑھائی جائے تو مسلم بچے اردو پڑھنے کے لئے دینی مدارس کا رخ نہیں کریں گے۔

اسی طرح اردو صحافت سے انگریزی صحافت میں پہنچے بزرگ صحافی کلدیپ نیر جب ان ایشوز پر بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تقسیم کے بعد انگریزی میڈیا چھا گیا اور اردو صحافت پچھڑ گئی۔اردو اخبارات عالم اسلام یا پاکستان کے بارے میں زیادہ چھاپتے ہیں اور مسلمان اردو اخبار پڑھنے کی وجہ سے مین اسٹریم سے کٹ گئے ہیں۔ وہ خود کو مسلم امہ سے وابستہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ انڈیا میں اکیلے پڑ گئے ہیں۔

مسیحا کی منتظر اردو صحافت

آسٹریلیا کے صحافی روبن جیفرے نے ہندوستان کی مقامی زبانوں کی صحافت پر ایک تحقیقی کام کیا تھا جو کہ ’اکانومک اینڈ پولیٹیکل ریویو‘ میں قسطوار شائع ہوا تھا۔ بعد میں وہ

مضامین 'نیوز پیپر ریوولیوشن ان انڈیا' کے نام سے ایک کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ انھوں نے یہ کام 90 کی دہائی میں کیا تھا اور بہت ہی گہرائی میں جا کر اردو پریس کا جائزہ لیا تھا۔ ''مسیحا کی منتظر اردو صحافت'' کے عنوان سے وہ لکھتے ہیں کہ آر این آئی کے اعداد و شمار میں اردو روزناموں کے تعلق سے مبالغے کی بے پناہ آمیزش ہے۔ اور افسوسناک بات یہ ہے کہ اردو دنیا ان غلط اعداد و شمار کو تسلیم بھی کر لیتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ 1990 تک کی بات کرتے ہیں جب نیوز پرنٹ کوٹے سے ملا کرتا تھا اور کہتے ہیں کہ بیشتر اردو اخباروں کی چند سو کاپیاں ہی شائع ہوتی تھیں لیکن اخبارات اپنی تعداد اشاعت اصل سے کہیں زیادہ دکھا کر لاکھوں کروڑوں میں کھیلتے رہے۔ اسی طرح تسلیم شدہ اخبارات حکومت کے اشتہارات بھی مسلسل حاصل کرتے رہے۔

اردو اخباروں کے سلسلے میں بات کرتے وقت اکثر و بیشتر اردو پریس میں سیاست یا سیاست میں اردو پریس پر بھی گفتگو ہوتی ہے اور یہ بات کہی جاتی ہے کہ سیاسی پارٹیاں اردو اخبارات کے توسط سے مسلم رائے دہندگان کو خوش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ روبن جیفرے بھی اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سرکاری افسران، سیاسی پارٹیوں اور سیاست دانوں کو بلیک میل کرنے کے لئے بھی اردو اخباروں کا استعمال بہ کثرت کیا جاتا ہے۔ تمام سیاسی پارٹیوں سے وابستہ سیاست دانوں کے لئے مسلم فرقے کی مجموعی خوشحالی کے لئے اقدامات کرنے کے بجائے صرف چند صحافیوں کو خوش کرنے کا نسخہ بہت سستا سودا ہے۔

روبن جیفرے تین بڑے اردو روزناموں ہند سماچار جالندھر، سیاست حیدر آباد، سیاست جدید کانپور اور ہفت روزہ نئی دنیا دہلی کی تعداد اشاعت، مواد، معیار اور اشتہارات کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو اخباروں کی سرکولیشن کم ہو رہی ہے۔ تاہم وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب جذباتی ایشوز ہوں جیسے کہ اسرائیل فلسطین جنگ، ذولفقار علی بھٹو کی پھانسی وغیرہ کا معاملہ سامنے ہو تو ان کی اشاعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں نئی دنیا کی تعداد اشاعت کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ہندوستان

میں اردو زبان سرکاری سرپرستی سے محروم ہو چکی ہے اور آر این آئی کے ریکارڈ کے مطابق 1994 تک چھوٹے بڑے ڈھائی سو روز نامے اور ہفت روزہ اخبار بند ہو چکے تھے۔ جو اس بات کا ثبوط ہے کہ چھوٹے اردو اخبار معمولی قسم کی رعایتوں یا بعض سیاست دانوں کی سرپرستی کے تحت جاری اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ان سیاست دانوں کی نظر مسلم ووٹ پر رہتی ہے اور ووٹ کا سیزن ختم ہونے کے بعد ان کی سرپرستی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ان حقائق کے باوجود روبن جیفرے کا خیال ہے کہ ہندوستان میں اردو قارئین کی تجدید ہو رہی ہے اور اس قسم کی تجدید اردو زبان اور اس کے رسم خط کے مستقبل کی ضمانت ہے۔وہ اپنی تحقیق میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آج اردو اخبارات اور ان کی اشاعت کا نظام جو کہ ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے اور جو بنیادی طور پر اپنی قیمت فروخت پر ہی منحصر ہے اور جس نے سرمایہ دارانہ نظام کے دائرے سے الگ رہ کر بھی خود کو زندہ رکھا ہے اور ساتھ ہی خود کو مذہبی رجحان سے بھی محفوظ رکھا ہے، اگر سرمایہ داروں کو آج یہ احساس ہو جائے کہ اردو ریڈر شپ کی مسلسل تجدید ہو رہی ہے اور اردو اہل حرفہ کی ترجمانی کر رہی ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں اردو صحافت اپنی بقا کے لئے کسی نارتھ کلف، مرڈوک یا سٹیزن کین کی منتظر ضرور ہے۔

ناانصافی کے خلاف احتجاج اردو صحافت کا طرہ امتیاز

بزرگ اردو صحافی اور کالم نگار رضوان اللہ اپنی بات یوں شروع کرتے ہیں کہ 1947 میں جب ہندوستان آزاد ہوا اور تمام زبانوں کی صحافت کو بولنے کی آزادی مل گئی تو اردو صحافت گونگی ہوگئی۔اس کے پاس بولنے کے لئے کوئی ایشو ہی نہیں بچا۔اردو صحافت کے خارزار میں اپنی زندگی گزار دینے والے رضوان اللہ اسے ایک الزام قرار دیتے ہیں کہ اردو صحافت محض احتجاج کی صحافت ہے۔تاہم ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جس مفہوم کو ذہن میں رکھ کر یہ الزام لگایا جاتا ہے اس کے برعکس اردو صحافت احتجاج کی زبان ضرور رہی ہے۔لیکن یہ احتجاج ہمیشہ مثبت رہا ہے منفی نہیں۔وہ کہتے ہیں کہ سماجی ناانصافیوں اور برائیوں کے

خلاف اردو صحافت ہمیشہ سراپا احتجاج بنی رہی ہے۔ وہ مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ راجہ رام موہن رائے نے مراۃ الاخبار اور جام جہاں نما نکالا تھا وہ بھی ظلم و نا انصافی کے خلاف احتجاج کی آواز تھے۔ وہ تو مسلمان نہیں تھے لیکن وہ بھی احتجاجی صحافت کر رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ دونوں احتجاج میں بہت فرق ہے۔ اور پھر جمہوریت میں احتجاج کی زبان سنی جاتی ہے اور احتجاجی انداز ہی میں اپنی بات حکومت تک پہنچائی جاتی ہے۔

لیکن رضوان اللہ آج کی اردو صحافت سے بہت مطمئن نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے کی صحافت سے آج کی صحافت کو کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ پہلے بہت اچھی زبان لکھی جاتی تھی۔ بعد میں جب ترجمے کا دور آیا تو اس وقت بھی زبان و بیان کا معیار تھا۔ ترجمہ اتنا عمدہ ہوتا تھا کہ اس پر اصل تحریر کا گمان ہوتا تھا۔ لوگ منجھے ہوئے اور تجربہ کار تھے اور بیک وقت دو دو تین تین موضوعات پر مضامین لکھ دیتے تھے۔ وہ مولانا عثمان فارقلیط کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج ان کے جیسی تحریر لکھنے والے موجود ہی نہیں ہیں۔ زبان و بیان کے معیار میں گراوٹ کا سبب بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ آج کے اردو صحافیوں میں سہل انگاری آ گئی ہے۔ وہ محنت کرنا نہیں جانتے اور زبان کے سلسلے میں مشقت سے گریز کرتے ہیں۔ اردو اخباروں میں ہندی الفاظ کے بے تحاشہ استعمال اور وہ بھی غلط استعمال پر وہ اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے اخباروں میں ہندی چینلوں کی زبان در آئی ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اردو زبان کو بہت نقصان پہنچے گا۔ تاہم وہ اردو زبان اور اردو صحافت کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ اردو صحافت میں سیاست ہوتی ہے یا سیاست داں اردو اخباروں کا استحصال کرتے ہیں، تو رضوان اللہ کہتے ہیں کہ صحافت اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور یہ ہر زبان میں ہو رہا ہے کہ سیاستدانوں سے مراعات حاصل کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہوتا ہے۔

بس ایک آنچ کی کسر ہے

ان کی اس بات کی تائید ہندی صحافی، تجزیہ نگار اور سیاست داں سنتوش بھارتیہ بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج تو صورت حال یہ ہے کہ صرف اردو میڈیا ہی نہیں پورا کا پورا میڈیا، انگریزی میڈیا، ہندی میڈیا، ریسرچ ایجنسیاں اور سروے ایجنسیاں سب کے سب سیاست دانوں کے ہاتھوں بک چکے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں ان کو پیسے دے کر اپنا الو سیدھا کرتی ہیں اور اپنا مقصد حل کرتی ہیں۔

سنتوش بھارتیہ اس بات سے کلی طور پر اتفاق نہیں کرتے کہ اردو پریس منفی رول ادا کرتا ہے یا منفی صحافت کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکثریت اور اقلیت کی نفسیات الگ الگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میڈیا یا اقلیت کی میڈیا میں بس ایک خامی ہے۔ وہ یہ کہ بنیادی ایشوز کو جتنا ہائی لائٹ کرنا چاہئے اتنا وہ نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس ملک میں اقلیت کے جو مسائل ہیں وہی دیہی علاقوں میں دلتوں اور پسماندہ طبقات کے بھی مسائل ہیں۔ لیکن اردو میڈیا صرف مسلمانوں کے مسائل کی بات کرتا ہے اور ایسا کرتے وقت وہ ستّر اور اسّی فیصد لوگوں کے مسائل کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو بنیادی ایشوز کی جگہ پر جذباتی ایشوز آجاتے ہیں۔ پھر روزی روٹی کے مسائل پس پشت چلے جاتے ہیں اور جذباتی مسائل آگے آجاتے ہیں۔ اگر اردو اخبارات مسلمان اقلیت کے مسائل اٹھانے کے ساتھ ساتھ دیگر اقلیتوں کے مسائل بھی اٹھائیں تو یہ صورت حال پیدا نہیں ہوگی۔ ان کے خیال میں اردو صحافت کو روزگار اور تعلیم پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ترقیاتی علوم جیسے سائنس و تکنالوجی کی تعلیم کی جانب بھی نظر ڈالنی چاہئے اور اپنے قارئین کو ان کی اہمیت بتانی چاہئے۔ لیکن اردو اخبار والے جب زبان کی بات کریں گے تو صرف اردو کی بات کریں گے دوسری زبانوں کی بات نہیں کریں گے۔ مسائل اٹھائیں گے تو صرف مسلم اقلیت کے اٹھائیں گے دوسری اقلیتوں کے نہیں اٹھائیں گے۔ اگر اردو والے اپنی ان

خامیوں پر قابو پالیں تو اردو صحافت پر کسی قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا جا سکے گا۔

اگر آپ اردو اخباروں سے وابستہ صحافیوں سے نجی یا آف دی ریکارڈ گفتگو کریں تو وہ بھی اس کا شکوہ کرتے ہیں کہ اردو صحافیوں کی ایک قلیل تعداد ایسی ضرور ہے جو اثبات کے بجائے نفی کو پسند کرتی ہے۔ کچھ صحافی ایسے ہیں جو جذباتیت کی مارکیٹنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جیسا کہ ہر طبقے میں ہوتا ہے مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو جذباتی چیزیں زیادہ پسند کرتا ہے۔ جب تک تحریر میں چٹخارہ پن نہ ہو اس کو وہ اچھی نہیں لگتی۔ بھڑک دار سرخیاں، ہیجان انگیز زبان اور اشتعال انگیز مواد ان کو زیادہ پسند آتا ہے۔ وہ ایسی تحریروں کو سنجیدہ اور تعمیری تحریروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صحافی نشہ آمیز خوراک اپنے قارئین کے گلے سے اتارتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اکثریت ایسے قارئین کی ہے جو سنجیدگی کی طرفدار ہے اور جو تعمیری انداز میں سوچتی ہے۔

اردو صحافت بھی دوسروں کے دوش بہ دوش

اردو اور انگریزی کے کالم نگار فیروز بخت احمد اردو صحافت پر عائد کئے جانے والے الزامات کو بے بنیاد قرار دیتے ہیں۔ تاہم ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ تمام صحافیوں یا تمام اخباروں کو کلین چٹ نہیں دے سکتے۔ ایسے صحافیوں یا اخباروں کی تعداد بمشکل دس پانچ فیصد ہوگی۔ جبکہ اردو اخباروں کی اکثریت جذباتی سطح سے نہیں زمینی سطح سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کے خیال میں موجودہ اردو صحافت کسی بھی طرح انگریزی اور ہندی اور دوسری زبانوں کی صحافت سے کم نہیں ہے۔ وہ بھی قومی مسائل کو اٹھاتے ہیں اور ان کا گہرائی میں جا کر تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ تاہم فیروز بخت احمد اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ سیاست دانوں کا ایک حلقہ اردو اخباروں کا استحصال کرتا ہے۔ لیکن اس کا قصوروار وہ سیاست دانوں کو نہیں بلکہ اردو والوں کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہم اردو والے ان کے دام فریب

میں نہ پھنسیں تو وہ ہمارا کیا کرلیں گے۔ اردو والے اپنے نظریات پر مضبوطی کے ساتھ ثابت قدم نہیں رہ پاتے جس کی وجہ سے استحصال کرنے والوں کو موقع مل جاتا ہے۔

دراصل یہ مسئلہ صرف اردو صحافت کا نہیں ہے۔ بلکہ ہر زبان کے اخباروں کا استحصال یا استعمال کیا جاتا ہے۔ جس طرح الیکشن کے زمانے میں سیاسی پارٹیوں کی جانب سے اردو کے اخبار نکلوائے جاتے ہیں یا اردو اخباروں کو مختلف قسم کی مراعات اور لالچ سے ہموار کیا جاتا ہے، اسی طرح دوسری زبانوں کے اخباروں کو بھی راہ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صرف اردو ہی نہیں ہندی اور انگریزی زبانوں کے بھی بے شمار چاند الیکشن کے موقع پر نکل آتے ہیں اور الیکشن کے بعد غروب ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سیاست دانوں اور صحافیوں کی وہ وقتی ضرورت ہوتی ہے۔ صحافی کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں اور اس کے سیاسی تعلقات قائم ہوتے ہیں جبکہ سیاست داں ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ اردو میں بھی ایسے بہت سے اخبارات ہیں جو مالی وسائل سے محروم ہیں یا ایسے چھوٹے اردو اخباروں کی کمی نہیں ہے جو مالی وسائل کی خواہش میں سیاست دانوں سے ساز باز کرتے ہیں۔ لہذا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ایک مسلمہ اور قومی صورت حال ہے اور اس سے کسی بھی زبان کے صحافی مبرا نہیں ہیں۔ فیروز بخت بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایڈیٹر کو اخبار تو نکالنا ہی ہوتا ہے اس لئے وہ سیاست دانوں سے عارضی مفاہمت کر لیتا ہے۔

جہاں تک موجودہ اردو صحافت کے معیار کی بات ہے تو فیروز بخت اس سے اتفاق نہیں کرتے کہ آج کے اخباروں کا معیار پہلے کے مقابلے میں پست ہے۔ ان کے خیال میں رنگ روپ، شکل وصورت، گیٹ اپ اور مواد کے اعتبار سے بھی آج کے اخبار پہلے کے مقابلے میں اچھے ہیں اور جدید ترین ٹکنالوجی سے استفادے کی صلاحیت کے سبب یہ معیار مزید بہتر ہی ہوتا جائے گا اور اس میں چار چاند لگتے جائیں گے۔ اسی کے ساتھ وہ اردو صحافت کے مستقبل سے بھی مایوس نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں نہ تو اردو زبان کو دنیا کی کوئی

طاقت ختم کر سکتی ہے اور نہ ہی اردو صحافت کو۔

اردو صحافت کے بارے میں جب ہم نے الگ الگ طبقات کے لوگوں سے بات کی تو یہ اندازہ ہوا کہ جو لوگ اردو صحافت سے وابستہ ہیں یا اس سے کسی قسم کا تعلق رکھتے ہیں وہ صحافت کے بارے میں نہ تو منفی رائے کے قائل ہیں اور نہ ہی اس کے مستقبل سے مایوس ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اردو صحافت پر لگائے جانے والے بیشتر الزامات بے بنیاد اور تعصب پر مبنی ہیں۔ نہ تو اردو صحافیوں میں صلاحیت کی کمی ہے اور نہ ہی وہ دوسری زبانوں کے صحافیوں سے کسی بھی طرح پیچھے ہیں۔ حالات کی نبض پر ان کی بھی انگلی ہے اور وہ بھی عالمی واقعات سے باخبر رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں انقلاب آفریں تبدیلیوں سے وہ بھی واقف ہیں اور ان سے استفادے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن جب غیر اردو داں طبقے سے بات کیجئے یا ایسے لوگوں سے گفتگو کیجئے جو اردو سے اپنا رشتہ جوڑنے میں احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں، تو اردو صحافت میں ہزاروں کیڑے نکل آتے ہیں۔ ان کے نزدیک نہ تو اردو صحافت زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ ہی اردو صحافیوں میں عالمی حالات اور بین الاقوامی سیاست کو سمجھنے کی اہلیت ہے۔ یہ بات تسلیم کہ اردو صحافیوں کو وہ مراعات نہیں مل پاتیں جو دوسرے صحافیوں کو ملتی ہیں اور اردو اخباروں میں مسلمانوں کے مسائل کی بھرمار ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ دوسری زبانوں کے اخباروں میں مسلمانوں کے مسائل نہیں اٹھائے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو والے ان کو اٹھاتے ہیں۔ جب اردو اخباروں کو مسلمان ہی پڑھتے ہیں تو ان کے مسائل یہ اخبار نہیں اٹھائیں گے تو پھر کون اٹھائے گا۔

یہ استحصالی صحافت ہے

اطہر فاروقی اردو صحافت سے ہندی اور پھر انگریزی میں جانے والا ایک اہم نام ہے۔ انہوں نے بھی اردو صحافت پر ایک تحقیقی کام کیا ہے اور گہرائی میں جا کر تمام جزیات

کا جائزہ لیا ہے۔ ’’ہندوستان میں معاصر اردو صحافت‘‘ کے عنوان سے اپنے مقالے میں انہوں نے بالخصوص دہلی سے شائع ہونے والے روزناموں اور ہفت روزہ اخباروں کے معیار، ان کی زبان اور ان کے مزاج سمیت متعدد امور سے بحث کی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ’’میرا ماننا ہے کہ اردو کے ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہانہ اخبارات و رسائل میں پابندی سے شائع ہونے والوں کی اکثریت کو بہ آسانی شمالی ہند کی مسلم ذہنیت کا غماز اور خصوصاً دہلی اور شمالی ہند کی مسلم لیڈر شپ کے زیر تسلط قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں پابندی سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور ان میں بھی اکثر یا تو کسی جماعت یا تنظیم کے کھلے حامی ہیں یا پھر ان کی حیثیت باضابطہ ترجمانوں کی ہے۔ اس لئے ان کا حلقہ قارئین اور دائرہ اثر دونوں محدود ہیں۔ مسلمانوں میں نسبتاً وسیع حلقہ قارئین چونکہ دہلی سے شائع ہونے والے اردو ہفت روزہ اخباروں کا ہے اس لئے اردو صحافت کے تخریب کارانہ مزاج کی تشکیل میں بھی ان کا بہت اہم کردار ہے۔ دہلی کی اردو صحافت بلاشبہ شمالی ہند کے مسلمانوں کے جذبات کا استحصال کرنے والی ہے اور ہر سطح پر ان کے پست معاشرتی حالات کی آئینہ دار ہے۔‘‘

وہ جذباتی ایشوز کے حوالے سے بھی اردو صحافت کا جائزہ لیتے ہیں اور کئی اخباروں کی مثال پیش کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کس طرح جب جذباتی ایشوز سامنے ہوتے ہیں تو ان کی سرکولیشن بڑھ جاتی ہے اور جب وہ ایشوز ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ ان اخباروں کی سرکولیشن گھٹ جاتی ہے بلکہ بہت سے اخباروں کے جینے کے لالے بھی پڑ جاتے ہیں اور بالآخر وہ بند بھی ہو جاتے ہیں۔ اطہر فاروقی اردو صحافت پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ سیاسی حالات میں تبدیلی اور زمانے کے تغیر کا بھی ان اخباروں کی روایتی پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی صورت حال میں تبدیلی سے بھی یہ اخبار بے خبر رہتے ہیں اور ان تبدیلیوں کے تناظر میں اپنے اندر کوئی بدلاؤ لانے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں ’’دہلی سے شائع ہونے والے اردو اخباروں کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ

ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی صورت حال میں تبدیلی کے باوجود اردو اخبارات کے مقاصد اب بھی وہی ہیں جو بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں تھے۔ وہ انجام کی پروا کئے بغیر مسلمانوں کو اشتعال اور ہیجان میں مبتلا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔''

اس وقت اردو صحافت کے مزاج میں کافی تبدیلی آ گئی ہے۔ اخباروں کے صفحات بھی اس جانب اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی اردو صحافیوں میں بھی یہ تبدیلی آئی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر اردو صحافی تبدیلی کے عمل سے متاثر نہیں ہوتا تو صحافت بھی متاثر نہیں ہوتی۔ صحافت کے مزاج میں تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ خود صحافیوں کے مزاج میں تبدیلی آ گئی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا اردو اخباروں کے مالکوں کے مزاج میں بھی جو کہ عموماً ایڈیٹر بھی ہوتے ہیں، یہ تبدیلی آئی ہے۔ اطہر فاروقی اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''1970 کے بعد شمالی ہند میں اردو صحافیوں کی کئی نسلیں تیار ہو گئی ہیں مگر اردو صحافت کا نہ تو مزاج بدلا ہے اور نہ ہی اردو اخباروں کے مالکوں کا وہ رویہ جو آج بھی ان سے 1970 کے سیاسی اور سماجی حالات کے تناظر میں ہی معاصر صورت حال کا تجزیہ کراتا ہے۔'' اطہر فاروقی مزید کہتے ہیں کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے مسائل کے لئے نہ تو دہلی سے شائع ہونے والے اردو اخباروں میں کوئی جگہ ہے اور نہ ہی ان مسلم نوجوانوں کی اکثریت کو اردو زبان آتی ہے جن کی تعلیم اسکول کے نظام میں ہوئی ہے۔ ان کے خیال میں ''اردو اخباروں کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس خطے میں اردو زبان کا مشرف بہ اسلام ہو جانا ہے۔''

اردو سب کی زبان

لیکن ان کی اس دلیل سے بہت کم لوگ متفق ہیں۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کی رائے ہے کہ اردو آج بھی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے اور اس کی بقا کی جدو جہد میں جتنا رول مسلمانوں کا ہے اتنا ہی غیر مسلموں کا بھی ہے۔ ادھر اردو والوں کا ایک بڑا حلقہ اس بات

سے متفق نہیں ہے کہ اردو اخباروں میں نوجوان مسلم نسل کے بارے میں کچھ نہیں چھپتا۔ فیروز بخت احمد کہتے ہیں کہ آج اردو اخباروں میں بھی وہ سب کچھ شائع ہوتا ہے جو انگریزی اور ہندی کے اخباروں میں چھپتا ہے۔ انھوں نے ایک اخبار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس نے ان مسلم نوجوانوں کی آواز پوری شدت سے بلند کی ہے جن کو بے بنیاد الزاموں کے تحت گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ روزگار سے متعلق بھی بہت سی چیزیں اردو اخباروں میں شائع ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مسلم نوجوانوں کے مسائل ان اخباروں میں نہیں اٹھائے جاتے۔

بہر حال اردو صحافت کے بارے میں الگ الگ حلقے کی الگ الگ رائے ہے۔ کچھ لوگ اس پر بے تحاشہ اور بے بنیاد الزام لگاتے ہیں اور کچھ لوگوں کے الزامات کی شدت کم ہوتی ہے۔ لیکن ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جو ان الزامات کو سرے سے مسترد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ تاہم اردو صحافت سے وابستہ افراد اس سے ایک قسم کا جذباتی رشتہ رکھتے ہیں اور ان کو رکھنا بھی چاہئے۔ اردو صحافت ایک مشن کے طور پر شروع ہوئی تھی۔ اگر چہ اب یہ مشن نہیں رہ گئی اور اس میں بھی زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ تبدیلی آئی ہے اور اس کے کردار میں بھی روزگار اور ملازمت کے پہلو جڑے ہیں۔ یہ تبدیلی خوشگوار ہے۔ کیونکہ اب وہ زمانہ نہیں رہ گیا کہ مشن کے طور پر صحافت کر کے روزی روٹی چلائی جا سکے۔ تاہم اردو صحافیوں اور کارکنوں کے مسائل اب بھی دوسری زبانوں کے صحافیوں سے زیادہ ہیں۔ جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کو بھی اقتصادی طور پر زمانے کی رفتار سے ہم آہنگ کیا جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کو بھی ان کے کام کا معقول معاوضہ ملے اور وہ فخر کے ساتھ کہہ سکیں کہ وہ اردو میڈیا سے وابستہ ہیں۔

دینی مدارس کی صحافت

(ایک تحقیقی جائزہ)

ہندوستان میں جب بھی میڈیا کا حوالہ دیا جاتا ہے تو ذہن فوری طور الیکٹرانک میڈیا اور قومی پریس کی طرف جاتا ہے۔ اور جب اردو میڈیا کی بات کی جاتی ہے تو اردو چینلوں کے ساتھ ساتھ اردو کے روزنامہ اخبارات مراد لئے جاتے ہیں۔ لیکن اس ملک میں ایک اور میڈیا ہے، جو بہت بڑا ہے اور جس کا دائرہ کار بھی وسیع ہے۔ اس میڈیا سے بھی بہت سے لوگ وابستہ ہیں اور قومی پیمانے پر نہ سہی، مقامی سطح پر ہی اس کے کچھ اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن اس میڈیا کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی۔ جب بھی میڈیا کی بات ہوتی ہے یا اس پر بحث کی جاتی ہے تو اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سے وابستہ افراد بھی اس کو لائق موضوع بحث نہیں سمجھتے۔ دوسری طرف مسلم میڈیا یا اردو اخبارات کے سلسلے میں قومی صحافیوں میں جب گفتگو ہوتی ہے یا وہ اردو پریس پر اظہار خیال کرتے ہیں تو وہ بھی اسے لائق اعتنا نہیں سمجھتے اور اردو پریس پر نکتہ چینی کرتے وقت بھی وہ اس کی طرف نہیں دیکھتے یا اسے اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ اس پر تنقید ہی کریں۔ اسی طرح جب اردو کا کوئی صحافی یا ریسرچ اسکالر اردو صحافت پر کام کرتا ہے تو اس کے پیش نظر بھی روزنامہ اخبارات ہی ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ وہ اردو کے ہفت روزہ اخبارات پر سرسری نظر ڈال لیتا ہے۔

ہم جس میڈیا کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ دینی مدارس اور مسلم تنظیموں اور ملی

اداروں سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد ہیں۔ یہ ملک کے کونے کونے سے اور بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ان کی سرکولیشن زیادہ نہیں ہوتی تب بھی یہ بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ رسائل و جرائد کے ٹائٹل کی تعداد کم نہیں ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ملک بھر سے شائع ہونے والے ایسے رسائل کی تعداد ڈیڑھ سو کے آس پاس ہوگی۔ جن میں ہفت روزہ اخباروں کے علاوہ پندرہ روزہ اخبارات، ماہانہ رسائل اور دو ماہی اور سہ ماہی جریدے شامل ہیں۔ یہ بھی اردو صحافت کا ایک حصہ ہیں اور ان کی بھی ایک تاریخ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ ایسی صحافت ہے یا ایسا میڈیا ہے جو نظر انداز شدہ ہے، جسے نظر انداز کر دیا گیا ہے یا جو الگ تھلگ پڑا ہوا ہے۔ اسے نظر انداز کرنے کا رویہ صرف غیروں نے نہیں اپنایا ہے بلکہ اپنے بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ان رسائل و جرائد پر نظر ڈالیں یا ان کے معیار اور اسٹینڈرڈ کو بہتر بنانے کی کوشش کریں، ان کی سرکولیشن میں اضافہ کے جتن کریں، ان سے وابستہ صحافیوں اور کارکنوں کے حالات پر غور کریں، اگر انہیں کچھ دشواریاں ہیں، ان کے کچھ مسائل ہیں تو ان کو دور کرنے کے لئے ذمے داروں سے بات کریں یا ان رسائل و جرائد کے معیار میں بہتری کے لئے ٹھوس کوشش کریں۔ تاکہ ان کے قارئین کے اندر ایک مثبت اور تعمیری سوچ پیدا ہو سکے۔ یہ بے توجہی اور بے حسی کیوں ہے؟ اس کے بہت سے اسباب ہیں اور ان کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

تاریخی پس منظر

ایسے جریدے سب سے زیادہ دینی مدارس سے شائع ہوتے ہیں۔ اب کچھ ملی اداروں اور مسلم تنظیموں سے بھی شائع ہونے لگے ہیں۔ تاہم ان کی اکثریت مدارس کے حجروں سے نکلتی ہے اور اپنی بقا کے لئے ذمہ داران مدارس کے رحم و کرم کی محتاج ہوتی ہے۔ ان پرچوں کو کچھ لوگ مسلکی صحافت کے خانے میں رکھتے ہیں اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ

یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ ان میں مسلکی مضامین ضرور شائع ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت دوسرے درجے کی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایسے پرچوں کی اشاعت آزادی کے بہت پہلے سے ہو رہی ہے۔ تاہم پہلے ان کی تعداد کم تھی اور ان کا انداز بھی دوسرا تھا۔ انگریزی دور حکومت میں جو پرچے شائع ہوتے تھے ان کا مقصد وہ نہیں تھا جو آج کے پرچوں کا ہے۔ اس وقت حالات دوسرے تھے۔ بیشتر چیزیں جنگ آزادی کی حوصلہ افزائی، کتاب وسنت کی ترویج واشاعت اور اصلاح معاشرہ کے لئے شائع کی جاتی تھیں۔ لیکن بعض اوقات بعض رسائل میں انگریز افسروں کی شان میں خوشامدانہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے اور ان کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب ان رسالوں کا مزاج مذہبی ہو گیا تھا اور وہ عیسائیوں کی ان سازشوں کا منھ توڑ جواب دینے کے لئے کمر کس کر میدان میں آ گئے تھے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کو تبدیلی مذہب پر اکسا کر انہیں عیسائی بنانے کے لئے کی جا رہی تھیں۔ پاکستان کے مستند مورخ اور صحافی ضیاء اللہ کھوکھر نے ان رسالوں کو مذہبی صحافت لکھا ہے۔

حال ہی میں منظر عام پر آئی کتاب ''ماہانہ رسائل کے خصوصی شمارے'' میں وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت عیسائی رسائل، مسلمان رسائل اور ہندو رسائل شائع ہونے لگے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی بیس سالوں میں ادبی رسائل عوامی مزاج کے لئے کچھ زیادہ باعث کشش نہیں ہو پا رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کی نشو ونما مذہبی مباحث اور مناظرات کے ماحول میں ہوئی۔ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا سیاسی غلبہ اور معاشی تسلط مستحکم ہوتے ہی عیسائی مشنریاں عیسائیت کی تبلیغ اور اشاعت کے لئے سرگرم عمل ہو گئیں۔ انہوں نے کئی اشاعتی مراکز قائم کئے جہاں سے شائع ہونے والی کتابوں کو عوام میں تقسیم کرنے کی کوشش کی جاتی تو عوام ان کو قبول نہ کرتے۔ وہ ان کتابوں کو اپنے مذہب اور تہذیب کے لئے خطرناک اور مضر محسوس کرتے۔ جس کے بعد عیسائی مشنریوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور مختلف مقامات

سے جو رسائل و جرائد جاری کئے ان میں عوامی دلچسپی پر مبنی تاریخی اور معلوماتی مضامین بھی شامل کئے گئے۔ ان کا اولین مقصد عیسائیت کو عوام کے لئے لائق قبول مطالعہ بنانا تھا۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ ہندو اور مسلمان عیسائی تعلیمات سے متاثر ہو کر تبدیلی مذہب پر آمادہ ہونے لگے۔ ان رسائل کے جواب اور اپنے مذہب کے دفاع میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بھی اپنے اپنے رسالے میدان کارزار میں اتارے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو عیسائیوں کا رویہ جارحانہ ہونے لگا اور انہوں نے مخالف مذاہب کو نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ دل آزار اور ناروا حملوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس دور میں جو مذہبی رسالے میدان عمل میں برسر پیکار رہے وہ تعداد میں تو کچھ زیادہ نہیں تھے لیکن اپنے مخصوص حلقوں میں بے حد موثر تھے۔''

مذہبی صحافت کے اسباب و آغاز:

'اردو صحافت انیسویں صدی میں' کے مصنف ڈاکٹر طاہر مسعود لکھتے ہیں ''آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم نے جب سندھ کو تسخیر کیا تو اسلام اس خطے کے قدیم مذاہب کے درمیان ایک جدید اور روشن خیال مذہب کی حیثیت سے پھیلا۔ پندرہویں صدی کی آخری دہائی میں واسکوڈی گاما نے ہندوستان تک پہنچنے کا سمندری راستہ تلاش کر لیا۔ یہ واقعہ اس سرزمین پر عیسائیت کی تبلیغ کا باعث بنا۔ انیسویں صدی میں تینوں مذاہب یعنی ہندومت، اسلام اور عیسائیت ایک دوسرے کے اعلانیہ حریف بن کر سامنے آئے۔ چنانچہ یہ صدی ان مذاہب کی باہمی کشمکش اور تصادم سے عبارت ہے اور اس صدی کی مذہبی صحافت اس مبارزت آرائی کا منطقی نتیجہ ہے۔ اردو صحافت میں مذہبی اخبارات کے اجرا کے رجحان نے عقائد کے ٹکراؤ سے جنم لیا۔''

عقیدے کی جنگ دوسرے مذاب سے بھی ہوتی رہی ہے اور اندرون مذاہب بھی ہوتی رہی ہے۔ جیسے ہندوؤں میں برہمو سماج اور آریہ سماج میں ٹکراؤ اور مسلمانوں میں اہل تشیع اور غیر

اہل تشیع یا مخالفین سرسید کے مابین ٹکراؤ۔ طاہر مسعود کے مطابق ہندوستان میں مذہبی صحافت کی بنیاد عیسائی مشنریوں نے رکھی۔ راجہ رام موہن رائے پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے عیسائی مشنریوں کے پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لئے 1821 میں ایک رسالہ برہمونکل میگزین نکالا تھا۔ لیکن وہ جلد ہی بند ہو گیا تھا۔ ادھر شمالی ہند میں اردو صحافت کا آغاز ہوتے ہی دو پادریوں نے 'خیر خواہ ہند' کے نام سے مرزاپور اور بنارس سے دو ماہنامے جاری کئے۔ ادھر دہلی کے مسلمانوں میں مسلکی اختلافات پیدا ہوئے اور انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف اخبارات کا اجرا کیا۔ شیعہ اور سنی علما اپنے تاریخی اختلافات کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے کو مناظرے اور مباہلے کی دعوتیں دیتے تھے۔ ان کی خبریں ان کے اخباروں میں شائع ہوتیں۔

شمالی ہند میں عیسائی مشنریوں کے ردعمل میں پہلا اخبار 1845 میں بنارس گزٹ کے نام سے نکلا۔ اس کے مالک ایک ہندو گوبند رگھو ناتھ تھے۔ اس میں عیسائیوں کے خلاف اور ہندوؤں کی حمایت میں خوب لکھا جاتا تھا۔ تاہم طاہر مسعود کے مطابق ''جنگ آزادی سے قبل تک اردو صحافت میں مذہبی اخبارات کا کوئی باقاعدہ رجحان نظر نہیں آتا''۔ ایسے اخبارات کے اجرا کا رجحان صحیح معنوں میں 1857 کی جنگ آزادی کے بعد ابھر کر سامنے آیا۔ اس دور میں عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیاں ملک بھر میں پھیل چکی تھیں۔ مذہبی مناظرہ بازی بھی عام ہو گئی تھی۔ جن میں پادریوں کے مقابلے میں مسلم علما اور ہندو مذہبی پیشوا اپنے مذاہب کے دفاع میں مناظرے کرتے۔ جن کی رودادیں اخباروں میں تفصیل سے شائع ہوتی تھیں۔

عقائد کے اس تصادم نے مذہبی اخبارات کے اجرا کی راہ ہموار کی۔ مشنریوں نے مناظرے کئے تو ہندو اور مسلم علما خم ٹھونک کر مناظرے کے لئے میدان میں اتر پڑے۔ عیسائیوں نے کتابیں لکھیں تو انھوں نے بھی جوابی کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے اخبارات نکالے تو ادھر سے بھی اخبارات و رسائل کا اجرا ہوا۔ مسلم علماء نے خاص طور پر اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ تاہم طاہر مسعود کہتے ہیں کہ مذہبی اخبارات کے اجرا کو کلیتاً مشنریوں

کی تبلیغ کا ردعمل سمجھنا پوری طرح درست نہ ہوگا۔اہل اسلام اور ہندو مذہب میں مختلف مسالک کے ماننے والوں نے بھی اپنے مسلک کی حفاظت اور ترویج و اشاعت کے لئے اخبارات نکالے تھے۔مسلمانوں میں 1857 کے بعد بھی شیعہ مسلک کے متعدد اخبارات شائع ہوئے۔ ہندوؤں میں بھی انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔اس اصلاحی تحریک کے بطن سے صدی کے آخر تک اخبارات و رسائل جنم لیتے رہے۔

بہرحال ضیاء اللہ کھوکھر اور ڈاکٹر طاہر مسعود (مصنف: اردو صحافت انیسویں صدی میں) نے اس وقت کے عیسائی، مسلمان اور ہندو رسائل کی جو الگ الگ فہرست شائع کی ہے اس کے مطابق وہ اخبارات اس طرح ہیں:

عیسائی رسائل

ماہنامہ خیر خواہ ہند بنارس، 1837، ایڈیٹر: پادری شرمن۔

ماہنامہ خیر خواہ ہند مرزا پور، اگست 1837، ایڈیٹر پادری ماتھر۔

ہفت روزہ مفید الانام فتح گڑھ، فرخ آباد، 1860، مالک منشی رام سروپ، ایڈیٹر منشی شنکر سروپ

پندرہ روزہ خیر خواہ خلق آگرہ، جنوری 1862، ایڈیٹر فادر سی جے ڈابلی۔

پندرہ روزہ کوکب ہند لکھنؤ، 1869، مالک پادری سمور، مہتمم پادری ارٹی کریول۔

ہفت روزہ نور افشاں لدھیانہ، یکم مارچ 1873، ایڈیٹر بابو بنی۔

ہفت روزہ وکیل ہندوستان امرتسر، یکم جنوری 1874، ایڈیٹر پادری رجب علی۔

ہفت روزہ سفیر ہند امرتسر، مئی 1877، ایڈیٹر پادری رجب علی۔

مسلمان رسائل

ہفت روزہ خیر المواعظ دہلی، 1868، ایڈیٹر مولوی محمد ہاشم۔
دس روزہ منشور محمدی بنگلور، اگست 1872، ایڈیٹر محمد شریف۔
ہفت روزہ مہر درخشاں دہلی، 1874، ایڈیٹر سید ناصر الدین۔
پندرہ روزہ ضیاء الاسلام دہلی، 1875، مالک و مہتمم سید میر حسن رضوی۔
ماہنامہ اشاعت السنہ لاہور، جنوری 1878، ایڈیٹر محمد حسین بٹالوی۔
ہفت روزہ شحنہ ہند میرٹھ، جنوری 1883، ایڈیٹر احمد حسن شوکت میرٹھی۔
دس روزہ حامی اسلام دہلی، جون 1883، ایڈیٹر عبدالوہاب۔
ہفت روزہ اخبار الاخیار دہلی، اپریل 1887، ایڈیٹر منشی حسیب الدین سوزاں۔
ہفت روزہ اخبار اسلام آگرہ، 1892، ایڈیٹر مولوی وگرث علی۔
پندرہ روزہ انوار الاسلام سیالکوٹ، دسمبر 1898، ایڈیٹر منشی کریم بخش۔

ہندو رسائل

اخبار بھارت اکھنڈ امرت آگرہ، 1864۔
پندرہ روزہ کائستھ سماچار لکھنؤ، 1872، ایڈیٹر لالہ گوکل پرشاد۔
پندرہ روزہ ہادی حقیقت لاہور، 1873، ایڈیٹر کشیپ چندر سین، مالک پنڈت مکند رام۔
پندرہ روزہ نسیم آگرہ آگرہ، جنوری 1878، ایڈیٹر منشی سوہن لال بابو جمنا داس۔
پندرہ روزہ دھرم پرچارک فتح گڑھ، اگست 1882، مالک انبا پرشاد۔
ماہنامہ دھرم جیون لاہور، جنوری 1883، ایڈیٹر پنڈت شیو نرائن اگنی ہوتری۔
پندرہ روزہ دیش اپکارک لاہور، 1883، مالک رائے سالک رام۔

ہفت روزہ آریہ متر امرتسر، جنوری 1884، ایڈیٹر باوا نرائن سنگھ۔
ہفت روزہ آریہ گزٹ فیروز پور، جولائی 1885، ایڈیٹر منشی گوبند لال سہارنپوری۔
ہفت روزہ آریہ مسافر آگرہ/جالندھر، ایڈیٹر وزیر چند۔
ڈاکٹر طاہر مسعود اپنی تصنیف 'اردو صحافت انیسویں صدی میں' میں لکھتے ہیں کہ ہندو مذہب میں زیادہ تر اخبار آریہ سماج، برہمو سماج، قومی سنیاس دھرم اور کھتریوں اور کائستھوں نے نکالے۔ ان میں آریہ سماجی اجرائے اخبار میں پیش پیش رہے۔ صرف پنجاب سے ان کے جاری کردہ اخبارات کی تعداد تقریباً ایک درجن ہے۔ اس دور میں سکھوں اور قادیانیوں کے بھی متعدد مذہبی اخبارات نکلتے رہے۔

ہندوستانیوں کے مذہب پر انگریزوں کی یلغار

اردو صحافت کی تاریخ پر اتھارٹی سمجھے جانے والے بزرگ صحافی جی ڈی چندن کہتے ہیں کہ انگریز کھلم کھلا بھی اور در پردہ بھی عیسائیت کی تبلیغ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ پورا ہندوستان عیسائی ہو جائے۔ کیونکہ ان کے خیال میں عیسائیت تمام مسائل کا حل ہے اور جب پورا ملک عیسائی ہو جائے گا تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ راقم الحروف سے بات چیت میں جی ڈی چندن کہتے ہیں کہ دراصل انگریز ہندوستانیوں سے ان کا مذہب چھین لینا چاہتے تھے۔ لیکن یہاں کے لوگ اپنے مذہب پر ڈٹے رہے اور ان کی سازشیں ناکام ہو گئیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ پیش کرنے والے ہنٹنگٹن تو بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ ہندوستان میں کمپنی عہد ہی میں تہذیبوں کا ٹکراؤ شروع ہو گیا تھا۔''

دوسری عالمی جنگ شروع ہونے کے بعد انگریزوں نے ہندوستانی زبانوں کے اخباروں میں مضامین اور خبریں بھیجنا شروع کر دی تھیں۔ جن میں جنگ کے سلسلے میں انگریزوں کی حمایت کی جاتی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے اردو اخباروں اور خاص طور پر مسلم ملکیت والے اخباروں کو اپنا ہدف بنایا۔ لیکن ان خبروں سے ایک اور مقصد پورا

کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ خبریں اور مضامین اس انداز سے تیار کئے جاتے تھے کہ بین السطور میں عیسائیت کی بھی تبلیغ پنہاں ہوتی تھی۔ وہ اس سلسلے میں اسلام سے متعلق بھی بہت سے مضامین بھیجتے تھے۔ در اصل ایسا وہ اسلام کا استحصال کرنے کے لئے کرتے تھے۔ جی ڈی چندن نے اپنی کتاب ''اردو صحافت کا سفر'' میں ایک مضمون میں ایسے حقائق پیش کئے ہیں جن سے انگریزوں کی اس سازش کی قلعی کھل جاتی ہے۔ وہ اپنے مضمون ''اردو صحافت 1940 میں'' میں انگریزی حکومت کی ایک رپورٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں 'اگست 1939 میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی تھی اور برطانیہ نے اپنی من مانی سے ہندوستان کو اس میں جھونکنے کا اعلان کر دیا تھا۔ قومی صحافت نے اس کے خلاف زوردار احتجاج کیا تھا۔ اس سے حکومت کا اطلاعاتی نظام اور جنگی پبلسٹی کا پلان بے کیف ہو گیا۔ یہ نظام 1920 میں اپنے روز قیام سے ہی بے اثر تھا۔ اس کی اصلاح کے لئے 1936 میں ایک اہم کوشش کی گئی جو 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت چلنے والی صوبائی خود مختاری سے ماخوذ تھی۔ اس سال انڈیا آفس لندن کے ڈائرکٹر آف انفارمیشن اے ایچ جائس ہندوستان آئے اور یہاں کے پریس کا جائزہ لیا۔ اس جائزے کی بنیاد پر ان کی سفارشات کے تحت پہلی بار بیورو آف پبلک انفارمیشن ایک صحافی جوسلین ہینسی کے سپرد کیا گیا۔ وہ برطانوی اور یوروپی نیوز ایجنسیوں میں نامہ نگاری کا کام کر چکے تھے۔ انہوں نے ستمبر 1937 میں پرنسپل انفارمیشن کے عہدے کا چارج لیا۔۔۔۔ حکومت نے اردو پریس میں اپنی پبلسٹی کے تجزیے کے لئے پندرہ نمائندہ اخباروں کی ایک فہرست تیار کی تھی۔ ان اخباروں کے انتخاب کے سلسلے میں اس پر بھی نظر رکھی جاتی تھی کہ اخبار کا مالک کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔ اعلیٰ سطح پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلم ملکیت کے اخباروں کو جنگی مضامین کے علاوہ اسلامی دلچسپی کا مواد بھی دیا جائے۔ لہذا بیورو کی جانب سے ترکی، عربی، افغانی، مصری، ایرانی، فلسطینی اور شامی اخباروں سے مضامین کا انتخاب کرکے ان کا اردو ترجمہ اخباروں کو بھیجا جاتا۔۔۔ اردو میں اس قسم کی خبریں زیادہ چھپتی تھیں۔''

جی ڈی چندن کے مطابق بنگالی اخبارات اس قسم کا مواد بہت کم چھاپتے تھے اور ان پر انگریزی حکومت کی بہت زیادہ توجہ بھی نہیں تھی لیکن اردو اخبارات میں خبروں اور مضامین کی اشاعت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اس کے لئے اخبار مالکان کو مختلف قسم کی رعایتیں دی جاتیں اور انہیں لالچ بھی دیا جاتا۔ جس کے سبب بہت سے اخبارات ان کے ارسال کردہ مواد چھاپتے تھے۔ اس طرح انگریزوں نے مختلف قسم کے ہتھکنڈے اختیار کئے تھے تاکہ ایک طرف وہ اپنے مقصد کی چیزیں چھپوا سکیں اور دوسری طرف عیسائیت کی تبلیغ بھی چلتی رہے۔ گویا جب یہاں کے اردو اخباروں نے پادریوں کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبارات کی سازشوں کی بیخ کنی کر دی تو انہوں نے ایک دوسری چال چلی اور جنگی خبروں کی شکل میں مضامین اور دوسرے مواد کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بین السطور میں عیسائیت کی تبلیغ جاری رکھی اور اس سازش میں بہت سے اردو اخبارات پھنس گئے۔

اہلحدیث رسائل و جرائد

اہلحدیث، دیوبندی اور بریلوی مسلکوں کے رسائل و جرائد پر مشترکہ طور پر شائد کوئی باضابطہ اور تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ اسی لئے انگریزی دور حکومت میں ان رسائل کی تفصیلات ایک جگہ نہیں ملتیں۔ ہم نے اس بارے میں چھان بین کی تو پتہ چلا کہ کسی بھی مسلک میں اس موضوع پر کوئی کام نہیں کیا گیا ہے۔ (ممکن ہے کہ کسی نے کیا ہو جو ہماری نظر سے نہیں گزرا۔) ضیاء اللہ کھوکھر کی مذکورہ بالا کتاب میں بھی اس پر بہت مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کا موضوع مذہبی صحافت کی تحقیق نہیں ہے۔ دیوبندی اور بریلوی مسلک کے پرچوں کے سلسلے میں بھاگ دوڑ بہت زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ جن دیوبندی اور بریلوی عالموں اور پرچوں کے مدیروں سے ہم نے بات کی، انہوں نے اس کا شکوہ کیا کہ اس معاملے میں ان کی جماعت بہت پیچھے ہے۔ تاہم جماعت اہلحدیث کے رسائل و جرائد کی خاصی تفصیلات ایک جگہ دیکھنے کو مل گئیں۔ ابھی تک کی ہماری ناقص معلومات کے

مطابق آزادی سے پہلے سب سے زیادہ اسی مسلک کے رسائل شائع ہوتے تھے۔ جہاں دوسرے مسلک کے پرچوں کی تعداد بمشکل دو درجن تک پہنچتی ہے وہیں اس مسلک کے پرچوں کی تعداد پچاس سے اوپر ہے۔

اس وقت کی مذہبی صحافت پر روشنی ڈالتے وقت معروف اہلحدیث عالم دین، مناظر اسلام، محقق، مصنف، ادیب اور صحافی مولانا ثناء اللہ امرتسری کی خدمات کا ذکر نہ کرنا بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے جہاں عیسائیوں کی سازشوں کے تار و پود کو بکھیر دیا تھا وہیں انہوں نے آریہ سماجیوں کے قلعے کو بھی اپنے جارحانہ حملوں سے مسمار کر دیا تھا۔ ماہنامہ نوائے اسلام دہلی کے مدیر مولانا عزیز عمر سلفی قدیم اہلحدیث پرچوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے 1903 میں امرتسر سے اخبار اہلحدیث شروع کیا جو 1948 تک بلا توقف جاری رہا۔ اس میں مذہبی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور عصری مسائل سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ جس طرح دسترخوان پر ہر قسم کا ذائقہ ہوتا ہے اسی طرح اخبار میں بھی ہر قسم کا ذائقہ ہونا چاہیئے۔ یہ اخبار جماعت اہلحدیث کا ترجمان بھی تھا۔

مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی سے 1923 میں دو ماہی رسالہ محدث نکلا تھا جو بعد میں سہ ماہی ہو گیا تھا۔ اس کے کئی مدیر ہوئے تھے اور یہ 1948 تک جاری رہا۔ یہ علمی اور مذہبی پرچہ تھا۔ آزاد ہندوستان میں حکیم عبدالشکور نے 1951 میں دہلی سے اخبار اہلحدیث شروع کیا جو 1964 میں ان کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔ بعد میں 1976 میں حکیم اجمل خاں نے شکراوہ ہریانہ سے اس کی نشاۃ ثانیہ کی۔ یہ رسالہ اب بھی جاری ہے۔ اس کے بعد 1952 میں دہلی سے جماعت اہلحدیث کا اسپوکس مین رسالہ ترجمان جاری ہوا۔ یہ جمعیت اہلحدیث کے زیر سرپرستی نکلتا ہے۔ پہلے اس کا نام ماہنامہ ترجمان تھا۔ پانچ سال کے بعد 1957 میں اسے پندرہ روزہ کر دیا گیا۔ پھر 1980 سے یہ جریدہ ترجمان کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ 1990 میں اسے ہفت روزہ کر دیا گیا اور اس کے بعد سے اس کی اشاعت مسلسل

جاری ہے۔ اس رسالے کے پہلے مدیر اعلی مولانا عبدالوہاب آروی تھے جبکہ مدیر مولانا عبد الحکیم مجاز اعظمی تھے۔

موجودہ وقت میں جاری اہلحدیث پرچوں میں سب سے قدیم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ سے شائع ہونے والا پندرہ روزہ الہدی ہے جو 1940 میں شروع کیا گیا تھا۔ دوسرا قدیم پرچہ سری نگر جموں وکشمیر سے نکلنے والا الافت روزہ مسلم ہے جو 1942 میں جاری ہوا تھا۔ تیسرا قدیم پرچہ مدرسہ ریاض العلوم جامع مسجد دہلی سے نکلنے والا ماہنامہ الاسلام ہے جس کا اجرا 1955 میں ہوا تھا۔

بعد میں مولانا ثناء اللہ امرتسری نے مئی 1908 میں امرتسر سے ماہنامہ ''مسلمان'' جاری کیا۔ مارچ 1909 میں اس کا خاص نمبر 'تبرا اسلام' شائع ہوا۔ دراصل جولائی 1903 میں ایک شخص عبدالغفور نے مرتد ہوکر ہندو دھرم اختیار کیا اور دھرم پال نام رکھ کر اسلام کے خلاف ایک دل آزار اور نفرت انگیز کتاب 'ترک اسلام' لکھی۔ مولانا نے فوری طور پر قلم برداشتہ 'ترکِ اسلام' لکھ کر نہایت مدلل، محقق اور موثر جواب دیا۔ مسلمان کے اس خاص نمبر میں مولانا نے دھرم پال کی دو کتابوں نخل اسلام اور اساطیر الاولین کا تعاقب کیا اور ان کا موثر جواب دیا۔ جب دھرم پال بیمار ہوا تو مولانا امرتسری اس کی عیادت کے لئے اس کے پاس لاہور تشریف لے گئے۔ مولانا کے حسن سلوک سے دھرم پال متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور 1913 میں پھر حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ اس نے اپنا نام محمود دھرم پال رکھا اور پھر اس کا قلم اسلام کے حق میں خوب چلنے لگا۔ مولانا امرتسری کی مذہبی اور صحافتی خدمات پر بہت کام ہوا ہے اور مذکورہ بالا واقعہ محض ایک مثال ہے۔ ورنہ ان کی خدمات بہت گراں قدر اور لائق تحسین ہیں۔

اہلحدیث، دیوبندی اور بریلوی تینوں مکاتب فکر کے رسائل وجرائد کی خدمات کی، کسی کی کم کسی کی زیادہ، ایک تاریخ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان رسائل وجرائد نے آزادی سے قبل عیسائیوں کی سازشوں کی بیخ کنی کی تھی اور اسلام کے دفاع میں سرگرم عمل

ہوکر مسیحی سازشوں کو ناکام بنایا تھا۔مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند نے اس سلسلے میں جماعت اہلحدیث کے پرچوں پر روشنی ڈالی ہے۔اٹھائیسویں اہلحدیث کانفرنس پاکوڑ ، مارچ 2004 کے موقع پر ایک یادگار مجلّہ اہلحدیث شائع کیا گیا تھا جس میں جماعت اہلحدیث کی صحافتی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔اس نے جماعت اہلحدیث کے قدیم (انگریزی دور حکومت کے) اخبارات و رسائل کی تعداد 98 بتائی ہے اور ان کو مضامین کے اعتبار سے چھ اقسام میں تقسیم کیا ہے۔پہلی قسم میں ادیان باطلہ کی تردید والے اخبارات و رسائل کو رکھا گیا ہے اور ان کی تعداد دس بتائی گئی ہے۔یہ رسائل و جرائد اس طرح ہیں:

ماہنامہ اشاعت السنہ بٹالہ گورداسپور، ایڈیٹر مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی۔
ماہنامہ الہادی سیال کوٹ، ایڈیٹر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی۔
ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر، ایڈیٹر مولانا ثناءاللہ امرتسری۔
ماہنامہ مرقع قادیانی امرتسر، مولانا ثناءاللہ امرتسری۔
ہفت روزہ مسلمان امرتسر، مولانا ثناءاللہ امرتسری۔
ماہنامہ ضیاءالسنہ کلکتہ، مولانا ضیاءالرحمٰن۔
ہفت روزہ امام فیض آباد۔
ہفت روزہ اخبار جعفر زٹلی لاہور، ملا محمد بخش لاہوری۔
ہفت روزہ کرزن گزٹ دہلی، مرزا حیرت بیگ دہلوی۔
پندرہ روزہ تبلیغ جبل پور، مولانا عبدالجبار عمرپوری۔

اس فہرست میں دوسری قسم شرک و بدعات کی تردید ہے۔ایسے رسائل کی تعداد 12 ہے۔ تیسری قسم ادب و تاریخ، تعداد 16۔چوتھی قسم ادب و سیاست و اصلاح اخلاق، تعداد 14۔پانچویں قسم دینی اصلاحی و اخلاقی، تعداد 20۔چھٹی قسم جہاد فی سبیل اللہ، تعداد دو۔

وہ اہلحدیث رسائل و جرائد جو 1937 کے بعد بند ہو گئے:

ماہنامہ اشاعت السنہ بٹالہ، ماہنامہ تبلیغ السنہ دہلی، ماہنامہ ضیاءالسنہ کلکتہ، ماہنامہ الہادی

سیالکوٹ ہفت روزہ مسلمان سیالکوٹ، ماہنامہ اہل الذکر فیض آباد ہفت روزہ توحید امرتسر، ماہنامہ النذیر گجرات پنجاب، ماہنامہ دلگداز لکھنؤ، ماہنامہ نظارہ میرٹھ، ماہنامہ نصرت السنہ بنارس۔

وہ رسائل جو 1947 تک جاری رہے:

پندرہ روزہ محمدی دہلی، ماہنامہ محدث دہلی، ماہنامہ ریاض توحید دہلی، ماہنامہ اہلحدیث گزٹ دہلی، ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر، ہفت روزہ مبلغ امرتسر ہفت روزہ ہند جدید کلکتہ، ماہنامہ مسلمان سوہدرہ، ماہنامہ مجلّہ سلفیہ دربھنگہ ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث روپڑ، ماہنامہ مصحف عمرآباد۔

انیسویں صدی کے ربع کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں عیسائیت کا جال پھیلانا شروع کر دیا تھا اور یہ سلسلہ صدی کے اواخر تک جاری رہا۔ اس کے لئے انہوں نے جہاں ایک طرف پادریوں کی خدمات حاصل کیں وہیں خوبصورت دوشیزاؤں کو بھی میدان میں اتار دیا۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں سے بہت سے لوگ عیسائی مذہب اختیار کرنے لگے۔ یادگار مجلّہ اہلحدیث کے مطابق ''ایسے نازک وقت میں جماعت اہلحدیث ہند کی ایک کانفرنس (امرتسر) میں شیخ غلام محی الدین وکیل قصور ضلع لاہور نے تمام علما خصوصاً علمائے اہلحدیث کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'اس وقت اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ ہے، پادریوں کو ڈر ہے کہ قرآن اگر ترقی کر گیا تو مسیح کی ابنیت اور الوہیت کو صدمہ پہنچے گا۔ اس لئے عیسائی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں مگر ہم مسلمان ہیں کہ سوئے ہوئے ہیں۔ اس وقت وعظ و تذکیر کا کام پانچ سو عیسائی عورتیں کر رہی ہیں، مردوں کو کون کہے۔' اس پر علمائے اہلحدیث کو غیرت آئی اور وہ کمر ہمت کس کر میدان میں کود پڑے۔'' انگریزوں نے جب اپنے مشن میں ناکامی دیکھی تو انہوں نے دوسرا حربہ اختیار کیا اور چند ایمان

فروش علما کو تیار کر کے مذہبی جھگڑے کھڑے کر دیے۔ چنانچہ فوری طور پر مولانا ابو سعید محمد حسین بٹالوی نے ایک ماہنامہ اشاعت السنہ اور ملا محمد بخش لاہوری نے ایک ہفت روزہ اخبار جعفر زٹلی کے نام سے جاری کیا۔ اس کے بعد مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پہلے ماہنامہ مسلمان اور پھر ہفت روزہ اہلحدیث شروع کیا۔ بعد میں وہ دوسرے اخبارات بھی نکالتے رہے۔

دیوبندی رسائل و جرائد

جیسا کہ ضیاء اللہ کھوکھر کے مضمون سے یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستان میں مذہبی صحافت کا آغاز اگست 1872 میں بنگلور سے شروع ہونے والے دس روزہ منشور محمدی سے ہوتا ہے، جو کہ عیسائیت کی تبلیغ کو ناکام بنانے اور پادریوں کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جاری کیا گیا تھا اور جس کے مدیر محمد شریف تھے۔ دوسرا اخبار ماہنامہ اشاعت السنہ تھا جو کہ مولانا محمد حسین بٹالوی نے جنوری 1878 میں لاہور سے شروع کیا تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے رسالے بھی نکلتے رہے۔ لیکن مدرسوں سے ان کا تعلق نہیں تھا بلکہ یہ پرچے پادریوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے شخصی طور پر نکالے گئے تھے۔ کسی مدرسے سے نکلنے والا سب سے پہلا اخبار 'تحفہ حنفیہ' ہے جسے بریلوی مکتب فکر کے معروف عالم دین قاضی عبدالواحد عظیم آبادی نے 1897 میں مدرسہ حنفیہ پٹنہ سے نکالا تھا۔

اس کے بعد دارالعلوم دیوبند سے جون 1914 میں دو مذہبی رسالے ماہنامہ 'الرشید' اور ماہنامہ 'القاسم' جاری کئے گئے۔ ان کے مدیر مولانا حبیب الرحمٰن تھے۔ یہ دونوں رسالے مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی کی یاد میں شروع کئے گئے تھے اور ان کا مقصد مسلم معاشرے سے سماجی برائیوں کا خاتمہ اور اسلامی شریعت پر لوگوں کو گامزن کرنا تھا۔ الرشید ہر مہینے کی آخری تاریخوں میں منظر عام پر آتا اور القاسم ابتدائی تاریخوں میں جلوہ گر ہوتا۔ ماہنامہ الرشید کے پہلے شمارے میں پرچے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے

سراج احمد رشیدی لکھتے ہیں:

''ملک میں بہت سے اخبارات و رسائل جاری ہیں مگر ایسے رسائل کہ جن سے تمدن کی غلط فہمیاں دفع ہوں، مسلمانوں میں تدین اور مذہبی استقامت باقی رہے، اسلامی اصولوں کی حفاظت کی جائے، شریعت غرّائے محمدی کی پابندی کی جائے اور مسلمانوں کو اس پر پابندی کی ہدایت کی جائے، جو اسلام پر اعتراضات احباب اور اغیار کی جانب سے ہوتے رہے ہیں ان کے کافی و شافی دنداں شکن مہذب اور نرم پیرائے میں جواب دئے جاویں، عامتہ المسلمین کے دوست نما دشمنوں کے مخفی دھوکوں اور خضر صورت مغویوں کی، رہزنوں سے حفاظت کی جائے۔۔۔ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہم ایک مدت سے خواہاں تھے۔۔۔خدا تعالیٰ کا نام لے کر محض اس کے بھروسے پر الرشید کو جاری کرتے ہیں۔''اسی طرح القاسم کی اشاعت بھی انہی مقاصد کے تحت ہوئی اور ایک ساتھ دو دو رسالوں کے جاری کرنے کا جواز بھی پیش کیا گیا ہے۔

ان رسالوں میں بنیادی طور پر مذہبی اور مسلکی مضامین شائع کئے جاتے تھے۔کچھ خاص کالم بھی متعین تھے جو ہر شمارے میں پابندی سے برتے جاتے تھے۔ان کے علاوہ اصلاحی مضامین بھی ہوتے اور دارالعلوم سے جاری کئے جانے والے فتاوے بھی ان میں شائع کئے جاتے تھے۔ان رسالوں کی فائل پر سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ اس وقت جہاں انگریز مسلمانوں کے ایک فریق تھے وہیں مسلمانوں میں مسلکی اختلافات بھی کم نہیں تھے۔اس کی جھلک ان پرچوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔دوسرے مسلکوں کے ذریعے دیوبندی مکتب فکر پر کئے جانے والے اعتراضات کے جواب بھی شائع کئے جاتے تھے۔ ان دنوں ایسے بہت سے رسالے یا کتابچے شائع ہوتے تھے جو دوسرے مسلکوں پر چھینٹا کشی کے لئے وقف تھے۔الرشید اور القاسم میں ایسی کتابوں یا کتابچوں کا تعارف پیش کیا جاتا اور 'تقریضات کتب' کے عنوان سے ان پر تبصرے شائع کئے جاتے تھے جو دوسرے مسلک کے اعتراضات کے جواب دینے کے لئے لکھے جاتے تھے۔ان رسالوں کی ورق گردانی سے یہ

بھی اندازہ ہوا کہ زیادہ تر شمارے مفت یا اعزازی بھجوائے جاتے تھے۔ لیکن جب اعزازی قارئین کی تعداد زیادہ ہوگئی تو یہ اعلان کیا گیا کہ جو لوگ ان رسالوں کو پڑھنا چاہتے ہیں وہ سالانہ چندہ مع ڈاک خرچ دو روپے آٹھ آنے ارسال فرمائیں۔ ایک اعلان میں کہا گیا ہے کہ جس کو الرشید کا کوئی ایک شمارہ چاہئے وہ ایک آنہ ارسال کر کے حاصل کر سکتا ہے۔ ایک اعلان میں یہ بتایا گیا کہ اب تک شائع ہونے والے شماروں کی سالانہ فائل بندی کر دی گئی ہے اور جس کو چاہئے وہ قیمت ارسال کر کے حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ سراج احمد رشیدی نے ان رسالوں کی اشاعت کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے 'احباب اور اغیار کی جانب سے اسلام پر اعتراضات' کی بات کہی ہے تو اغیار عیسائی اور دوسرے غیر مسلم ہوئے اور احباب سے مراد وہ مسلمان ہیں جو دوسرے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور جو دیوبندی فکر پر نکتہ چینی کرتے تھے۔

ان رسالوں میں جہاں اسلامی و اصلاحی مضامین شائع ہوتے تھے وہیں بعض اوقات انگریز افسروں کی شان میں بھی، مصلحت وقت کے تحت، چیزیں شائع ہوتی تھیں۔ ماہنامہ الرشید کے جمادی الاولی 1333ھ کے شمارے میں ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لیفٹننٹ گورنر سر جیمس اسکار جی مسٹین صاحب بہادر کی ایک تقریر کے اقتباسات شائع کئے گئے ہیں۔ یہ تقریر انہوں نے مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے دورے کے موقع پر یکم مارچ 1915 کو کی تھی۔ اس خطاب میں لیفٹننٹ گورنر حاضرین جلسہ، علما اور دارالعلوم کے مدرسوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور ایک عالمانہ و فاضلانہ تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''آجکل دنیا کے لوگوں کا میلان تین امور ناقص کی طرف ہے۔ اول یہ کہ لوگ بلا لحاظ عقبی کی راحت دائمی کے رات دن دولت دنیا کے حصول کی سعی کرتے ہیں۔۔۔ دوسرا امر یہ ہے کہ لوگ ظاہری زیب و زینت اور نام و نمود کی طرف مائل رہتے ہیں اور روحانی و باطنی ترقیات و برکات حاصل کرنے کے لئے، جو سچی نعمتیں ہیں، کوئی حصہ اپنے وقت کا باقی

نہیں رکھتے۔ تیسرا امر یہ کہ لوگ مذہب کے پردہ میں تعصب کا برتاو کرتے ہیں اور باہمی نزاع و نفاق پھیلاتے ہیں۔ بجائے اس کے مذہبی پند و تعلیم سے بات ذہن نشین کریں کہ خداوند عالم کی نظر میں اس کے کل بندے یکساں ہیں۔۔۔''

اس کے بعد حاضرین کو خوش کرنے کے لئے کہتے ہیں:

''آج مجھ کو یہ یقین دلانے کا موقع ملا ہے کہ حکومت آپ کے مدرسے کی نہایت عزت و وقعت کرتی ہے، اگرچہ آپ کی قوم پر تکلیف و مایوسی کا زمانہ گزر رہا ہے مگر آپ ہمیشہ ان کو عاقلانہ وعظ و پند کی روشنی دکھلاتے رہے ہیں اور سچے مذہب کی تعلیم سے اس حالت افسردگی میں تسکین و تسلی دیتے رہے ہیں......اپنی قوم کی مدد کرنے سے آپ بعینہ ہم کو مدد دیتے ہیں اور ہمارا ساتھ دینے سے آپ ہمارے دل میں اپنی قوم کا اعتماد اور اعتبار قائم کرتے ہیں۔'' اس کے بعد صاحب بہادر یہ یقین دلاتے ہیں کہ ان کو کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ انہیں یاد کر سکتے ہیں جس پر ان کو خوشی ہوگی۔ اس تقریر سے اس وقت کے حالات اور مسلمانوں اور انگریزوں کے تعلقات پر روشنی پرتی ہے ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز افسران مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ دارالعلوم دیوبند کے ذمے داران ایک عرصے سے ان کو بلانا چاہ رہے تھے اور اب ان کو وہاں پہنچنے کا موقع ملا۔

الرشید کے ایک شمارے میں ایک انگریز افسر کی ایک 'کرامت' کا بھی ذکر ہے۔ حالانکہ اس کرامت کو استہزائیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے، تاہم یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز افسروں کو خوش کرنے کے لئے کیسی کیسی چیزیں شائع ہوتی تھیں۔ اس واقعہ میں ایک انگریز افسر کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ اپنے گھر سے کافی دور کسی دوسرے مقام پر تھا اور اس وقت اس کو کسی موضوع پر ایک مضمون کی ضرورت پیش آئی تو اس نے خواہش کی کہ اس کے گھر جو صندوق رکھا ہوا ہے اور جس میں متعدد مضامین ہیں انہی میں ایسا ایک مضمون مل جائے۔ اس کے بعد اس کی روح وہاں پہنچتی ہے اور صندوق میں اس مضمون کا اضافہ کر دیتی

ہے۔ بعد میں جب افسر مذکور کی بیوی سے اس سلسلے میں دریافت کیا گیا تو اس نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ رات کے کسی وقت ان کے شوہر نامدار کا جسم دیوار سے برآمد ہوا اور اس نے صندوق کھول کر اس میں کچھ کیا۔ بعد میں جب انہوں نے صندوق کا معائنہ کیا تو اس میں وہ مضمون پایا گیا۔

بریلوی رسائل و جرائد

جیسا کہ ذکر کیا گیا بریلوی مسلک کے کسی مدرسے سے شائع ہونے والا پہلا مذہبی رسالہ تحفہ حنفیہ تھا جسے قاضی عبدالواحد عظیم آبادی نے 1897 میں مدرسہ حنفیہ پٹنہ سے نکالا تھا۔ اس کے بعد ایک طویل خاموشی ہے۔ اس کی ایک وجہ غالبًا یہ ہے کہ اس مسلک کے مدرسوں کے قیام میں تیزی بہت بعد میں آئی اور چونکہ مدرسے کم تھے اس لئے پرچے بھی کم تھے۔ البتہ 1920 کے آس پاس کئی رسالے نکلنے شروع ہوئے۔ جن میں ماہنامہ الفقیہ امرتسر، ماہنامہ الرضا بریلی ہفت روزہ دبدبہ سکندری رامپور، ماہنامہ السواد الاعظم، ماہنامہ انوار الصوفیہ اور نوری کرن بریلی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ رسالے آزادی سے پہلے ہی بند ہو گئے اور کچھ آزادی کے بعد بھی کچھ دنوں تک نکلتے رہے۔ ماہنامہ السواد الاعظم میں آریہ سماجی سوامی دیانند کی تصنیف ستیارتھ پرکاش کا مسلسل کئی شماروں میں جواب دیا گیا تھا۔ یہ کتاب آنحضورﷺ کی شان میں گستاخیوں سے پُر تھی۔ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کتاب کے جواب میں مناظر اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری نے 'حق پرکاش' نام سے ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی تھی جس میں انھوں نے ستیارتھ پرکاش کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

بریلوی مکتب فکر کے معروف عالم دین مولانا یاسین اختر مصباحی کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی ریشہ دوانیاں 1857 تک جاری رہیں۔ دوسرے مسلکوں کی مانند بریلوی مسلک کے علما نے بھی پادریوں اور آریہ سماجیوں کی سازشوں کا کھل کر مقابلہ کیا تھا۔ مولانا مصباحی کہتے ہیں کہ اس وقت کے رسالوں کا مزاج مسلکی نہیں مذہبی تھا۔ اس کی وجہ

وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان دنوں عوام میں مسلکی شدت اور جارحیت نہیں تھی اور نہ ہی آج کی مانند اختلافات تھے۔اس لئے اس وقت کے پرچوں کی کوئی مسلکی شناخت نہیں تھی۔

عیسائیت کی ریشہ دوانیوں کے بعد آریہ سماجیوں کا سازشیں شروع ہوئیں۔انہوں نے مسلمانوں کی شدھی کی جو تحریک چلائی اس نے جہاں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو نقصان پہنچایا وہیں وہ ہندو مسلم اتحاد بھی پارہ پارہ ہو گیا جو تحریک خلافت کے سبب پیدا ہوا تھا۔ان سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے مسلم تنظیمیں بھی سرگرم ہو گئی تھیں۔ بقول مولانا مصباحی 1823 میں آریہ سماجیوں کا فتنہ شروع ہوا تھا اور اس وقت کے تمام پرچوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ان پرچوں نے بھی ان سازشوں کو ناکام بنانے میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔اس مسلک کے پرچوں کی تعداد میں اضافہ آزادی کے بعد ہوا اور بالخصوص 1980 کی دہائی میں اور اس کے بعد ان کی تعداد خاصی بڑھ گئی۔اس سے قبل اس جماعت کے ایک ممتاز عالم دین مولانا ارشد القادری نے 1966 میں کلکتہ سے پندرہ روزہ جام کوثر شروع کیا تھا جو دو سال تک نکلا۔ بعد میں جام نور کے نام سے یہی رسالہ 1968 میں جاری کیا گیا وہ بھی دو سال تک نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔بعد میں ان کے پوتے خوشتر نورانی نے 2002 میں دہلی سے ماہنامہ جام نور کی نشاۃ ثانیہ کی۔اس وقت سے یہ رسالہ پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔

شیعہ رسائل و جرائد

شیعہ رسائل و جرائد کا آغاز بہار میں سیوان کے نزدیک ایک شیعہ مرکز کھجوا سے ہوتا ہے جہاں سے 1898 میں 'اصلاح' کے نام سے پہلا اردو رسالہ جاری ہوا۔ یہ رسالہ مولانا سید علی اظہر کی سرپرستی میں ان کے بڑے صاحب زادے علامہ سید علی حیدر نے شروع کیا تھا۔اس کا پہلا شمارہ نو جنوری 1898 کو منظر عام پر آیا تھا۔اس کے مدیر اول علامہ سید علی حیدر اور مدیر دوم مولانا سید محمد باقر نقوی تھے۔اسی ادارے سے بعد میں ماہنامہ 'الشمس'

جاری ہوا اور پھر 1928 کے آس پاس 'الکلام' جاری ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی سے بھی اصلاح کا اجرا ہوا جو اب بھی نکل رہا ہے۔ جبکہ کھجوا سے اصلاح کا دفتر لکھنؤ منتقل ہو گیا ہے اور اب یہ وہیں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ درمیان میں چند سال بند رہا لیکن اس کے بعد اس کی اشاعت پھر شروع ہوئی اور اس وقت سے یہ مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اصلاح کے موجودہ مدیر مولانا سید محمد جابر جوراسی ہیں۔ ان کے مطابق رسالہ اصلاح کو ایران کی ایک تنظیم نے اردو کے سب سے قدیم شیعہ رسالے کا ایوارڈ تفویض کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اصلاح کے ادارے سے شائع ہونے والے رسالے الکلام میں دوسرے مسلک کی جانب سے شیعہ مکتب فکر پر کئے جانے والے اعتراضات کے جواب دیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں مختلف عربی کتابوں کے ترجمے بھی شائع کئے جاتے تھے۔ بقول ان کے یہ تمام پرچے مذہبی نوعیت کے تھے۔

اس دوران دوسرے مقامات سے بھی شیعہ پرچوں کا اجرا ہوا۔ مثال کے طور پر 70 کی دہائی میں لکھنؤ سے ہفت روزہ سرفراز شروع ہوا تھا جو 80 کی دہائی میں بند ہو گیا۔ وہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا ترجمان تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر خواجہ اسد تھے۔ اس کے علاوہ اخبار نظارہ ویکلی نکلا جس کے مدیر فضل نقوی تھے۔ ایک اور جریدہ روشنی کے نام سے نکل رہا تھا جو بعد میں بند ہو گیا۔ اس وقت ملک کے مختلف علاقوں سے جو شیعہ رسالے شائع ہو رہے ہیں ان میں شعائے عمل، تنظیم المکاتب، نظارہ، طوبی، الواعظ، ذکری، مدینۃ العلم، ناصر، باب العلم اور حکیم الامت قابل ذکر ہیں۔

1999 میں ماہنامہ اصلاح کا صدی نمبر شائع ہوا تھا جو جنوری تا مارچ کے شماروں پر مشتمل تھا۔ اس میں اصلاح کے تعلق سے بھی کچھ مضامین شامل ہیں جن سے اصلاح پر تو روشنی پڑتی ہی ہے بعض دیگر معاملات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ مولانا سید سعید اختر رضوی اپنے مضمون 'کچھ یادیں کچھ یادداشتیں' کے عنوان سے لکھتے ہیں ''برصغیر ہند و پاک کے شیعہ جرائد میں قدیم ترین ماہنامہ 'راہ نجات' (گجراتی) ہے جسے علامہ حاجی غلام علی، حاجی اسمٰعیل

نے ذیقعدہ 1310 ہجری میں بھاونگر گجرات سے جاری کیا تھا۔اور چار سال بعد اسے احمد آباد لے آئے۔تقسیم ہند کے بعد اسے ان کے صاحب زادے قاسم علی کوثری مرحوم کراچی لے کے آ گئے۔اور اب ان کے صاحب زادے اسے پابندی کے ساتھ نکال رہے ہیں۔ دوسرا قدیم ترین رسالہ ماہنامہ اصلاح (اردو) کھجوا ہے۔یہ رسالہ درمیان میں چند سال کے وقفے کے علاوہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔اس درمیان بیسیوں رسالے اردو میں نکلے اور بند ہو گئے۔ان میں قابل ذکر البرہان (لدھیانہ)، الحافظ (لاہور)، سہیل یمن (لکھنؤ) اور سرفراز (لکھنؤ) ہیں۔ان کے علاوہ خود ادارہ اصلاح کے ماہنامے الشمس اور الکلام اور کھجواہی سے نکلنے والا ماہنامہ شیعہ ہے......اصلاح کے پرانے پرچوں سے اس زمانے کے قومی تعلیمی اور سماجی حالات کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اس کے مطالعہ سے خود ادارہ اصلاح کی قدم بہ قدم ترقیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔''

اسی طرح اپنے مضمون 'اصلاح کا دم غنیمت ہے' میں مولانا سید کلب صادق لکھتے ہیں ''ہندوستان میں اس وقت شیعوں کے کم وبیش پچاس دینی مدارس ہیں ان میں طلبہ کی تعداد بیس پچیس سے لے کر زائد از دو تین سو تک ہوگی۔اس کے مقابلے میں اہل سنت کے با قاعدہ اور منظّم چھ ہزار سے زائد مدارس ہیں۔کسی مدرسہ میں بھی دو تین سو سے کم طلبہ نہیں ہیں۔بعض مدارس میں طلبہ کی تعداد چھ سات ہزار تک ہے۔شیعہ مدارس میں صرف ایک مدرسہ الواعظین ایسا ادارہ تھا جہاں سے انجمن موید العلوم کے ذریعہ کتابوں کی نشر و اشاعت کا کام ہو رہا تھا۔سو یہ مدرسہ سسک رہا ہے اور موید العلوم کا انتقال پر ملال ہو چکا ہے۔البتہ تنظیم المکاتب سے کسی حد تک نشر و اشاعت کا کام ہو رہا ہے۔دوسری طرف میرے علم میں ہند و پاک کا کوئی ایسا سنی مدرسہ نہیں ہے جہاں با قاعدہ دار الاشاعت موجود نہ ہو۔مدارس سے الگ بے شمار ایسے ادارے ہیں جو منظّم طریقے پر بھر پور تحقیقی انداز میں اپنے نقطہ نظر کے اعتبار سے اسلام کی ترویج کر رہے ہیں......اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اصلاح کا دم غنیمت ہے......اس ادارہ کی بنیاد مولانا حکیم اظہر صاحب نے ڈالی تھی ان کے انتقال کے

بعد اس کی ذمہ داری مرحوم کے فرزند مولانا علی اظہر صاحب نے سنبھالی۔ وہ جنت سدھارے تو ان کے فرزند مولانا محمد باقر صاحب اور ان کے برادر خورد آغا جعفر صاحب نے اس کی ذمہ داری سنبھالی......ایک زمانے میں پل فرنگی محل پر واقع کاظم ہوٹل گرد و پیش کے شاعروں اور لکھنؤ کے وضعداروں کا مرکز رہا کرتا تھا۔ مولوی باقر صاحب مرحوم زندگی بھر اسی ہوٹل کی ایک کرسی و میز لے کر ہوٹل مالک کاظم صاحب کے بقول مضامین نویسی سے لے کر پروف ریڈنگ تک کا سارا کاروبار انجام دیا کرتے تھے......بہر حال اس وقت قلمی جہاد میں سستی آ گئی ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں تقریباً سناٹا ہے۔ پاکستان میں کوئی ہمت کرتا ہے تو سپاہ صحابہ کی گولیاں اسے چھلنی کر دیتی ہیں......شیعہ سنی اتحاد بے شک بہت ضروری ہے مگر اس حد تک نہیں کہ ہم اپنا تشخص ہی کھو دیں......مختصر یہ کہ مولانا باقر نقوی صاحب کے انتقال کے بعد اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ ادارہ اصلاح بھی امامیہ مشن، سرفراز قومی پریس اور اخبار موید العلوم وغیرہ کی طرح دم توڑ دے گا مگر اس ''جابر العظم الکبیر'' نے اس ٹوٹتے ادارہ کے لئے مولانا باقر صاحب جوراسی کے فرزند جابر جوراسی کو مسیحا بنا دیا۔ نحیف و نزار دھان پان انسان نے اس کتاب دشمن اور مطالعہ بیزار ملت میں انتہائی نا مساعد آندھیوں میں اس چراغ کو بچائے رکھنے میں پوٹے ٹیکے ہوئے ہے۔''

مولانا سید علی اختر رضوی گوپال پوری اپنے مضمون 'اصلاح کے صد سالہ نقوش' میں لکھتے ہیں ''اردو میں شیعوں کا خالص دینی رسالہ ہونے کی حیثیت سے اصلاح کو اولیت حاصل ہے۔ یہ رسالہ ایک صدی قبل اس وقت نکلا تھا جب شیعوں پر ناروا حملے کئے جا رہے تھے۔ ساری دنیا کرب و اضطراب کی شکار تھی۔ عالم گیر جنگ کے خطرات دستک دے رہے تھے۔ میڈیا کے ذریعے فضا تیار کی جا رہی تھی۔ خون بہانے کے بجائے خیالات بدلنے پر توانائیاں صرف کی جا رہی تھیں۔ مسلمانوں کے دونوں فرقے اہل سنت اور شیعہ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے بری طرح شکار تھے......اس پس منظر میں اصلاح کا اجرا بہت مفید ثابت ہوا۔ اس کی اشاعتوں کے صد سالہ نقوش کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو شیعوں کی

خوں گشتہ تاریخ مرتب کرنے میں بڑی مدد لی جا سکتی ہے...... برصغیر میں شیعہ صحافیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن ایسے صحافی جو اصیل شیعی ثقافت اور بدلتے معاشرتی رجحانات میں اپنے اقدار کا تحفظ کرنے والے ہوں اور ان میں بھرپور دینی بصیرت بھی ہو، بہت کم ہیں۔'' ایک ممتاز شیعہ عالم دین علامہ ذیشان ہدایتی دینی رسالوں کے معیار کے تعلق سے کہتے ہیں کہ آج کے تمام رسالے اپنے اپنے مکتب فکر کی نمائندگی کر رہے ہیں اور ان کے ذریعے اپنی فکر کی ترویج کر رہے ہیں۔ تاہم وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اپنی فکر کی ترویج و اشاعت میں دوسرے مکاتب فکر پر حملہ نہیں ہونا چاہیے اس سے مسلکی منافرت اور کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ آج مسلمانوں میں اتحاد کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلکی شدت سے گریز کیا جائے۔ اسی طرح ایک سینئر صحافی جناب عالم نقوی کا بھی کہنا ہے کہ مسلکی شدت مسلم اتحاد کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اس کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ لیکن ان کے خیال میں انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ ایک بار پھر ان پرچوں میں مسلکی شدت نظر آنے لگی ہے جو کہ چند سالوں قبل ختم یا کم ہو گئی تھی۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اپنے اپنے مکتب فکر کی ترجمانی اور ترویج و اشاعت تو ضرور کی جائے اس سے کوئی نہیں روکتا لیکن ایسا کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ اس سے دوسروں پر ضرب نہ پڑے اور دوسرے مکاتب فکر پر ناروا حملے نہ کئے جائیں۔

موجودہ منظر نامہ

ہندوستان میں دینی مدارس کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ لیکن ان کی صحیح تعداد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی کیونکہ ان کا کوئی باضابطہ سروے نہیں ہوا ہے۔ بعض ذرائع ان کی تعداد پچیس ہزار تو بعض چالیس ہزار تک بتاتے ہیں۔ لیکن بی جے پی کے ممبر پارلیمنٹ اور انگریزی روزنامہ پائنیر کے ایڈیٹر چندن مترا اپنے ایک مضمون

میں ان کی تعداد پانچ لاکھ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سرکاری ذرائع کے اعداد و شمار ہیں، ان کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ ادھر مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے ایک ریکارڈ کے مطابق ہندوستان میں صرف جماعت اہلحدیث کے دینی مدرسوں، گرلس اسکولوں، تکنیکی تعلیمی اداروں، طبیہ کالجوں اور سیکولر تعلیمی اداروں کی تعداد پچیس ہزار ہے۔ بہر حال اعداد و شمار کے ان متضاد دعوؤں سے قطع نظر یہ بات بہر حال کہی جا سکتی ہے کہ ملک میں دینی اداروں کی تعداد ہزاروں میں ضرور ہے۔ جن میں چھوٹے اور بڑے ادارے شامل ہیں۔ ان اداروں کو جہاں اپنے وجود کی بقا کے لئے مختلف طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں وہیں انہیں اپنی تشہیر اور اپنے پروگراموں کے پروپگنڈے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اس مقصد کے لئے سب سے آسان طریقہ رسائل کا اجرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کا ہر بڑا ادارہ اپنا کوئی نہ کوئی رسالہ شائع کرتا ہے۔ اب تو متوسط ادارے بھی رسالہ نکالتے ہیں خواہ وہ سہ ماہی ہی کیوں نہ ہوں۔ ان جریدوں کی مدد سے وہ اپنا حلقہ اثر وسیع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے پروگراموں اور منصوبوں سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ جس طرح مدرسوں کی تعداد کا کوئی باضابطہ سروے نہیں کیا گیا ہے اسی طرح اس کا بھی کوئی باضابطہ سروے نہیں کیا گیا ہے کہ کتنے ادارے اپنا رسالہ نکالتے ہیں۔ تاہم ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے کسی بھی طرح کم نہیں ہوگی۔

رسائل کی زمرہ بندی اوران کا معیار

اگر ہم مواد اور مضامین کے اعتبار سے ان رسالوں کی زمرہ بندی کریں تو انہیں کم از کم مندرجہ ذیل چار زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ علمی و تحقیقی
۲۔ مذہبی و مسلکی
۳۔ نیم مذہبی نیم سیاسی

۴۔ عوامی

لیکن جو رسالے اور جریدے اس وقت شائع ہو رہے ہیں ان میں اول الذکر قسم کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ان کا مزاج علمی اور تحقیقی رکھا جائے گا تو وہ اپنے مقصد میں ناکام رہیں گے۔ ان کی مدد سے نہ تو چندے کے وسائل پیدا ہوں گے اور نہ ہی حلقہ اثر بڑھایا جا سکے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پرچے کے مزاج میں تنگ نظری اور معیار میں پستی ہو۔ ہاں جن پرچوں کے ذمے داروں کے سامنے ایسا کوئی مقصد نہیں ہے ان میں علمی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر معارف اعظم گڑھ، بحث ونظر دہلی اور تحقیقات اسلامی علیگڑھ جیسے رسالوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

مدیر نوائے اسلام مولانا عزیز عمر سلفی کہتے ہیں کہ مدارس سے نکلنے والے بیشتر رسالے معیار کی کسوٹی پر کھرے نہیں اتر سکتے۔ یہ رسالے صحافت نہیں پروپگنڈہ کرتے اور اسی کے ساتھ اپنے اداروں کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسٹالوں پر نظر نہیں آتے۔ وہ مضامین کی نوعیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان میں چند موضوعات سے متعلق دینی مضامین گھوم پھر کر بار بار آتے ہیں اور موسمی مضامین ہی ان میں شائع ہوتے ہیں۔ البتہ اداریہ حالات حاضرہ پر ہوتا ہے۔ ماہنامہ الاحسان کے مدیر مولانا عبدالمعید مدنی ان کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان پرچوں میں غیر معیاری مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ اس سے بھی متفق ہیں کہ ان کے اجرا کا مقصد اپنے اداروں کی نمائندگی اور ترجمانی ہوتی ہے، صحافت نہیں۔ تاہم ان کا کہنا ہے کہ ان رسالوں کو مسلکی صحافت کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک معارف ایک معیاری رسالہ ہے جو کہ برصغیر کی اردو ثقافت اور اردو تہذیبی شناخت کا نمائندہ ہے۔ وہ لکھنؤ کے تعمیر حیات کو بھی اچھا پرچہ مانتے ہیں۔

ہم نے جتنے لوگوں سے بات کی تقریباً سبھی اس سے متفق نظر آئے کہ اول تو ان رسالوں کا کوئی معیار نہیں ہوتا اور دوم وہ اپنے اپنے اداروں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تنظیم

ابنائے قدیم دیوبند کے رسالے ماہنامہ ترجمان دارالعلوم دہلی کے مدیر وارث مظہری کے خیال میں ان پرچوں کو مسلکی پرچہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں خالص مسلکیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اپنے حلقے کا دائرہ وسیع کرنے اور اپنے چندے میں اضافہ کرنے کے مقصد سے نکالے جاتے ہیں اور یہی ان کا اولین ہدف بلکہ نصب العین ہوتا ہے۔ مذہبی یا مسلکی مضامین کو ثانوی درجہ حاصل ہے۔ یا اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو مذہبی اور مسلکی مضامین شائع ہوتے ہیں وہ دوسرے درجے کے ہوتے ہیں۔ لیکن وارث مظہری یہ بھی کہتے ہیں کہ ان پرچوں کی مدد سے اپنے مسلک اور اپنے حلقے کی ترجمانی تو ہوتی ہی ہے، حلقہ بندی بھی جڑ پکڑتی ہے اور ایک گروپ میں کئی گروپ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ مناظرانہ کشمکش پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان رسالوں میں دین کی ترجمانی حلقے کی ترجمانی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ رسائل غیر معیاری کیوں ہوتے ہیں؟ اس پر ان کا کہنا ہے کہ چونکہ انہیں عام لوگوں تک ہی پہنچانا ہوتا ہے اس لئے ایسے مضامین شائع کئے جاتے ہیں جو عام فہم ہوں۔

ان رسالوں میں سیاسی مضامین بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں گہرائی اور استدلال کا فقدان ہوتا ہے۔ قومی و بین الاقوامی حالات پر تبصرے بھی ہوتے ہیں اور اسلام کے خلاف سازشوں کے جواب بھی دیے جاتے ہیں لیکن ان میں بھی سنجیدگی، استدلال اور معیار کی پستی جھلکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین کا ان کے قارئین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے سکریٹری اور کالم نگار مولانا عبدالحمید نعمانی کے خیال میں لوگ ان پرچوں کو بہت کم پڑھتے ہیں اور جو پڑھتے بھی ہیں وہ پڑھنے کے بعد پھینک دیتے ہیں۔ ان کا ان کی سوچ اور ان کی رائے پر کوئی اثر نہیں پرتا۔ ان کے نزدیک معارف اعظم گڑھ، احتساب دریاباد سنت کبیر نگر اور تحقیقات اسلامی علیگڑھ معیاری رسالے ہیں۔ ان میں علمی مضامین شائع ہوتے ہیں اور معارف کا مزاج علمی و تحقیقی کے ساتھ ساتھ ادبی بھی ہے۔ ان کے خیال میں احتساب فقہی اور حدیثی مسئلے کی تحقیق کرتا ہے اور علمی بحث اٹھاتا ہے۔ جبکہ تعمیر

حیات میں عمومی مسائل کے ساتھ ساتھ عالم عرب پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔اسی طرح تحقیقات اسلامی عصر حاضر کے مسائل کو اسلامی تناظر میں اٹھا کر تحقیق کرتا ہے۔عبدالحمید نعمانی اسلامی مرکز نظام الدین نئی دہلی سے مولانا وحیدالدین خاں کی ادارت میں نکلنے والے پرچے الرسالہ کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک بالکل الگ نوعیت کا جریدہ ہے۔اس میں مسلک کی نمائندگی نہیں ہوتی بلکہ اسلامی مسائل کو جدید دور کے تقاضوں کے تحت دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس کے مضامین میں جو بات کہی جاتی ہے وہ مدلل انداز میں ہوتی ہے۔سائنس وفلسفہ اور موجودہ دور کے حالات نے جو چیلنج اور سوال کھڑے کر دیے ہیں ان پر بحث کی جاتی ہے۔لیکن ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ پرچہ جمہور سے الگ ہٹ کر اپنی رائے رکھتا ہے اور مولانا وحیدالدین خاں کے نظریات کو ماننے والوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہو گیا ہے۔نعمانی کہتے ہیں کہ علما کی بڑی تعداد کے نزدیک مولانا وحید الدین خاں کا نظریہ انحرافی ہے لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس کو پسند کرتا ہے۔عبدالحمید نعمانی محدث بنارس اور آثار مؤ کو بھی پسند کرتے ہیں اگرچہ ان میں مسلک اہلحدیث کی نمائندگی ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ہی وہ بریلوی مکتب فکر کے رسالے ماہنامہ جام نور کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ادھر عبدالمعید مدنی کہتے ہیں کہ اس وقت جو رسالے شائع ہو رہے ہیں ان میں مقصدیت کا فقدان ہے، اسلوب نگارش غیر موثر ہے اور انداز پیشکش بھی بہت پھیکا ہے۔ان کے خیال میں مقصدیت، زبان و بیان اور انداز پیشکش کے اعتبار سے بریلوی مکتب فکر کا رسالہ جام نور سب سے بہتر ہے۔وہ جدید مسائل کو بھی اٹھاتا ہے اور فقہی مسائل کو بھی لیکن اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں شدت سے کام نہیں لیتا۔ جام نور کے مدیر خوشتر نورانی نے ایک بات چیت میں بتایا کہ وہ روایتی انداز میں دینی صحافت پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے انہوں نے ایک نئی طرز اختیار کی ہے۔وہ یہ ہے کہ انہوں نے موضوعات کے اعتبار سے مضمون نگاروں کا الگ الگ پینل بنایا ہے۔اس کے علاوہ وہ دوسرے مسلک کے سرکردہ

لوگوں سے بھی لکھواتے ہیں۔اس پرچے میں تنگ نظری کم اور توسع زیادہ ہے۔معیار اور گیٹ اپ کے اعتبار سے یہ عام روایتی انداز میں شائع ہونے کے بجائے جدید تقاضوں کے مطابق شائع ہوتا ہے۔حالانکہ اس میں بھی مسلکیت ہے لیکن اس میں شدت نہیں ہے۔مولانا مدنی کے نزدیک اس وقت دینی صحافت میں چار رسالے ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ان چاروں کا بریلوی مکتب فکر سے تعلق ہے۔ وہ ہیں ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، ماہنامہ کنزالایمان دہلی، ماہنامہ جام نور دہلی اور ماہنامہ ماہ نور دہلی۔

دوسری طرف اگر ہم دیکھیں تو چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر اہلحدیث رسالے انتہائی غیر موثر اور غیر پرکشش ہیں۔ان میں بھی موسمی مضامین چھپتے ہیں اور انہیں قابل مطالعہ بنانے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی جاتی۔ان میں بھی سیاسی مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن وہ بھی پرانے اور گھسے پٹے ڈھرے پر ہی لکھے جاتے ہیں۔ گہرائی میں جا کر تجزیہ کرنے یا دقت نظر سے کام لینے سے بچتے بچاتے رسالے کا پیٹ بھر دیا جاتا ہے۔مدیر الاحسان کے نزدیک معیار، مقصدیت، زبان و بیان اور انداز پیشکش کے حوالے سے سب سے غیر موثر اہلحدیث رسالے ہیں۔وہ ان کو بہتر بنانے کے لئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ''باصلاحیت اور قابل قلمکاروں اور صحافیوں کی خدمات حاصل کی جانی چاہئیں اور انہیں معاوضہ بھی دیا جانا چاہئے۔اہلحدیث قلمکاروں کی ان کے یہاں کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔سب سے زیادہ بے کسی و بے چارگی کا سامنا انہی کو کرنا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان پرچوں کے خریدار بہت کم ہیں اور یہ پرچے جو تھوڑے بہت چھپتے ہیں وہ اعزازی پوسٹ کئے جاتے ہیں۔'' لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض پرچوں کی سرکولیشن قدرے بہتر ہے اور ان کے معیار و مواد کو بھی بہت پھسپھسا نہیں کہا جا سکتا۔مثال کے طور پر ماہنامہ نوائے اسلام کو پیش کیا جا سکتا ہے جو بیس برسوں سے مستقل اور بلا ناغہ نکل رہا ہے۔یہ شائد اہلحدیث رسالوں میں واحد ایسا رسالہ ہے جو پورے ملک میں جاتا ہے اور تمام اہلحدیث حلقوں میں پڑھا جاتا ہے۔حالانکہ اس کا مزاج بھی عوامی ہے اور اس میں علمی و تحقیقی مضامین بہت کم

ہوتے ہیں۔اس نے اپنا مزاج اس طرح کا بنایا ہے کہ مسلکی شناخت کے ساتھ ساتھ عوامی لب ولہجہ اور عوامی پسند و ناپسند کا بھی خیال رکھتا ہے اور بہت ہی سلیقے، اعتدال اور غیر متشددانہ انداز میں اسلامی امور کی وضاحت کرتا ہے۔مسائل کی تشریح میں بھی جارحیت نہیں ہوتی اور اس کا انداز دوسرے مسلک کے لوگوں کو بھی نہیں کھلتا۔مولانا عبدالمعید اس رسالے کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے ذمے داروں نے انتہائی محنت ومشقت کے ساتھ اپنے رسالے کو پورے ملک میں پہنچایا ہے۔یہ ایک کثیر الاشاعت ماہنامہ ہے اور علمی حلقے میں بھی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے بیشتر پرچوں میں مسلکی شدت ہوتی ہے اور وہ مناظرانہ ماحول بنانے میں معاونت کرتے ہیں۔غازی پور سے شائع ہونے والا دو ماہی زم زم تو مسلکِ اہلحدیث پر جارحانہ حملوں کے لئے ہی وقف ہے۔اسی طرح دوسرے مسالک کے پرچے بھی اپنے مضامین میں مسلکی جارحیت کی بو رکھتے ہیں۔دہلی میں مقیم ایک آزاد صحافی اور دستاویزی فلم ساز ارشد امان اللہ، جنھوں نے مدرسہ جرنلزم پر ایک تحقیقی کام کیا ہے، کہتے ہیں ''ان پرچوں کا بنیادی مقصد اپنے مسلک کا دفاع اور دوسرے مسالک کی تردید ہوتی ہے۔طرز نگارش اور اسلوب استدلال گرچہ جذباتیت و جارحیت سے مملو ہوتا ہے تاہم اسلام کے بنیادی مآخذ کے حوالوں کی کثرت بھی ان پرچوں کے مشمولات کا ایک امتیازی وصف ہے۔علاوہ ازیں ہر مسلک کے ماہناموں کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں۔اہل حدیث رسالوں میں سعودی علما کی تحریروں کے تراجم اور عوامی اسلام کے مظاہر کی تردید میں خوب مضامین شائع ہوتے ہیں۔حدیث فہمی کے اپنے مخصوص ذوق کی کسوٹی پر ہر ذرے کو پرکھنے کی کوشش بھی ان پرچوں میں کارفرما نظر آتی ہے۔دیوبندی رسائل میں زیادہ زور اسلام کی فقہی سمجھ اور تقلید کی اہمیت پر ہوتا ہے۔عہد وسطی میں مدون احکام واصول کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے میں مناہج کا الجھاؤ بھی ان پرچوں سے بخوبی نمایاں ہے۔'' لیکن مولانا یاسین اختر مصباحی کہتے ہیں کہ اب دینی رسائل میں وہ مسلکی شدت نہیں رہ گئی جو پہلے ہوتی

تھی۔ان کے خیال میں چھ دسمبر 1992 کے بعد سے مسلمانوں کی سوچ میں تبدیلی آئی ہے اوران میں مسلکی جارحیت کم ہوئی ہے اس کا اثر دینی رسالوں میں بھی نظر آتا ہے۔

دیوبندی رسائل میں اسلامی احکام ومسائل کی تشریح حنفی مسلک کے نقطہ نظر سے کی جاتی ہے اورا کابرین کے ملفوظات بھی تواتر کے ساتھ شائع کئے جاتے ہیں۔سوانحی خاکے بھی شائع ہوتے ہیں اور مسالک اغیار کے اعتراضات کے جواب بھی خوب دئے جاتے ہیں۔ان میں عصری مسائل کو بھی اٹھایا جاتا ہے تاہم ان کا انداز بھی دوسرے پرچوں کی مانند ہوتا ہے۔اس وقت دیوبندی پرچوں میں ماہنامہ دارالعلوم سب سے قدیم رسالہ ہے۔

کچھ پرچوں میں تصوف کے ساتھ ساتھ خانقاہی نظام، ان کے شب و روز اور ان کی سرگرمیوں پر زیادہ روشنی ڈالی جاتی ہے۔اولیاءاللہ کی کرامات کومبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔عوامی اسلام سے متعلق تقریبات کی تفصیلات اہتمام کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ ماہنامہ منادی دہلی صوفیا کرام کی تفصیلات پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ضیائے وجیہ رامپور خانقاہی رسالہ ہے تاہم وہ عصری معاملات پر بھی مضامین شائع کرتا ہے اور سیاسی مواقع پر سیاسی تجزیئے بھی کرتا ہے۔اسی طرح دیوبند سے نکلنے والا طلسماتی دنیا تعویض گنڈوں کے لئے وقف ہے۔دہلی سے شائع ہونے والا ماہنامہ ہدی بھی زیادہ سے زیادہ اولیاءاللہ کی کرامات اور ملفوظات شائع کرکے اپنے وجود کو بکھرنے سے بچائے ہوئے ہے۔کچھ رسالے، جو کہ دواخانوں سے نکلتے ہیں پوشیدہ امراض اوران کے علاج پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

میڈیا کی اہمیت

آج کے دور میں میڈیا کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔لیکن اس اردو میڈیا کی صحت اور مزاج و معیار میں بہتری کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ یہاں تک کہ مدارس کے بہت سے ذمے داران اور رسالوں کے مدیر حضرات یہ تک نہیں جانتے کہ دوسرے پرچوں میں کیا شائع ہورہا ہے۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایسے چیف ایڈیٹروں کی بھی کمی نہیں ہے جوخود اپنے

رسالے کے مشمولات سے بے خبر اور ناواقف ہوتے ہیں۔ جب کوئی قاری ان کی توجہ کسی خاص مضمون کی جانب مبذول کراتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ابھی میں نے رسالہ دیکھا نہیں ہے، ہمارے مدیر کو معلوم ہوگا، میں دیکھنے کے بعد کچھ کہہ سکوں گا۔ جب بے خبری کا یہ عالم ہو تو ان سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسرے رسالوں اور دوسرے مسلک کے جریدوں اور دنیائے صحافت میں رونما ہونے والی انقلاب آفریں تبدیلیوں سے باخبر ہوں گے اور ان کی روشنی میں اپنے پرچے میں تبدیلی لانے اور اسے زمانے سے ہم آہنگ کرنے یا زمانے سے ٹکر لینے کے قابل بنانے کی کوشش کریں گے۔ البتہ کچھ ایسے بیدار ذہن ایڈیٹر ضرور ہیں جو دوسرے پرچوں پر نظر رکھتے ہیں اور ان کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت بڑا دائرہ کار رکھنے والے اس میڈیا کی نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی اس پر کسی کی نظر جاتی ہے اور نہ ہی کوئی اسے لائق اعتنا سمجھتا ہے۔ جب اس کے ارباب بست و کشاد ہی اس کو کسی قابل نہیں سمجھتے یا کسی قابل بنانے کی کوشش نہیں کرتے تو دوسرے اسے لائق توجہ کیوں سمجھیں گے۔

بہر حال اب کچھ کچھ بیداری آ رہی ہے۔ بعض مدارس میں تبدیلی کی ہوا چلنے لگی ہے اور ان کے پرچوں میں قومی میڈیا پر بھی بحث ہونے لگی ہے۔ ایسے رسالوں میں ماہنامہ محدث بنارس، نوائے اسلام دہلی اور ہند نیپال سرحد پر واقع جھنڈا نگر سے شائع ہونے والے ماہنامہ نور توحید قابل ذکر ہیں۔ نور توحید میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر شمارے میں کوئی ایسا مضمون ضرور دیا جائے جو آج کے قومی و بین الاقوامی میڈیا کے مزاج اور ان کے زاویہ نظر کو سمجھنے میں معاون ہو۔ اب بعض مدرسوں کے نصاب میں میڈیا کو بھی شامل کر دیا گیا ہے اور میڈیا کے ذہن و دماغ کو سمجھنے کے لئے میڈیا اداروں سے وابستہ افراد کے لیکچرس کا بھی اہتمام ہونے لگا ہے۔ حالانکہ یہ ابھی بہت ہی محدود سطح پر ہے لیکن ایک روایت شروع ہو گئی ہے اور امید کی جانی چاہئے کہ یہ روایت توانا ہوگی اور تمام مدارس اس سلسلے میں پیش قدمی کریں گے۔

قارئین کی رائے

ایک طرف جہاں ان رسائل کے مواد اور معیار سے بے اطمینانی کا اظہار کرنے والوں کی بڑی تعداد ہے وہیں ایسے لوگ بھی کم نہیں ہیں جو ان رسائل کو بے حد پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں بہت سے قارئین سے بھی گفتگو کی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ نہ صرف یہ کہ ان رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ انھیں ان کا انتظار بھی رہتا ہے۔ ہمیں ایسے بھی کئی قاری ملے جو ان پرچوں کے خریدار ہیں اور سال بہ سال چندہ دے کر اپنی خریداری کی تجدید کراتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمیں ان رسائل کے مطالعہ سے دو طرح کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ایک مذہبی اور دوسری سیاسی۔ اگر چہ ان پرچوں کا مزاج دینی ہے اور ان میں اسلامی امور اور مسائل پر مضامین ہوتے ہیں تاہم ایسے رسالوں کی بھی تعداد کافی ہے جو مذہبی کے ساتھ ساتھ سیاسی مضامین بھی شائع کرتے ہیں۔ ان قارئین کے خیال میں وہ اسلامی مسائل سے بھی واقف ہوتے ہیں اور سیاسی سرگرمیوں سے بھی باخبر ہوتے ہیں۔ دہلی و بیرون دہلی کے ایسے کئی قارئین ہمیں ملے جنھوں نے اس بات سے اختلاف کیا کہ ان رسالوں میں سب کچھ غیر معیاری ہی ہوتا ہے۔ ان کے مطابق بہت سے رسالے ایسے ہیں جو انتہائی معیاری مضامین شائع کرتے ہیں اور ان سے علمی حضرات بھی استفادہ کرتے ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ معارف اور ان جیسے دوسرے پرچوں کو کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بعض پرانے قارئین نے دیوبند سے مولانا عامر عثمانی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ تجلی کا حوالہ دیا اور کہا کہ لوگوں کو اس پرچے کا شدت سے انتظار رہا کرتا تھا اور جب وہ انھیں مل جاتا تھا تو کم از کم وہ مسجد سے میخانے تک اور دو ایک اور مسلسل کالموں کا جب تک مطالعہ نہیں کر لیتے تھے تب تک رسالہ ہاتھ سے رکھتے نہیں تھے۔ کچھ لوگوں نے زندگی نو اور بحث ونظر کے ساتھ ساتھ الرسالہ کا بھی حوالہ دیا اور کہا کہ ان رسائل کا شدت سے انتظار کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ الگ الگ حلقہ قارئین کے لوگوں نے

البلاغ، الفیصل، طوبیٰ، احتساب، نوائے اسلام، جریدہ ترجمان، جام نور اور ان جیسے دوسرے پرچوں کے نام لئے اور کہا کہ ان میں مسائل کے بارے میں جانکاری تو ملتی ہی ہے سیاسی تبدیلیوں اور سرگرمیوں سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ ان رسالوں میں کچھ نہیں ہوتا بے بنیاد بات ہے۔ اگر ایسا ہوتا اور ان کے پڑھنے والے نہیں ہوتے تو یہ پرچے نکلتے کیسے اور مسلسل دس دس بیس بیس سال سے کیسے نکلتے۔ ان کے مطابق جو لوگ مواد اور معیار کے نام پر ان کی مخالفت کرتے ہیں وہ انصاف سے کام نہیں لیتے۔ ایک قاری نے کہا کہ ہر رسالے کا الگ مزاج اور الگ حلقہ قارئین ہوتا ہے اور اس حلقے میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر یہ رسالے اسلامی معلومات کی چیزیں نہ چھاپیں اور عربی مہینوں کے اعتبار سے ان کی اہمیت وفضیلت پر مضامین شامل نہ کریں تو ان سے کیسے واقفیت ہو سکتی ہے۔ ہر شخص کے پاس نہ تو مذہبی کتابیں ہوتی ہیں اور نہ ہی ہر شخص ان کو خرید سکتا ہے۔ رسائل سے معلومات کی حصولیابی آسان بھی ہے اور سستی بھی ہے۔ ان میں تاریخ اسلام کے درخشاں ابواب بھی نظر آتے ہیں اور اسلام کے خلاف تاریخی سازشوں سے بھی پردا اٹھایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ان رسالوں کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات سے بھی یہ پرچے روبرو کراتے ہیں اور عالم اسلام کے خلاف سازشوں کا بھی پردہ فاش کرتے ہیں۔ اگر یہ پرچے نہ ہوں تو ہم بہت سی معلومات سے بے خبر رہ جائیں۔

دینی رسائل اور اردو

یہ بات اب یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو کے پروفیسر حضرات بھی کہنے لگے ہیں کہ اردو زبان کے تحفظ اور بقا میں دینی مدارس کا بہت بڑا بلکہ سب سے بڑا رول ہے اور اگر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ بند ہو جائے تب بھی اردو کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ملک کے دینی مدارس اردو زبان کے قلعے ہیں اور جب تک یہ قلعے باقی ہیں یہ زبان بھی باقی رہے گی۔ دینی مدارس اگر اردو کے قلعے ہیں تو بلا شبہ ان مدارس سے نکلنے

والے رسائل و جرائد اردو کے سپاہی اور فوجی ہیں۔ اگر چہ یہ زبان اب سکڑتی جا رہی ہے اور اس کے پڑھنے والوں کا عوامی حلقہ محدود ہوتا جا رہا ہے، تاہم دینی مدارس سے فارغ ہونے والوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اردو کو نہ صرف زندہ رکھے ہوئے ہے بلکہ اس کی بقا کا ضامن بھی ہے۔ ان فارغین کی معتد بہ تعداد کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی داخلہ لے رہی ہے اور ان کا ایک حصہ بعد میں انہی اداروں میں اردو کی تدریس سے وابستہ بھی ہو رہا ہے۔ آج ان اداروں میں جو اساتذہ ہیں ان میں مدارس کے فارغین کی خاصی تعداد ہے۔ ادھر دینی مدارس سے نکلنے والے رسائل بھی زمینی سطح پر اردو کو تقویت فراہم کر رہے ہیں۔ چونکہ ان کے قارئین کا بڑا طبقہ زمینی سطح سے جڑا ہوتا ہے اور عوامی حلقے ہی ان کے حلقہ قارئین ہوتے ہیں لہذا یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ یہ رسالے بھی اردو زبان کے تحفظ، اس کی بقا اور اس کے فروغ میں ناقابل تردید رول ادا کر رہے ہیں اور اس رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افسوسناک سرکولیشن

یوں تو تقریباً تمام بڑے مدرسے اپنے رسالے نکالتے ہیں لیکن ان کی تعداد اشاعت افسوسناک حد تک کم ہے۔ مدارس و ذمہ داران مدارس کے شب و روز، ان کے طریقہ کار، ان کی ضرورتوں اور ان کے رسالوں کی اشاعت پر گہری نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ذمے داروں کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ ان کے پرچوں کی سرکولیشن کیسے بڑھے۔ جتنی تعداد میں رسالے شائع ہوتے ہیں ان سے ہی ان کا کام چل جاتا ہے۔ اسی لئے وہ اس کو بہتر بنانے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ ان پرچوں کا اسٹاف بھی الگ نہیں ہوتا۔ درس و تدریس یا انتظامیہ سے منسلک اساتذہ اور اسٹاف میں سے ہی بعض کو ان کی ادارت کی ذمے داری سونپ دی جاتی ہے جو ان کے لئے ایک اضافی بوجھ ہوتا ہے۔ اسی لئے مدیر حضرات کو بھی پرچے کو معیاری بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر اشاعت کچھ دنوں کے لئے

موقوف ہو جائے تو انہیں خوشی ہوتی ہے کہ چلو ایک اضافی بوجھ سے نجات تو ملی۔ ذمہ داران مدارس رسالوں کے خریدار بنانے میں بھی کوئی زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ بیشتر کاپیاں اعزازی طور پر ارسال کی جاتی ہیں۔ اور یہ انہی لوگوں کو بھیجی جاتی ہیں جو مدرسے کو مالی تعاون دیتے ہوں۔ یا کچھ نسخے دوسرے مسلک کے اداروں کو بھی بھیج دئے جاتے ہیں۔ ہاں جب ان کا سفیر چندے کے لئے دورہ کرتا ہے تو اسے رسالے کی رسید بھی تھما دی جاتی ہے اور وہ محسنین کے نام سے مدرسے کی رسید کاٹنے کے ساتھ ساتھ ان کو پرچے کا خریدار بھی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ دینی اداروں سے شائع ہونے والے رسالے ہوں یا کسی مسلم مذہبی، سماجی یا سیاسی تنظیم سے نکلنے والے جریدے، ان میں نظما اور عہدے داروں کے دوروں کی تفصیلات اور ان کی تقاریر کے اقتباسات نمایاں انداز میں شائع کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ حضرت نے کہیں کچھ فرمایا ہے تو اسے حضرت کے ملفوظات یا تقریر کی شکل میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ مدیر کے اندر نہ تو اتنی جرات ہوتی ہے اور نہ ہی اتنے اختیارات کہ وہ ان میں کتر بیونت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پرچوں کی سرکولیشن بہت کم ہوتی ہے۔ ارشد امان اللہ کے مطابق ''مدارس کے ان ماہناموں کی سرکولیشن پر ایک نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی تعداد اشاعت چند ہزار سے آگے نہیں بڑھ پاتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا آرگن ماہنامہ دارالعلوم ۱۹۴۱ء سے مسلسل اشاعت پذیر ہے لیکن اس کی سرکولیشن صرف ۲۶۱۰ کاپیوں تک محدود ہے۔ اسی طرح ۱۹۷۶ سے مسلسل چھپنے والا ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور جہاں صرف ۴۰۰۰ کی تعداد میں چھپتا ہے، ۱۹۸۲ سے شائع ہو رہے محدث، وارانسی کی کھپت محض ۲۰۰۰ کاپیاں ہیں۔ یہ ان ماہناموں کا حال ہے جو اپنے اپنے مسالک کے کعبہ ہائے علم سے شائع ہوتے ہیں۔ اسی طرح بریلی سے چھپنے والے اعلی حضرت کی تعداد اشاعت ۳۵۰۰ ہے۔ اس سے اتنا تو صاف ہے کہ یہ پرچے عوام میں بالکل بھی مقبول نہیں ہیں۔ ان ماہناموں کی حالت زار کے لئے عوام میں ان کے تئیں بڑھتی ہوئی بے رغبتی اور نوجوانوں کی اردو زبان سے ناواقفیت کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن جام نور

کے ایڈیٹر خوشتر نورانی جن کے رسالے کی سرکولیشن صرف چند برسوں میں آٹھ ہزار تک پہنچ چکی ہے، کی رائے اس سلسلے میں ذرا مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ رسالے عموماً نماز وروزے اور کرامات و بشارات کے تذکرے سے پر ہوتے ہیں اور ان کے ایڈیٹر" پبلک کو وہ چیز نہیں دے رہے ہیں جس کی ان کو ضرورت ہے......"

ارشد امان اللہ نے اپنی تحقیق میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کے مطابق سرکولیشن کا دارومدار درحقیقت میگزین کے مواد، انداز پیشکش، مارکیٹنگ کی تکنیک اور قارئین کے فیڈ بیک کے مطابق میگزین میں ممکن اصلاح و تبدیلی کرتے رہنے پر منحصر ہے۔ چوں کہ مدارس کے پرچے مشنری جذبے کے تحت نکالے جاتے ہیں، اس لئے ان کے مدیر عوام کی پسند اور ضرورت کے تابع نہیں ہونا چاہتے۔ کچھ ایڈیٹر میگزین کے مقصد اور عوام کی ضرورت کے مابین توازن رکھنا چاہتے ہیں لیکن ان کی شکایت ہے کہ انہیں معیاری مضامین نہیں مل پاتے۔ نیز ماہرین سے فرمائشی مضامین لکھوانے کے لئے ان کے پاس فنڈ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اپنی شرمناک سرکولیشن کے سبب رسالہ ہمیشہ خسارہ میں رہتا ہے۔ اس کی ذمہ داری کارگر مارکیٹنگ پالیسی کے فقدان اور ذمے داروں کی لاپروائی پر عائد ہوتی ہے۔ دوسرے مد کے عوامی پیسے سے میگزین کے نقصان کو پورا کیا جاتا ہے اور پرچہ اپنے پرانے ڈھرے پر نکلتا رہتا ہے۔

تجاویز وسفارشات

وہ اس سلسلے میں بعض تجاویز کی سفارش کرتے ہیں۔ ہم ان کے شکریے کے ساتھ ان تجاویز کو یہاں پیش کر رہے ہیں:

ان پرچوں کے بالاستیعاب مطالعہ، ان کے ایڈیٹروں سے انٹرویو، ان کے دفاتر کے دورے اور خریداروں سے بات چیت کی روشنی میں یہاں، میں کچھ ایسی باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جن پر عمل ان پرچوں کی عوامی اپیل میں اضافہ کا باعث ہوسکتا ہے۔

۱۔ فوکس اور اختصاص

مدارس سے نکلنے والے تقریباً تمام میگزین مواد کے اعتبار سے ایک دوسرے کے کلون ہوتے ہیں۔ آج اختصاصی رسالوں کی اشد ضرورت ہے۔ مثلاً فرقہ پرستی کے مطالعہ کے لئے وقف ایک میگزین کی بے حد پذیرائی ہوگی۔

۲۔ منظّم کالم سازی اور اس پر مداومت

ان پرچوں کے ایڈیٹر روایتی کالمز کے علاوہ چار پانچ طویل مضامین چھاپ کر کام چلا لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ان کے ایڈیٹروں میں کالم سازی کے سلیقہ کا فقدان ہے۔ منظّم کالم سازی کے ذریعہ، کم صفحات میں متنوع مواد پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے قلم کاروں کو بھی اختصار کے ساتھ الفاظ کی مقررہ تعداد میں اظہار رائے کا پابند کرنا ہوگا۔ ایک بار طے شدہ کالموں پر مداومت برتنے سے پرچہ کی پہچان بننے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح رسالہ مختلف عمر اور بیک گراؤنڈ کے افراد کے لئے پرکشش بن جاتا ہے۔ ایڈیٹر کو اپنی صوابدید کے مطابق یا قارئین کی درخواست پر کسی کالم کو ختم یا نئے کالم کا اضافہ کرتے رہنا چاہئے۔ اس سلسلے میں خوشتر نورانی اپنے پرچہ جام نور اور ظل الرحمٰن تیمی نے طوبی میں قابل ستائش تجربے کئے ہیں۔

۳۔ قارئین کی توقعات کو پورا کرنا

ریڈرشپ کو بڑھانے کے لئے قارئین کو ان کی دلچسپی اور ضرورت کی معلومات فراہم کرنی ہوگی۔ مثلاً مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی، سماجی اور اقتصادی حالت پر اعداد وشمار پر مبنی مضامین وغیرہ۔

۴۔ یونیورسٹی میں زیر تعلیم علماء اور مین اسٹریم میڈیا کے قلم کاروں سے روابط

حالات حاضرہ پر علماء کی گرفت کمزور ہوتی ہے اور وہ جدید علوم کے نئے طریقۂ تحقیق سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ لہذا یونیورسٹی میں زیر تعلیم علما کے قلمی تعاون سے اس خلا کو پر کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ مین اسٹریم میڈیا کے کالم نویسوں کو لکھنے کی دعوت دی جا سکتی ہے۔

۵۔ میڈیا لائبریری کا قیام

تقریباً ہر مدرسہ میگزین کی ایک میڈیا لائبریری ہونی چاہئے جو کالم نویسوں کے لئے انفارمیشن بینک کا کام دے۔ مناسب افراد کی بحالی کر کے اسے میڈیا واچ سیل کی شکل بھی دی جا سکتی ہے۔ ہندی اور انگریزی میڈیا میں زیر بحث مسائل سے اپنے قارئین کو باخبر رکھنے کے لئے ہر ماہ ایک دو اچھے مضامین کے ترجمے بھی میگزین کی افادیت میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے ہیں۔ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم کے ایڈیٹر وارث مظہری کی جانب سے اس طرح کی کوشش گاہے بہ گاہے دیکھنے میں آتی رہتی ہے۔

٦۔ ایڈیٹرس ایسوسی ایشن کا قیام

ان پرچوں کے ایڈیٹروں کی ایک تنظیم ہونی چاہئے جو ان کے مسائل کو سرکار تک پہنچا سکے۔ دو برس بعد بھی ماہ نور، دہلی کو آر این آئی نمبر نہیں ملا ہے۔ اس کے بغیر سرکولیشن میں اضافے کی کوشش، مزید خسارہ کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ دارالسلام، مالیر کوٹلہ کے آر این آئی نمبر کی تجدید کے دوران ایک بار افسروں نے مطالبہ کیا کہ پورے میگزین کا ہندی یا انگریزی ترجمہ فراہم کیا جائے کیوں کہ متعلقہ دفتر میں کوئی اردو داں نہیں تھا۔ یہ اور اس طرح کے دیگر مسائل کے حل میں مدیران کی تنظیم کافی معاون ثابت ہوگی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ایڈیٹر حضرات مدرسہ جرنلزم کے میدان میں ہونے والے نئے تجربات سے بھی

واقف رہیں گے۔ اپنے فیلڈ ورک کے دوران مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ یہ لوگ دوسرے مسالک کے رسائل اور نئے تجربات سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں۔

۷۔ طلبائے مدارس کو مین اسٹریم میڈیا کے صحافیوں سے استفادہ کا موقع فراہم کرنا

حالیہ دنوں میں چند مدارس مثلاً جامعہ سلفیہ، وارانسی نے اپنے نصاب میں جرنلزم کو بطور مضمون داخل کیا ہے۔ اگر مدارس کے ذمہ داران مین اسٹریم میڈیا اور دیگر مشنری میڈیا کے صحافیوں کو وقتاً فوقتاً گیسٹ لیکچرار کے طور پر بلایا کریں تو اس سے طلبا کو کافی کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ اسی طرح منتخب طلباء کے لئے مین اسٹریم اخبارات میں ''انٹرن شپ'' کا انتظام کرنا بھی مستقبل میں مدرسہ جرنلزم کے معیار کو بہتر بنانے میں نمایاں کردار ادا کرسکتا ہے۔

۸۔ انٹرنیٹ: معلومات کا ایک نیا ذخیرہ

صبائے حرم، دہلی کے مدیر مفتی اعجاز ارشد قاسمی اپنے ماہنامہ کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال بخوبی کررہے ہیں۔ پاکستانی ویب سائٹوں کے شکریہ کے ساتھ خواتین کے مسائل پر خواتین قلم کاروں کے مضامین چھاپ کر انھوں نے مدرسہ ایڈیٹرس کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔

۹۔ ایک مؤثر مارکیٹنگ حکمت عملی کی ضرورت

عموماً ان پرچوں کو نئے خریدار دو مواقع پر حاصل ہوتے ہیں: رمضان کے موقع پر، جب مدارس کے سفرا چندہ کرنے کے ساتھ ساتھ میگزین کے لئے نئے خریدار بھی بناتے ہیں؛ اور کوئی جلسہ یا عرس کے موقع پر، جہاں میگزین کے اسٹال پر آ کر خواہش مند حضرات خریدار بنتے ہیں۔ اگر ایک شخص پورے ملک کا دورہ کر کے سال بھر یہ کام کرے تو اس سے میگزین کی سرکولیشن میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح دلکش اسکیموں اور ان کی مؤثر تشہیر کے ذریعہ بھی تعداد اشاعت بڑھائی جاسکتی ہے۔ اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے خوشتر نورانی نے

بتایا کہ ایک اسکیم کے ذریعہ اعلی حضرتؒ کے عرس کے موقع پر انھوں نے سیکڑوں نئے خریدار بنائے۔انھوں نے اس اسکیم کا اشتہار دو تین ماہ پہلے سے جام نور میں دینا شروع کر دیا تھا۔ ترجمان دارالعلوم، نئی دہلی کے منیجر نوشاد احمد قاسمی نے اپنے میگزین کو نیوز اسٹینڈ پر دستیاب کرانے کی کوشش کی تھی، جو بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئی، لیکن بعد میں افراد کی کمی اور ذمہ داران کی عدم دلچسپی کے سبب ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

اشتہار کے لئے کوشش کر کے بھی رسالہ کی آمدنی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح ایک موثر مارکیٹنگ پالیسی اور اسٹاف میں اضافہ کے ذریعہ مدارس کے ان رسالوں کی تعداد اشاعت بڑھائی جا سکتی ہے۔اس سے براہ راست پرچہ کی آمدنی میں اچھال آئے گا اور پرچہ کے معیار کو بہتر بنانے میں یقینی طور پر بہت مدد ملے گی۔

(ارشد امان اللہ سے arshad.mcrc@gmail.com پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔)

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی مدارس اور مسلم تنظیموں اور ملی اداروں سے شائع ہونے والے ان رسائل و جرائد کی اپنی ایک تاریخ اور اہمیت ہے اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔تاہم موجودہ حالات میں یہ رسالے اپنی معنویت کھوتے جا رہے ہیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے بیشتر مالکوں اور مدیروں کے فرسودہ نظریات و خیالات عصر حاضر کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتے اور ان میں اب بھی مسلکی شدت اور مناظرانہ مزاج کی حکمرانی ہے۔ حالانکہ کچھ ایسے مدیر ہیں جو اپنے رسالے کو مسلکی چشمک سے پاک رکھنے اور ہمعصر تقاضوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔اگر اردو کے ان رسائل و جرائد کو اردو عوام میں مقبولیت حاصل کرنی ہے تو انھیں اپنے مزاج میں بنیادی تبدیلی لانی ہوگی اور مالکوں اور مدیروں کو مسلکی گروہ بندیوں اور اختلاف عقائد کے تنگ دائرے سے نکلنا ہوگا۔زمانے کے تقاضے کے مطابق معیار و مضامین اور انداز بیان میں تبدیلی لانی ہوگی۔اگر فرسودہ خیالات پر جدید رجحانات کو ترجیح دی گئی اور نظریات و خیالات میں توسع پیدا کی گئی تو یہ رسائل ایک بار پھر

اپنی گم گشتہ اہمیت و معنویت حاصل کریں گے ورنہ تغیر پذیر زمانے اور منہدم ہوتے نظریات کے ملبے میں دب کر اپنا وجود کھو بیٹھیں گے۔

دینی مدارس، مسلم تنظیموں اور ملی اداروں سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد

ملک کی مختلف ریاستوں سے شائع ہونے والے دینی رسائل و جرائد کی ایک فہرست ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں کوشش کی تھی کہ ہم ان اداروں کے نام بھی دے دیں جہاں سے یہ رسالے شائع ہو رہے ہیں لیکن سبھی پرچے اس کا اہتمام نہیں کرتے کہ وہ اپنے ادارے کا نام لکھیں۔ بہت کم رسائل پر ان کے نام نظر آئے ورنہ بیشتر نے صرف اپنے مقام اشاعت کے پتے ہی درج کئے ہیں۔ ہماری دوسری کوشش یہ تھی کہ ہم ان رسائل کا سنہ آغاز بھی دے دیں لیکن متعدد رسالوں میں جلد نمبر کی اشاعت نہ ہونے کے سبب ہم یہ بھی نہیں کر سکے۔ بہر حال ہم نے بہت بھاگ دوڑ کر کے یہ فہرست مرتب کی ہے تاہم ہمارا خیال ہے کہ یہ مکمل نہیں ہے۔ ہم نے صرف ان رسائل کی فہرست سازی کی ہے جو موجودہ وقت میں نکل رہے ہیں اور صرف دینی مزاج رکھتے ہیں۔ ہم نے سیاسی رسائل کو اس میں شامل نہیں کیا ہے۔ ہمیں جوں جوں مزید دینی رسائل کے بارے میں پتا چلے گا ہم اس میں اضافہ کرتے جائیں گے۔

دہلی

١۔ پندرہ روزہ جریدہ ترجمان
٢۔ ماہنامہ نوائے اسلام
٣۔ ماہنامہ الاسلام
٤۔ ماہنامہ الاحسان
٥۔ ماہنامہ طوبی
٦۔ ماہنامہ نداء الصفا
٧۔ ماہنامہ التبیان
٨۔ ماہنامہ اشاعت السنہ
٩۔ ماہنامہ الرحیق
١٠۔ سہ روزہ دعوت

۱۱۔ ماہنامہ زندگی نو
۱۲۔ سہ ماہی بحث ونظر
۱۳۔ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم
۱۴۔ ماہنامہ جام نور
۱۵۔ ماہنامہ ماہ نور
۱۶۔ ماہنامہ الرسالہ
۱۷۔ ماہنامہ اللہ کی پکار
۱۸۔ ماہنامہ رفیق منزل
۱۹۔ ماہنامہ آستانہ
۲۰۔ ماہنامہ دین دنیا
۲۱۔ ماہنامہ کنزل الایمان
۲۲۔ سہ ماہی خبر نامہ مسلم پرسنل لا بورڈ
۲۳۔ ماہنامہ ذکری
۲۴۔ ماہنامہ کوثر
۲۵۔ ماہنامہ نعرۂ تکبیر
۲۶۔ ماہنامہ دعوت وعزیمت
۲۷۔ ماہنامہ کردار جمعیت
۲۸۔ ماہنامہ ہدی
۲۹۔ ماہنامہ منادی

اتر پردیش

۱۔ پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنو
۲۔ ماہنامہ رضوان لکھنو
۳۔ پندرہ روزہ اسلاف لکھنو
۴۔ ماہنامہ البدر کاکوری لکھنو
۵۔ ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ
۶۔ ماہنامہ محدث بنارس
۷۔ سہ ماہی ترجمان اسلام بنارس
۸۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ
۹۔ ماہنامہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ
۱۰۔ ماہنامہ آثار مئو
۱۱۔ سہ ماہی المآثر مئو
۱۲۔ ماہنامہ تذکیر غازی پور
۱۳۔ دوماہی زم زم غازی پور
۱۴۔ ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور
۱۵۔ ماہنامہ اعلی حضرت بریلی
۱۶۔ ماہنامہ سنی دنیا بریلی
۱۷۔ ماہنامہ ترجمان دیوبند
۱۸۔ ماہنامہ محدث عصر دیوبند
۱۹۔ ماہنامہ طلسماتی دنیا دیوبند
۲۰۔ ماہنامہ الانور دیوبند

۲۱۔ ماہنامہ المظاہر سہارنپور
۲۲۔ ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور
۲۳۔ ماہنامہ نقوش اسلام، مظفر آباد سہارنپور
۲۴۔ ماہنامہ حرا کا پیغام مانک مؤ سہارنپور
۲۵۔ سہ ماہی احوال و آثار کاندھلہ
۲۶۔ سہ ماہی مشیر عصر سرکڑہ بجنور
۲۷۔ ماہنامہ تفہیمات بجنور
۲۸۔ ماہنامہ ریاض الجنہ جونپور
۲۹۔ ماہنامہ ضیائے وجیہ رامپور
۳۰۔ ماہنامہ الحسنات رامپور
۳۱۔ یادگار اسلاف اجراڑہ
۳۲۔ سہ ماہی احتساب دریاباد بستی
۳۳۔ سہ ماہی الفرقان ڈومریا گنج سدھارتھ نگر
۳۴۔ ماہنامہ پیام عرفات رائے بریلی
۳۵۔ سہ ماہی ترجمان السنہ رچھا بریلی
۳۶۔ تحقیقات اسلامی علیگڑھ
۳۷۔ سہ ماہی علم و ادب علیگڑھ
۳۸۔ ماہنامہ اعتدال علیگڑھ
۳۹۔ ماہنامہ آیات علیگڑھ
۴۰۔ پندرہ روزہ راہ بقا مرادآباد
۴۱۔ ماہنامہ نور الاسلام بہرائچ
۴۲۔ ماہنامہ تحفہ خواتین مرادآباد
۴۳۔ ماہنامہ ندائے شاہی مرادآباد
۴۴۔ ندائے ہادی کانپور
۴۵۔ المحمود میرٹھ
۴۶۔ ماہنامہ احیائے اسلام مہاراج گنج گورکھپور
۴۷۔ ماہنامہ اذان بلال آگرہ
۴۸۔ پندرہ روزہ آئینہ دارالعلوم دیوبند
۴۹۔ دوماہی فکر اسلامی بستی
۵۰۔ ماہنامہ حق کی پکار
۵۱۔ ماہنامہ الجامعہ روناہی فیض آباد

مہاراشٹرا

۱۔ ماہنامہ البلاغ ممبئی
۲۔ ماہنامہ صوت الاسلام ممبئی
۳۔ ماہنامہ حج میگزین ممبئی
۴۔ ماہنامہ باب الاسلام ممبئی
۵۔ ماہنامہ صوت الحدیث ممبئی
۶۔ ماہنامہ المصباح ممبئی
۷۔ ہفت روزہ مسلم ٹائمز ممبئی
۸۔ پندرہ روزہ جرات مالیگاؤں

۹۔ ماہنامہ صوت الحق منصورہ مالیگاؤں

بہار

۱۔ پندرہ روزہ الہدیٰ دربھنگہ
۲۔ ماہنامہ پیام توحید کشن گنج
۳۔ سہ ماہی ندائے پاسدار پٹنہ
۴۔ سہ ماہی ندائے بصیرت مدھوبنی
۵۔ ہفت روزہ نقیب پھلواری شریف پٹنہ
۶۔ سہ ماہی جام شہود بہار شریف
۷۔ ماہنامہ رخت سفر جام تاڑہ جھارکھنڈ

آندھرا پردیش

۱۔ ماہنامہ الفیصل حیدرآباد
۲۔ ماہنامہ پیام حیدرآباد
۳۔ ماہنامہ ردائے حرم حیدرآباد
۴۔ ماہنامہ ضیائے علم حیدرآباد
۵۔ ماہنامہ اشرف الجرائد حیدرآباد
۶۔ ماہنامہ بطحا حیدرآباد
۷۔ سہ ماہی صفاء حیدرآباد
۸۔ مجلّہ السلسبیل رائے درگ حیدرآباد

دیگر ریاستوں کے جریدے

۱۔ ماہنامہ نور المصابیح کیونجھر اڑیسہ
۲۔ ماہنامہ ہدایت جے پور راجستھان
۳۔ ماہنامہ دین مبین بھوپال مدھیہ پردیش
۴۔ سہ ماہی صدائے مدینۃ العلوم کلکتہ
۵۔ سہ ماہی تبلیغ سیرت کلکتہ
۶۔ مجلّہ اہلحدیث شکراوہ، ہریانہ
۷۔ شش ماہی مجلّہ الاخبار بھٹکل کرناٹک
۸۔ ماہنامہ راہ اعتدال چنئی تمل ناڈو
۹۔ ماہنامہ الجنتہ چنئی تمل ناڈو
۱۰۔ ماہنامہ صوت القرآن احمدآباد، گجرات
۱۱۔ ماہنامہ دارالسلام مالیرکوٹلہ، پنجاب
۱۲۔ ماہنامہ فکر ونظر پونچھ، جموں وکشمیر
۱۳۔ ہفت روزہ راہ منزل جموں، جموں وکشمیر
۱۴۔ ہفت روزہ مسلم سری نگر جموں وکشمیر

۱۵۔ ماہنامہ الحیات سری نگر جموں و کشمیر
۱۶۔ ماہنامہ النور سری نگر جموں و کشمیر
۱۷۔ پندرہ روزہ توحید سری نگر جموں و کشمیر
۱۸۔ ماہنامہ المصباح پانپور جموں و کشمیر
۱۹۔ ماہنامہ نور توحید جھنڈا نگر، نیپال
۲۰۔ ماہنامہ السراج جھنڈا نگر، نیپال
۲۱۔ ترجمان ملت، نیپال
۲۲۔ سہ ماہی پیغام، نیپال

دہلی کی ہمعصر اردو صحافت

(زبان و بیان، معیار اور مضامین کے حوالے سے ایک جائزہ)

سرزمین دہلی اردو صحافت کے لئے بڑی زرخیز ہے۔ تھوڑے بہت وسائل ہوں اور عزائم کا تھوڑا بہت سرمایہ ہو تو یہاں کسی کے لئے بھی اخبار نویسی کی اپنی امنگوں کی آبیاری کرنا مشکل نہیں ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اس کی آرزوؤں کی تکمیل کی راہ آسان بنانے کے لئے موجود ہیں۔ چیف ایڈیٹر کا وزیٹنگ کارڈ چھپوانا اور پھر آر۔این۔آئی، پی آئی بی اور ڈی اے وی پی سے اپنے اخبار کو منظور کروالینا دہلی میں زیادہ مشکل نہیں ہے۔ سیاسی عزائم کے وسیع آسمانوں میں پرواز کرنے والے بھی موجود ہیں جو اس کام میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کی امنگوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر ان کے نام سے اداریے اور مضامین لکھنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ مگر بے روزگار نوجوان بھی موجود ہیں جو اپنی مجبوریوں کو نام نہاد چیف ایڈیٹروں کی میز کی درازوں میں گروی رکھ دیتے ہیں۔ اور پھر آناً فاناً میں ایک چمکتا دمکتا اخبار قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ جاتا ہے اور مدیر موصوف سرکاری محفلوں اور ضیافتوں میں شریک ہونے کا فخر حاصل کرنے والوں کی گنتی میں ایک اور مدیر باتدبیر کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ گویا اردو اخبار نکالنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ آپ کے عزائم مضبوط اور ارادے مستحکم ہوں۔ دوسروں کی رائے اور نکتہ چینی کو خاطر میں نہ لانے کا فن آتا ہو اور تھوڑا سا رسک لینے کا حوصلہ ہو۔ پھر تو آپ کا راستہ کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ

تھوڑی سی جرات رندانہ سے کام لے کر جانے کتنے ناخواندہ اور اردو سے نابلد حضرات مدیر اعلیٰ کی کرسیوں پر جلوہ افروز ہو چکے ہیں۔

بیسویں صدی کا نصف آخر ہو یا اکیسویں صدی کی پہلی دہائی، ایسے لوگوں کی کمی نہ پہلے تھی نہ آج ہے۔ لیکن انہی گندم نما جوفروشوں کی بھیڑ میں اصلی اور حقیقی صحافی بھی ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان پر لوگوں کی نظریں کم پڑتی ہیں۔ لیکن یہی معدودے چند لوگ ہی در اصل اردو صحافت کی لاج رکھتے ہیں اور اس کی آبرو کی حفاظت کرتے ہیں۔ آج دہلی سے روز نامہ اخبارات بھی نکلتے ہیں اور سہ روزہ بھی ہفت روزہ رسائل بھی اور پندرہ روزہ اور ماہنامہ جریدے بھی۔ اعداد وشمار کے مطابق اس وقت دہلی سے اردو کے کم از کم پچاس روز نامہ اخبارات شائع ہوتے ہیں اور ان میں سے کم از کم چالیس اخبارات ڈی اے وی پی سے تسلیم شدہ ہیں۔ یعنی ان کو سرکاری اشتہارات ملتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب دہلی کے اخبارات نہ صرف معیار کی کسوٹی پر کھرے اترا کرتے تھے بلکہ وہ دوسرے شہروں کے اخبارات کے لئے بھی معیار طے کرتے تھے۔ ان کو انتہائی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ دوسرے شہروں کے اخبارات یہاں کے اخباروں کی نقل کیا کرتے تھے اور یہاں کے اخباروں میں چھپ جانے والی کوئی بھی خبر مستند ہو جاتی تھی۔ ان کے حوالے بھی دئے جاتے تھے۔ لیکن پہلے اور آج کے اخبارات کے معیار میں بہت فرق واقع ہو چکا ہے۔ آج دہلی کے بعض اخباروں میں دوسرے شہروں کے اخباروں کے اداریے اور مضامین نقل کئے جاتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض اخبارات تو ہندی کے روز نامہ اخبارات کے اداریوں تک کا ترجمہ کر کے اپنے یہاں بطور اداریہ بھی چھاپ دیتے ہیں۔ آج دہلی کے مقابلے میں دوسرے شہروں سے بالخصوص حیدرآباد، ممبئی اور کلکتہ سے اردو کے اچھے اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ جن کی دہلی میں بھی مانگ ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا آج دہلی سے کم از کم چالیس روز نامہ اخبارات نکل رہے ہیں اور اگر ان کی کاغذی سرکولیشن پر یقین کیا جائے تو کوئی بھی اخبار پچیس تیس ہزار یومیہ سے کم

نہیں چھپتا۔ بلکہ بعض اخبارات کی سرکولیشن تو لاکھوں میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نہ تو اسٹالوں پر نظر آتے ہیں اور نہ ہی قارئین کے ہاتھوں میں۔ ممکن ہے کہ ان کی مانگ اتنی زیادہ ہو کہ وہ بلیک میں بک رہے ہوں۔ البتہ اگر ہم عملی میدان میں جائیں تو چند اخبارات ہی مارکیٹ میں نظر آتے ہیں۔ یہ ہیں راشٹریہ سہارا، اخبار مشرق، صحافت، ہندوستان ایکسپریس، ہمارا سماج اور جدید خبر۔ ملاپ، پرتاپ، ان دنوں اور تیج سرکاری دفاتر میں جاتے ہیں اور ان کے علاوہ ایوم، ہمارا مقصد اور عوام بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتے ہیں۔ البتہ راشٹریہ سہارا نو شہروں سے نکلتا ہے اور اس کے قارئین دوسرے اخباروں سے زیادہ ہیں۔ باقی کسی بھی اخبار کے لئے پچیس ہزار کی سرکولیشن تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اور آج دہلی کی صحافت میں فرہاد صفت صحافیوں کا ایسا ٹوٹا ہے کہ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شائد ہی کوئی ملے۔ البتہ تیشہ بدست صحافیوں کی کمی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کو تیشہ و نشتر ضرور بنالیا ہے۔ لیکن وہ اس سے مسیحائی کا کام کم اور زخم نمائی کا کام زیادہ لیتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی اردو صحافت کے تعلق سے اپنے دامن میں تلخ و شیریں تجربات کا ذخیرہ سمیٹے ہوئے ہے۔ تاہم شیریں تجربات کم اور تلخ تجربات زیادہ ہیں۔ یہ دہائی اگر اپنے دامن میں تازہ کار اخبارات کے گل بوٹے سجائے ہوئے ہے تو یہی دہائی متعدد اخبارات کا مدفن بھی بن چکی ہے۔ ایک انتہائی معیاری اور تاریخی اخبار روزنامہ قومی آواز اسی دہائی میں بیمار ہوا، رفتہ رفتہ لاغر ہوتا گیا اور پھر سسک سسک کر دم توڑ بیٹھا۔ اس کے بند ہونے کے اسباب سے قطع نظر یہ اکیسویں صدی کی اردو صحافت کا بہت بڑا المیہ ہے کہ تقریباً نصف درجن شہروں سے شائع ہونے والے ایک معیاری اخبار کے آخری ایڈیشن کی موت اسی پہلی دہائی میں ہوئی ہے۔ اس اخبار کے دہلی ایڈیشن کے پہلے مدیر عشرت علی صدیقی میں یہ صحافیانہ جرات تھی کہ انہوں نے اخبار کے افتتاح کے موقع پر اس وقت کی وزیر اعظم اور اخبار کی مالک اندرا گاندھی کے سامنے انتہائی جرات کا مظاہرہ

کرتے ہوئے بہ بانگ دہل کہا تھا کہ یہ اخبار ایک غیر جانبدار اخبار ہوگا، کانگریس پارٹی کا ترجمان نہیں ہوگا اور اگر آپ بھی اس کی پالیسیوں کے خلاف کچھ چھپوانا چاہیں گی تو نہیں چھپ سکے گا۔ اس اظہار بے باکی پر اندرا گاندھی کی پیشانی شکن آلود ہوگئی لیکن عشرت علی صدیقی نے اس کی ذرا بھی پروانہیں کی اور اپنی مدت کار کی آخری شفٹ تک اس پالیسی پر قائم رہے۔ انہوں نے اس بے باکانہ اعلان سے اردو صحافیوں کی حق گوئی مستند کر دی تھی۔ بہر حال اسی دہائی کے آنگن میں ایسے بے باک اور جری اخبار کی قبر بھی موجود ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج دہلی صحافت کا دامن نو بہ نو اخباروں کی خوشبو سے معطر ہے۔ لیکن مواد اور معیار کے اعتبار سے پہلے جیسی بات کہاں۔ تاہم آج کے اردو اخبارات بھی زمانے کا ساتھ دے رہے ہیں، گو کہ پیچھے ہیں لیکن قافلے میں موجود ہیں۔ پہلے کے اخبار سیاہ صفحہ یا بلیک اینڈ وائٹ ہوا کرتے تھے لیکن آج انھوں نے بھی دوسری زبانوں کے اخباروں کی مانند رنگین جامہ زیب تن کر لیا ہے۔ آج ان اخباروں کے دفاتر میں بھی انٹرنیٹ سمیت انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی کے دیگر فوائد سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت رکھنے والے کارکنوں کی کمی نہیں ہے۔ آج وہ بھی دنیا بھر کے اخبارات کا مطالعہ کر کے استفادہ کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ سچائی ہے کہ آج کردار پر نہیں گفتار پر زور ہے، باطنی حسن پر نہیں ظاہری خوبصورتی پر توجہ ہے۔ آج ہماری توجہ روپ رنگ، ساج سجاّ، آرائش و زیبائش اور میک اپ پر زیادہ اور معیار کی بلندی اور زبان کی درستگی پر کم ہے۔ اگر میری اس بات کو الزام تراشی پر محمول نہ کیا جائے تو میں انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا چاہوں گا کہ آج ہمارے ہاتھوں صحافتی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور اصولوں کا جنازہ نکالا جا رہا ہے۔ ہاں بعض اخبارات ایسے ضرور ہیں جو اصول پسندی اور حق گوئی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اخبارات کے نزدیک حق گوئی کی کوئی اہمیت نہیں اور اصولوں اور قدروں کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ مالی منفعت کو ہی صحافتی معراج تصور کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مالی منفعت یا مالی وسائل کے بغیر کوئی اخبار نہیں

نکل سکتا اور وسائل کی فراہمی کے لئے ایڈیٹروں اور مالکوں کو بہت کچھ سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔لیکن اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال اور لحاظ بہر صورت رکھا جانا چاہئے کہ وسائل کی فراہمی کی تگ و دو صحافتی اصولوں کا گلا نہ گھونٹ دے اور حق گوئی و بے باکی کو سکوں کی جھنکار میں دفن نہ کر دے۔آج نو بہ نو اور تازہ کار اخباروں کے پھول ہماری نگاہوں کو دعوت نظارہ تو دے رہے ہیں لیکن ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنی حق گوئی کی خوشبو سے ہماری مشام جاں کو معطر کئے ہوئے ہیں۔

مجھے معاف فرمائیں مگر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ اخبارات مالی منفعت کا سامان تو پیدا کر رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ زیاں زبان کا ہو رہا ہے۔زبان کے حوالے سے اردو صحافت کو جو خسارہ ہو رہا ہے اس کے ازالے کی کوئی صورت سر دست نظر نہیں آتی۔پہلے انہی اخباروں کے دفاتر اردو زبان کے ٹکسال ہوا کرتے تھے۔وہاں زبان ڈھالی جاتی تھی،اصطلاحیں گھڑی جاتی تھیں اور بامحاورہ زبان کو اولیت دی جاتی تھی۔ترجمہ بھی اس معیار کا ہوتا تھا کہ اس میں حقیقی اور اوریجنل تحریروں کی مانند اوریجنالٹی ہوا کرتی تھی۔صحافیانہ خو بو کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی ہوتی تھی اور بہت سے ادبی شہہ پارے انہی اخبارات کے صفحات پر جنم لیتے تھے۔افسوسناک بات یہ ہے کہ آج نہ تو خوبصورت زبان لکھی جاتی ہے نہ بامحاورہ ترجمہ کیا جاتا ہے،نہ اصطلاحیں گھڑی جاتی ہیں اور نہ ہی نئے الفاظ کی تلاش کی جاتی ہے۔شائد آج کی بھاگم بھاگ دنیا میں اس کے لئے وقت نہیں ہے۔ادبی چاشنی تو عنقا ہو گئی ہے۔آج کسی بھی روزنامہ کا ایسا کوئی ایڈیشن نہیں نکلتا یا کوئی ضمیمہ نہیں نکلتا جس کے مطالعہ سے ادبی ذوق کی تسکین کی جا سکے۔زبان کے زیاں کی صورت حال یہ ہے کہ بہت سے اردو الفاظ اردو اخباروں سے کٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ہندی شبدوں نے لے لی ہے۔آج ہمارا دامن معیاری زبان اور ذخیرہ الفاظ کے حوالے سے تنگ ہوتا جا رہا ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آج جو لوگ اردو صحافت میں آرہے ہیں وہ عربی اور فارسی سے نابلد ہیں۔(میں خود کو بھی اسی زمرے میں شامل کرتا ہوں) جب تک اردو

صحافی عربی اور فارسی کی شد بدنہیں رکھیں گے، وہ اچھی اور معیاری زبان نہیں لکھ سکتے۔

دوسری وجہ غالبًا یہ ہے کہ اب اچھے ادیبوں اور شاعروں نے صحافت کو شجر ممنوعہ سمجھ لیا ہے اور وہ اب اسے پیشے کے طور پر اختیار نہیں کرتے۔ جبکہ پہلے اچھے ادبا، شعراء اور کالم نگار صحافت میں آتے تھے اور اس کے معیار میں چار چاند لگاتے تھے۔ آج یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل، ریسرچ اسکالرس یا پی ایچ ڈی ہولڈرس اخباروں میں کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ یا بدرجہ مجبوری کرتے بھی ہیں تو موقع ملتے ہی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تدریس کی جانب منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ پی ایچ ڈی اس لئے نہیں کرتے کہ کم تنخواہ پر اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کام کریں یا پریس کانفرنسوں کی خاک چھانتے پھریں۔ اردو اخباروں میں اتنی تنخواہ نہیں ملتی کہ ان کو دوسری طرف للچائی نظروں سے دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ممکن ہے کہ مالکان اس پوزیشن ہی میں نہ ہوتے ہوں کہ وہ زیادہ تنخواہ دے سکیں۔ بہر حال جو بھی ہو، آج کے اس انتہائی گرانی کے دور میں کوئی باصلاحیت تعلیم یافتہ شخص چار پانچ ہزار یا زیادہ سے زیادہ دس ہزار کی نوکری کیوں کرے گا جبکہ لیکچر رشپ میں کہیں بہتر تنخواہیں اور مراعات ہیں۔ پھر بھی ہمارے پروفیسر حضرات کو اس جانب توجہ دینی چاہئے کہ اس صورت حال کو کیسے بہتر کیا جا سکتا ہے۔

آج کی صحافت میں زبان کی زیاں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اب اسلوب تحریر میں کافی تبدیلی آ گئی ہے، بلکہ سچ بات یہ ہے کہ کافی بگاڑ آ گیا ہے۔ یہ بات شائد زیادہ غلط نہیں ہے کہ آج دہلی سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کا رسم الخط تو اردو ہے لیکن سچ پوچھئے تو کئی اخبارات کی زبان میں ہندی کی آمیزش بہت بڑھ گئی ہے۔ کبھی کبھار ان کی زبان پر ہندی زبان کا گمان ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ ہم اردو اخبار نہیں پڑھ رہے بلکہ ہندی کے نیوز چینلوں پر خبر سن رہے ہیں۔ آج بڑے اور اچھے اخباروں میں بھی ترجمے کی خوب غلطیاں ہوتی ہیں، ایسی غلطیاں کہ شرمسار ہو جانا پڑے۔ مثال کے طور پر آج ہمارے اخبار ہندی اخباروں اور چینلوں کی مانند لکھنے لگے ہیں کہ امریکہ اسامہ بن لادن کے فراق میں

ہے۔شائد ان کو فراق کا مطلب نہیں معلوم یا وہ اس کے استعمال سے ناواقف ہیں۔اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں دی سکتی ہیں۔یہ اسلوب تحریر زبان کو نقصان پہنچا رہا ہے اور اچھی زبان پڑھنے کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔اس سلسلے میں میں ایک عبرت ناک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔قومی آواز کے ہمارے ایک سینئیر ساتھی نے، جو کہ چیف سب ایڈیٹر کے عہدے پر تھے، ابھی کچھ دنوں پہلے کہنے لگے کہ انھوں نے اردو اخبار خریدنا بند کر دیا ہے۔اس پر مجھے بہت حیرت ہوئی اور افسوس بھی ہوا، اور سچ بات یہ ہے کہ غصہ بھی آیا کہ زندگی بھر اردو کی روٹی توڑنے کے بعد جب اخبار بند ہو گیا تو انھوں نے اردو سے رشتہ ہی توڑ لیا اور اب انہیں دو روپے کا ایک اخبار بھی خریدنا گوارہ نہیں۔میں نے ان سے وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ ارے بھائی ان اخباروں کو پڑھ کر اپنی زبان کون خراب کرے گا۔اس سے بہتر ہے کہ انگریزی اور ہندی کے اخبار پڑھے جائیں۔میرے خیال میں ان کا یہ جواب بہت غلط نہیں ہے اور آج کے ہمارے اردو اخباروں پر بہت بڑا طنز ہے اور ان کے غیر معیاری ہونے پر ایک بھر پور تبصرہ بھی ہے۔تاہم میں نے ان سے درخواست کی کہ کچھ بھی ہو آپ کو کم از کم ایک اخبار تو خریدنا ہی چاہیئے۔ہم اردو والے ہیں اور اردو ہماری ہے، ہم ہی لوگ اس سے یوں بے اعتنائی برتیں گے تو بھلا کس سے توقع رکھیں گے کہ وہ اردو اخبار خریدے یا کس منھ سے لوگوں کو اردو اخبار پڑھنے کو کہیں گے۔برسبیل تذکرہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قومی آواز جب بند ہوا تو وہ بہت معیاری تھا۔بالکل نہیں۔اپنے آخری دنوں میں وہ بھی انتہائی غیر معیاری اخبار بن کر رہ گیا تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہر حال جو بھی اخبارات نکل رہے ہیں وہ غنیمت ہیں۔آج پوری اردو زبان پر زوال آیا ہوا ہے، کچھ لوگ اسے اردو کا عبوری دور کہتے ہیں اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آج کے اردو اخبارات ایک زوال پذیر زبان کی زوال پذیر صحافت کر رہے ہیں۔اس زوال پذیری کے باوجود دہلی میں کئی ایسے اخبار ہیں جو الگ الگ طبقات کے قارئین کے ذوق کی تسکین کا

سامان فراہم کر رہے ہیں۔ان میں بھی برمحل اور اپ ڈیٹ خبریں اور رپورٹیں چھپتی ہیں اور تجزیاتی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔البتہ انوسٹی گیٹیو اسٹوریز کا فقدان ضرور کھلتا ہے۔اس کے ساتھ جذباتی تحریریں بھی بعض اوقات کافی گراں گزرتی ہیں۔یہ اخبار اگر سستے نہیں ہیں تو مہنگے بھی نہیں ہیں۔مقابلے کی وجہ سے دہلی میں انگریزی کے دو بڑے اخبار کافی کم قیمت پر ملتے ہیں لیکن اردو اخباروں میں ایسا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔اس کے باوجود دس اور بارہ صفحات پر مشتمل رنگین اخبارات ہمیں دو اور تین روپے میں پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔بہر حال یہ اخبار ہمارے اپنے اخبار ہیں اور اردو صحافت بہ زبان حال کہہ رہی ہے کہ یہی ہے اے ساقی متاع فقیر۔اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر۔ہمیں یہ کوشش ضرور کرنی چاہئے کہ ہم ان کے خریدار بنیں اور صرف ایک اخبار پر قناعت کرنے کے بجائے ہو سکے دو تین اخباروں کے خریدار بن جائیں۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ایسے دیوانوں کی کمی نہیں ہے جو انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بھی اخبار نکال رہے ہیں۔ان کی صحافتی خدمات کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔وہ بھی اپنے طور پر کچھ نہ کچھ تعاون ہی دے رہے ہیں۔

دہلی میں بلکہ اب پورے ملک میں ہفت روزہ صحافت کا دور ختم ہوتا جا رہا ہے۔دہلی سے کئی ہفت روزہ اخبارات نکلتے ہیں لیکن اب ان میں قارئین کی دلچسپی کم ہو گئی ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اب لوگ سنجیدہ تحریریں پسند کرتے ہیں جذباتی تحریریں نہیں۔جبکہ جذباتیت کے بغیر ہفت روزہ صحافت ترقی نہیں کر سکتی۔ٹیبلوائڈ کا مزاج ہی سنسنی خیزی اور جذباتیت کے خمیر سے بنتا ہے اور اب اس خمیر کی خوشبو ہمیں اپنا دیوانہ نہیں بناتی۔دہلی سے اردو کا ایک ہی اچھا سیاسی ماہنامہ شائع ہوتا ہے اور وہ ہے افکار ملی۔لیکن اب اس کی اشاعت بھی خاصی کم ہو گئی ہے۔ہاں اس پہلی دہائی میں اردو کے دو خوبصورت دو ماہی جریدوں اور ایک خوبصورت ہفت روزہ نے بھی جنم لیا ہے۔دو ماہی رسالوں کا جنم دو غیر ملکی سفارت خانوں کے بطن سے ہوا ہے۔ان میں پہلا ہے 'اسپین' اور دوسرا ہے 'برٹش جائزہ'۔ اول الذکر ۲۰۰۳ اور ثانی الذکر ۲۰۰۴ سے شائع ہو رہا ہے۔یہ دونوں گیٹ اپ کے اعتبار

سے بہت خوبصورت ہیں۔ نفیس کاغذ پر بہترین چھپائی نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ لیکن ان سے عوامی وابستگی بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک خاص مقصد کے تحت شائع ہو رہے ہیں اور مواد بھی اسی مقصد کی تکمیل کو سامنے رکھ کر منتخب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ کوشش بھی کی جاتی ہے کہ اس میں عوامی دلچسپی کی چیزیں شامل کی جائیں لیکن نہ جانے کیوں عام قارئین کا والہانہ لگاوان سے نہیں ہے۔ حالانکہ وہ زیادہ تر اعزازی تقسیم ہوتے ہیں۔ تاہم وہ اتنے خوبصورت ہیں کہ ان کو کسی بھی انٹرنیشنل میگزین کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں خوبصورت اضافے اسی دہائی کے مرہون منت ہیں۔ جبکہ ہفت روزہ رسالے کا نام سنڈے ایڈیشن ہے وہ بھی کاغذ اور طباعت کے اعتبار سے پُرکشش ہے۔ میں دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں کا جائزہ دوسروں پر چھوڑتا ہوں کیونکہ اگر میں نے ان پر اظہار خیال کیا تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ البتہ دو جملے یو این آئی اردو سروس کے بارے میں کہنا چاہوں گا۔ اس سروس کو اگر اردو صحافت میں ایک انقلاب تصور کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ گرچہ اس کا آغاز پچھلی صدی میں ہوا تھا لیکن اس نے موجودہ صدی میں بھی اردو اخبارات بالخصوص چھوٹے اخبارات کی خبری کفالت کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ اس سروس پر حکومت کی جانب سے سبسڈی دی جاتی ہے اور اخباروں سے نصف فیس ہی چارج کی جاتی ہے۔ چھوٹے اخبارات اس سروس کو حاصل کر کے کئی کارکنوں کو رکھنے سے بچ جاتے ہیں اور اب تو یہ سروس انٹرنیٹ پر بھی اخباروں کو مہیا کی جاتی ہے، تاکہ انہیں ٹیلی پرنٹر مشین لگانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انٹرنیٹ پر خبروں کی دستیابی کے سبب ان کی کمپوزنگ بھی نہیں کرنی پڑتی۔ انٹرنیٹ کی سہولت کے سبب بی بی سی اور وائس آف امریکہ کی خبروں کو بھی جوں کا توں لے لیا جاتا ہے اور کمپوزنگ اور پروفنگ کی زحمت نہیں کرنی پرتی۔

دہلی میں اردو صحافت کا ذکر اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ اس پہلی دہائی میں اردو الیکٹرانک میڈیا کا جائزہ نہ لے لیا جائے۔ اردو کے دو چینل اس وقت دہلی اور بیرون دہلی کے جذبات کی تسکین کر رہے ہیں۔ یہ ہیں ای۔ ٹی۔ وی اردو اور دوردرشن اردو۔ ان دونوں

چینلوں کا جنم بھی اسی دہائی کے بطن سے ہوا ہے۔ای ٹی وی اردو کا آغاز ۲۰۰۱ میں اور ڈی ڈی اردو کا آغاز ۲۰۰۷ میں ہوا۔ڈی ڈی اردو پہلے صرف سات گھنٹے کا تھا مگر اب وہ بھی چوبیس گھنٹے کا چینل ہو گیا ہے۔البتہ یہ دونوں فل ٹائم نیوز چینل نہیں ہیں۔ان پر دوسرے پروگرام بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ان دونوں چینلوں کے قیام کا سہرا اسی دہائی کے سر جاتا ہے۔

اب آخر میں یہ عرض کر دوں کہ میں نے اردو صحافت کے حوالے سے جو باتیں کہی ہیں وہ کسی عصبیت یا بدگمانی کی وجہ سے نہیں کہی ہیں بلکہ یہ وہ درد ہے جسے زبان مل گئی ہے اور جس نے الفاظ کا جامہ پہن لیا ہے۔یہ درد ہر اس مخلص اور سچے اردو صحافی کے دل میں ہے جو صحافت کو اعلی معیار پر فائز دیکھنا چاہتا ہے۔میں بھی اردو صحافت کا ایک ادنی سا حصہ ہوں اور اس سے جذباتی وابستگی رکھتا ہوں۔لہذا میں نے جو کچھ کہا ہے وہ تمام مخلص صحافیوں کا درد اور ان کی ترجمانی ہے۔ہاں اگر کسی کو میری کچھ باتیں ناگوار گزری ہوں تو میں انتہائی خلوص کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

اور صحافیوں سے کہنا چاہوں گا کہ

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

ڈی اے وی پی سے منظور شدہ دہلی کے اردو اخبارات ورسائل کی فہرست:

روزنامہ اخبارات

۱۔جدید ان دنوں
۲۔ہمارا سماج
۳۔صحافت

۴۔اقدام
۵۔اخبار مشرق
۶۔پرتاپ
۷۔سیاسی افق
۸۔حال وطن
۹۔مشرقی آواز
۱۰۔ہندوستان ایکسپریس
۱۱۔سیاست نامہ
۱۲۔عوام
۱۳۔الیوم
۱۴۔اردو نیٹ
۱۵۔ہمارا مقصد
۱۶۔صدائے وطن جدید
۱۷۔ملاپ
۱۸۔حالات وطن
۱۹۔جدید خبر
۲۰۔عوام ہند
۲۱۔کاروان دہلی
۲۲۔فاروقی تنظیم
۲۳۔سالار ہند
۲۴۔جدید راستہ
۲۵۔المومن

۲۶۔آفتاب ہند
۲۷۔جدید عمل
۲۸۔قومی سلامتی
۲۹۔سیاسی تنظیم
۳۰۔کائنات جدید
۳۱۔قومی رہبر
۳۲۔رفتار وقت
۳۳۔قومی سماچار
۳۴۔میزائل ایکسپریس
۳۵۔رہبر انڈیا
۳۶۔راشٹریہ سہارا
۳۷۔میری منزل
۳۸۔تیج
۳۹۔سیکولر تنظیم

سہ روزہ

۱۔دعوت

ہفت روزہ اخبارات

۱۔نئی دنیا

۲۔صدائے انصاری

۳۔صحت اور سماج

۴۔جلتے چراغ

۵۔الجمعیت
۶۔ٹنڈر نامہ
۷۔وحدت نو
۸۔ویکلی تیج
۹۔اخبار نو
۱۰۔شیر پنجاب
۱۱۔ٹنڈر ڈٹکٹو
۱۲۔مسرت

پندرہ روزہ جریدے

۱۔سیاست نامہ
۲۔کاروان دہلی
۳۔خبردار جدید
۴۔مسکراہٹ ہند
۵۔جہان ہند
۶۔آپ کا ساتھی

ماہنامہ جریدے

۱۔عالمی وجود
۲۔عاکف کی محفل
۳۔افکار ملی
۴۔مستانہ جوگی
۵۔آجکل

اردو میڈیا
رول اور ذمہ داریاں

ابھی گذشتہ دنوں دیال سنگھ ایوننگ کالج نئی دہلی میں مذکورہ بالاعنوان کے تحت ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔جس کی ایک بہت خاص بات یہ رہی کہ اس میں غیر اردوداں طبقہ کو بھی بلایا گیا تھا اوران کی تعداد خاصی تھی۔صدارت بزرگ صحافی جناب کلدیپ نیر نے کی اور جے این یو میں شعبہ اردو کے استاد پروفیسر شاہد حسین، کالم نگار ظفر آغا اور خبر دار جدید کے مدیر معصوم مرادآبادی نے خصوصی طور پر اظہار خیال کیا۔جبکہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی اپنی رائے رکھی جن میں ڈاکٹر انور پاشا اور سنیل ڈانگ قابل ذکر ہیں۔جبکہ حاضرین میں سینئر صحافی اور سیاستداں سنتوش بھارتی سمیت متعدد لوگ موجود تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میڈیا کے رول اور ذمے داریوں پر بات ہونی چاہئے اور کس زبان کا میڈیا کہاں بے ایمانی کر رہا ہے اور کہاں ڈنڈی مار رہا ہے، اس پر بھی بات ہونی چاہئے۔میڈیا اپنا رول بحسن وخوبی نبھا رہا ہے یا نہیں، اس کا بھی جائزہ لیا جانا چاہئے اور صرف اردو میڈیا کو ہی نہیں بلکہ انگریزی اور ہندی میڈیا کو بھی پرکھا جانا چاہئے۔چونکہ یہ دور مذکورہ دونوں زبانوں کے میڈیا کا ہی دور ہے اور دونوں کے اثرات سماج پر بہت گہرے پڑ رہے ہیں اس لئے انگریزی اور ہندی کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر بہت ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ان کے رول اور کارکردگی کا جائزہ تو ہر حال میں لیا جانا چاہئے۔

اس مذاکرہ میں اردو کے سلسلے میں کافی باتیں ہوئیں اور اردو ایک شیریں زبان ہے

اور گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے، جیسی روایتی باتیں بھی کہی گئیں۔اسی کے ساتھ ساتھ اس پر اظہار فکر مندی بھی کیا گیا کہ آج اردو زبان مٹ رہی ہے، ختم ہو رہی ہے اور اس کو بچانے کی ذمے داری ہم لوگوں کو ادا کرنی چاہئے۔میرا خیال ہے کہ اس مذاکرہ میں موضوع سے متعلق زیادہ باتیں نہیں کہی گئیں، پرانی اور روایتی باتوں سے ہی کام چلایا گیا۔کلدیپ نیر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں آزادی کے وقت کی باتیں دوہرائیں اور بحیثیت اردو صحافی اپنے تجربات بھی بتائے۔یقیناً وہ ایک سنجیدہ اور بزرگ صحافی ہیں اور اردو صحافت سے ہی انگریزی صحافت میں گئے ہیں۔ان کی باتوں سے ہمیں بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔کیونکہ وہ جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہ ختم ہوتی جا رہی ہے اور ان کے پاس جو تجربات ہیں ان سے استفادہ کا موقع گنوانا نہیں چاہئے۔ظفر آغا کی تقریر کا بیشتر حصہ موضوع پر محیط تھا اور انھوں نے اردو اخبارات کے مسائل اور مشکلات کا ذکر کیا اور انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا سے اردو اخبارات کا موازنہ بھی کیا۔انھوں نے کھلے دل کے ساتھ یہ بھی اعتراف کیا کہ اردو کالم لکھنے کا آغاز انھوں نے جلد ہی کیا ہے اور یہ کہ وہ ابھی اردو سیکھ رہے ہیں۔بلاشبہہ یہ ان کا بڑا پن ہے کہ انھوں نے اپنی ایسی کوتاہیوں کا ذکر کیا جو حقیقت میں ہیں ہی نہیں۔سنیل ڈانگ نے بہت دکھ کے ساتھ اردو زبان کے سکڑتے دائرے پر اظہار خیال کیا اور اپنے متعدد اقدامات کے حوالے سے بتایا کہ کس طرح انھوں نے اردو زبان کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے۔معصوم مرادآبادی اور پروفیسر شاہد حسین نے اردو صحافت کے موجودہ حالات پر روشنی ڈالی۔انھوں نے اعداد و شمار کی روشنی میں اردو اخبارات کی سرکولیشن پر اظہار خیال کیا۔جبکہ ڈاکٹر انور پاشا نے بہت جذباتی انداز میں اردو کے زوال کا گلہ کیا۔کلدیپ نیر نے جہاں یہ بتایا کہ آج پاکستان میں اردو کا ایک اخبار پندرہ بیس روپے میں ملتا ہے کیونکہ ان کو اشتہارات نہیں ملتے وہیں وہ یہ بات بتانی بھول گئے اور ظفر آغا بھی بھول گئے کہ دہلی سے نکلنے والا ایک اردو روزنامہ جو کہ فور کلر میں شائع ہوتا ہے، محض ایک روپے میں ملتا ہے (ان دنوں روزانہ صحافت کی قیمت ایک روپیہ تھی)۔جبکہ اس کو

بھی کوئی خاص اشتہارات نہیں ملتے۔ آج کی زوال آمادہ اردو صحافت کا ایک اور سچ ملاحظہ فرمائیں کہ واشنگٹن اور نیو یارک سمیت کئی شہروں سے نکلنے والا ہفت روزہ اخبار 'اردو ٹائمز' مفت تقسیم ہوتا ہے اور اس کی سرکولیشن اگر ایک لاکھ نہیں تو پچاس ہزار سے اوپر ہی ہوگی۔ وہ اخبار اشتہارات کی بنیاد پر چلتا ہے اور خاصا ضخیم ہوتا ہے۔ اس کے بانی مدیر پاکستان کے خلیل الرحمٰن ہیں جنھوں نے بہت ہی محنت سے اس پودے کو ایک تناور درخت میں تبدیل کیا ہے۔

مذکورہ تفصیلات بتانے کا مقصد صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اردو سے محبت کا دم تو خوب بھرا جاتا ہے لیکن اس کی بقاء اور تحفظ کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ یہاں تک کہ اردو اساتذہ بھی اپنے بچوں کو اردو پڑھانے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ اردو بہت شیریں زبان ہے، محبت کی زبان ہے، گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے، یہ سب باتیں کہنے اور سننے میں تو اچھی لگتی ہیں لیکن اردو کے مسائل کو حل کرنے میں اور اردو کے سکڑتے دائرے کو بڑھانے میں کوئی معاونت نہیں کر سکتیں۔ دوسری بات یہ کہ جس موضوع پر مذاکرے کا اہتمام کیا گیا تھا اس پر زیادہ گفتگو شائد اس لئے نہیں ہوئی کہ یا تو یہ سمجھا گیا کہ اردو میڈیا کا سماج میں سرے سے کوئی رول ہی نہیں ہے یا پھر اگر اس کے رول پر گفتگو کی جاتی ہے تو انگریزی اور ہندی کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے رول اور ذمے داریوں پر بھی گفتگو ضروری ہو جائیگی۔ آج زیادہ ضرورت الیکٹرانک میڈیا کے رول اور ذمے داریوں پر بات کرنے کی ہے۔ اردو میڈیا کا بھی ظاہر ہے ایک بڑا حلقہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو کے 'کرم فرماؤں' نے اس حلقے کو مسلمانوں تک محدود کر دیا ہے۔ اگر ہم اردو میڈیا کی بات کریں تو لے دے کر ایک چینل ای ٹی وی ہے جس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ یہ صرف پرنٹ میڈیا تک ہی محدود ہے۔ اور یوں بھی جیسا کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ اردو اخبارات لوگ کم پڑھتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پھر بھی اس کے قارئین کی تعداد کم نہیں ہے۔ این آر آئی کے آنکڑوں کو مبالغہ آمیز کہہ کر چھوڑ دیجئے تب بھی اس کے پڑھنے والے کم نہیں

ہیں۔اردو اخبارات کے رول کی اگر بات کی جائے تو مجموعی طور پر اس کا رول سماج کے لئے برا نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندی اور انگریزی کے بعض اخبارات جس طرح معاشرے میں فرقہ اور مذہب کے نام پر زہر گھولنے کی کوشش کرتے ہیں کم از کم اردو اخبارات ویسا نہیں کرتے۔اس کے باوجود اردو صحافت پر فرقہ واریت کے الزام لگائے جاتے ہیں۔ ہاں لیکن اسی کے ساتھ میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ بعض اخبارات جذباتیت کو ہوا دیتے ہیں جو نہ تو اردو قارئین کے لئے اچھا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے لئے اور نہ ہی معاشرے کے لئے۔وقتی طور پر تو وہ باتیں دل کو بہت بھلی لگتی ہیں لیکن اس کا میڈیکل زبان میں سائڈ ایفکٹ بہت برا اور خطرناک ہوتا ہے۔

میں پھر اس بات کو دوہراؤں گا کہ رول اور ذمے داریوں کی اگر بات کرنی ہے تو قومی میڈیا کے اور الیکٹرانک میڈیا کے رول اور ذمے داریوں کی کی جانی چاہئے۔کیونکہ وہی اپنے رول اور ذمے داریوں سے ادھر ادھر بھٹکتے ہیں۔بٹلہ ہاؤس انکاونٹر کے دوران انھوں نے اپنا رول کس طرح نبھایا' یہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے اور اب جب سادھوی اور شنکر آچاریہ پکڑے جارہے تھے تو وہ اپنا رول کس طرح نبھارہے تھے یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کو بھی اپنی ذمے داری کا احساس ہونا چاہئے اور اس کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔میڈیا جمہوریت کا چوتھا ستون ہے اور یہ ستون اسی وقت مضبوط اور پختہ ہوگا جب اس کے کارپردازوں کے اندر غیر جانبداری ہوگی اور ان کو اس کا احساس ہوگا کہ وہ بھی عوام کے تئیں جوابدہ ہیں اور ان کو اپنی ذمے داری ایمانداری کے ساتھ نبھانی چاہئے۔جس دن یہ بات پیدا ہو جائے گی' اس دن نہ تو اس کے رول پر بحث کرنے کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی کوئی سیاستداں یا دانشور میڈیا کو اس کی ذمے داریوں کی یاد دلائے گا۔

مشینی ترجمہ

(تہذیبی شناخت اور لفظ و معنی کا پیچیدہ رشتہ)

کیا مشین ہر کام کرسکتی ہے؟ کیا تکنالوجیکل ترقی کے اس دور میں وہ مختلف زبانوں کا آپس میں اس طرح ترجمہ کرسکتی ہے کہ لفظ و معنی کا پیچیدہ رشتہ اور تہذیبی شناخت مجروح نہ ہو اور کیا وہ بین السطور میں پوشیدہ انسانی جذبات و احساسات کی بھی ترجمانی کے فرائض انجام دے سکتی ہے؟ اس بحث کا آغاز نئی دہلی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں ہوا اور بحث اس نتیجے پر ختم ہوئی کہ مشینی ترجمہ نگار یا خودکار مترجم ترجمے کے عمل میں آسانیاں تو فراہم کرسکتا ہے لیکن وہ لسانی و تہذیبی پیچیدگیوں سے نہ تو بہ آسانی گزر سکتا ہے اور نہ ہی ان میں باہمی فرق کو واضح ہی کرسکتا ہے۔

اس موضوع پر کلیدی خطبہ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات کے چیئر مین اور استاد پروفیسر اے آر فتیحی نے پیش کیا۔ انھوں نے انتہائی بلیغ انداز میں ترجمے کے تاریخی پس منظر، مختلف زبانوں میں ترجمے کی روایت اور ہندوستان میں ترجمے کی تاریخ پر اظہار خیال کیا۔ جبکہ دوسرے لوگوں نے بھی مذہبی ترجمے، تہذیبی ترجمے اور ادبی ترجمے پر اپنے خیالات رکھے اور کہا کہ ہندوستان میں ادبی ترجموں سمیت دوسرے ترجموں کی بھی توانا اور جامع روایت رہی ہے اور اس روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ سیمینار میں فکشن کے ترجمے میں عملی مسائل کا بھی ذکر کیا گیا اور کہا گیا کہ اگر مترجم زبان کی باریکیوں اور اس کے تاریخی پس منظر سے واقف نہیں ہے تو وہ اچھا ترجمہ نگار نہیں بن سکتا۔ مختلف زبانوں سے

ترجمہ کے عمل کے دوران مترجم کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان پر اسی صورت میں قابو پایا جا سکتا ہے جب نہ صرف زبان وادب کی پوری معلومات ہو بلکہ مترجم اس زبان کی تہذیبی روایات سے بھی واقف ہو۔ ورنہ اصل متن کا مفہوم کچھ اور ہوگا اور ترجمہ شدہ متن کا مفہوم کچھ اور ہوگا۔ اگر مترجم تہذیبی علم نہیں رکھتا تو ترجمہ کے ساتھ زبردست ناانصافی ہوگی۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان اگرچہ ایک زبردست لسانی قوت رکھتی ہے لیکن 'سندور' یا 'سہاگن' جیسے بعض تمدنی الفاظ کے اظہار میں انتشار کا شکار ہو جاتی ہے اور پروفیسر فتحی کے مطابق ان الفاظ کی لسانی منتقلی میں وہ ترسیلی جہتیں ابھر کر سامنے نہیں آپاتیں جو ان الفاظ سے وابستہ ہیں۔ محاورات، تشبیہات، استعارے اور تمثیلی پیکر کے ترجمے بعض دفعہ مسائل کا سبب بنتے ہیں اور بعض صورتوں میں ان کی براہ راست لسانی منتقلی نہیں ہو پاتی۔ کیونکہ مختلف زبانوں میں ایسی لفظ بہ لفظ مماثلت نہیں ملتی جو بامعنی بھی ہو اور درست بھی ہو۔ ایک مقرر نے میر کے اس شعر کی مثال پیش کی، نازکی اس کے لب کی کیا کہئے۔ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا ترجمہ کرتے وقت ہر لفظ کا ترجمہ ہو سکتا ہے لیکن لفظ 'سی' کا کیا ترجمہ کیا جائے۔ اسی طرح پروفیسر فتحی نے انگریزی کے لفظ ڈومسٹک (Domestic) کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اس ایک لفظ سے انگریزی میں کئی مفہوم نکلتے ہیں۔ لیکن جب ہم اردو میں اس کا ترجمہ کریں گے تو جملوں کے حساب سے الگ الگ مفاہیم نکلیں گے۔ اگر یہ لفظ Cat یعنی بلی کے لئے استعمال ہوگا تو اس کا مطلب ہوگا پالتو۔ اگر مسائل یعنی Problem کے ساتھ اس کا استعمال ہوگا تو اس کا مطلب ہوگا خانگی۔ اگر امور یا Issues کے ساتھ ہوگا تو اس کا مطلب ہوگا داخلی اور اگر پرواز یعنی Flight کے ساتھ ہوگا تو اس کا مطلب ہوگا گھریلو۔ گویا لفظ ومعنی کا رشتہ ہمیشہ پیچیدہ رہا ہے۔ مترجم ترجمے کے دوران لفظ ومعنی کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے ادراک کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور لفظ ومعنی کی وحدت کو تلاش کرتا ہے کیونکہ لغت لفظ کے معنوی پہلو کو تو اجاگر کرتی ہے لیکن ثقافتی اور تمدنی حرکیات کا ترجمہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب مترجم

ادراک کی گہرائیوں میں اترنے اور مصنف کے تجربے تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ڈاکٹر فتحی کے خیال میں مصنف اور مترجم کے مابین ذہنی روابط میں کمی مترجم کو متن کے ظاہری معنی تک محدود کر دیتا ہے اور اس طرح ترجمہ لسانی ترجیحات کے جبر کا شکار ہو جاتا ہے۔اس تناظر میں بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ جب انسانی مترجم جو کہ ذہن و دماغ بھی رکھتا ہے لسانی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی پس منظر سے عدم واقفیت کی بنیاد پر فن ترجمہ کی گہرائیوں میں غوطے کھانے لگتا ہے تو پھر مشین اس پیچیدہ عمل سے بہ کمال کامیابی کیسے گزر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مشین انسانی جذبات و احساسات سے بھی عاری ہوتی ہے لہذا وہ ترجمے کی باریکیوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ترجمے کے دوران مترجم کے تجربات بھی کام آتے ہیں اور وہ تجربات صداقت کی توسیع میں ایک نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔اور پھر اس طرح ترجمہ شدہ متن میں سچائیوں کی نئی پرتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔بقول ڈاکٹر فتحی ترجمے کے ایسے نمونوں میں مصنف اور مترجم ایک دوسرے سے ابلاغ کرتے ہیں اور ترجمہ ذہنی رد و قبول کے مراحل سے گزر کر ایک ایسے فکری ساختیے کو ترتیب دیتا ہے جو سکہ بند معنویت سے آزاد ہوتا ہے۔ایسے ترجموں میں توجہ لفظی مماثلت سے زیادہ فکری مماثلت پر ہوتی ہے تاکہ متن کی معنویت کا نظام رواں دواں رہے۔

ہندوستان میں ترجموں کی روایت بہت قدیم ہے۔مغلیہ دور میں بھی ترجمہ نگاری کو اہم سمجھا گیا تھا اور سنسکرت کی، علمی، ادبی اور مذہبی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ترجمے کی روایت کا دوسرا اہم دور برٹش دور حکومت میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔اس دور میں ادبی ترجمے بھی خوب ہوئے۔مشینی ترجمے پر پاکستان میں کافی کام ہوا ہے لیکن ہندوستان میں اتنا نہیں ہوا ہے۔یہاں پونے میں واقع سینٹر فار ڈیولپمنٹ آف ایڈوانسڈ کمپیوٹر نے اس سلسلے میں کچھ کام کیا ہے۔لیکن اردو کا معاملہ بہت پچھڑا ہوا ہے۔کمپیوٹر دیوناگری رسم الخط کا ترجمہ اردو رسم الخط میں کر تو دیتا ہے لیکن بات بنتی نہیں۔کیونکہ کمپیوٹر ترجمہ نہیں کرتا صرف Translitration کرتا ہے۔گویا اگر ہم مشینی

ترجمے پر زور دیں گے تو لسانی اور تہذیبی و تمدنی خصوصیات متاثر ہوں گی۔ ہندوستان میں اسکرپٹ سے متعلق دشواریاں ہیں جنہیں ابھی دور نہیں کیا جا سکا ہے۔ جبکہ پاکستان میں بہت حد تک کامیابی مل گئی ہے۔ ڈاکٹر فتیحی کا کہنا ہے کہ یہاں ابھی یونی کوڈ کا کوئی سافٹ ویئر نہیں بنا ہے۔ جس دن بن جائے گا اس دن سے کچھ آسانیاں ہو جائیں گی۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ مشینی ترجمے کا مقصد ترجمے کے عمل کو کمپیوٹر کی مدد سے آسان بنانا ہے۔ تاکہ تعلیمی، تکنیکی اور معلوماتی مواد تیار کیا جا سکے۔ جب اس سلسلے میں ایک خودکار مترجم تیار کرنے کی کوشش شروع ہوئی تھی تو انتہائی جوش و ولولہ کے ساتھ یہ توقع کی گئی تھی کہ جلد ہی ایک ایسا سافٹ ویئر ایجاد ہو جائے گا جس میں اگر کسی زبان کا متن داخل کیا جائے تو مطلوبہ زبان کا ترجمہ آسانی کے ساتھ مل جائے گا۔ لیکن لسانی تحقیق سے یہ اندازہ ہوا کہ مشینی ترجمہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ مکمل طور پر کوئی خودکار مترجم نہ بھی تیار ہو تب بھی مشینی ترجمہ سے ترجمے کے عمل میں آسانی فراہم ہو جائے گی۔

اردو میڈیا کے بیرونی جزیرے

اردو میڈیا کی تاریخ نئی نہیں ہے۔ ایک عرصے سے بیرونی ممالک سے اردو کے اخبارات و رسائل نکل رہے ہیں اور ریڈیو اسٹیشنوں سے اردو نشریات چل رہی ہیں۔ اب شارجہ ٹی وی پر اردو پروگرام بھی دکھائے جانے لگے ہیں جس کی وجہ سے یہ خلیجی ممالک کا سب سے مقبول ٹی وی چینل بن گیا ہے۔ بیرونی ممالک کے اردو اخبارات اتنے اچھے انداز میں نکل رہے ہیں کہ ان کو دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ پہلے اردو پرنٹ میڈیا نے لوگوں کو اپنا دیوانہ بنایا تھا اب لوگ الیکٹرانک اردو میڈیا کے بھی دیوانے ہو رہے ہیں۔ یہاں کچھ ملکوں میں اردو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے تعلق سے کچھ حقائق اور تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔

برطانیہ

1950 کے بعد جب ہندوستان اور پاکستان کا اردو داں طبقہ برطانیہ پہنچنا شروع ہوا تو اسی وقت سے اس طبقہ کے دل میں اخبارات و رسائل شائع کرنے کی خواہش رہی ہے جس کے نتیجے میں محمود ہاشمی نے 1961 میں برمنگھم سے ہفت روزہ مشرق نکالا، پھر ایشیا نکلا۔ اس شہر میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی اکثریت تھی اس لیے پہلے یہیں سے رسائل نکلے۔ ان دونوں اخباروں نے بقول رضا علی عابدی، سابق نیوز کاسٹر بی بی سی لندن، خوب دھومیں مچائیں اور دال، مسالے، گوشت اور سبزی کی تمام دکانوں میں ان کی کاپیاں رکھی رہتی تھیں اور لوگ ان کو قیمتاً خریدتے تھے۔ یہ اخبارات اشاعت اور تصاویر میں نہایت خوبصورت تھے۔ پھر لندن سے

اخبار وطن نکلا۔ اس میں تازہ ترین خبریں شائع ہوتی تھیں۔ پہلے ڈاک سے ایشیا کی خبریں جاتی تھیں پھر خبروں کی ترسیل تار کے ذریعے ہونے لگی۔ ابھی فیکس نہیں آیا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ اخبار وطن بہت خوبصورت اخبار تھا جو جدید طرز پر شائع ہو رہا تھا۔ پھر وہ دن آیا جب برطانیہ کی صحافت میں انقلاب آیا اور 1971 میں روزنامہ جنگ کی اشاعت شروع ہوئی۔ پھر یہ اخبار یورپ کے اور ملکوں میں پہنچنا شروع ہوا۔ اس کے بعد ایک اور روزنامہ ملت نکلا جو چھوٹے سائز کا تھا۔ بڑے پیمانے پر ایک شاندار اخبار غالباً آواز کے نام سے شائع ہوا جس کے وسائل بے انتہا تھے، شاندار دفتر، اعلیٰ ترین ذہن، قیصر تمکین وغیرہ اس میں ہو گئے لیکن ناکامی اس کے مقدر میں پہلے ہی دن سے لکھ دی گئی تھی، چل نہ سکا اور ناکام ہو گیا۔ کیونکہ جنگ کے آگے کسی اخبار کا چلنا مشکل تھا۔ اس کے بعد اب وہاں جنگ کے علاوہ دو روزنامے اور نکلتے ہیں۔ یہ روزنامہ نوائے وقت اور روزنامہ اوصاف ہیں۔ اب انٹرنیٹ نے برطانیہ کی صحافت میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ یہ اخبار لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد اور کراچی میں تیار ہوتے ہیں اور ایک بٹن دباتے ہی برطانیہ پہنچ جاتے ہیں۔ ہر چیز اسکرین پر بنتی ہے۔ ایک بٹن دباتے ہیں اور پرنٹر کے یہاں پہنچ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں مشین پر چھپنا شروع ہو جاتا ہے اور صبح سے پہلے پہلے بازار میں آ جاتا ہے۔ تو اب جنگ، نوائے وقت اور اوصاف تین روزنامے لندن سے شائع ہو رہے ہیں اور غالباً یورپ بھی بھیجے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کم سے کم دو بڑے ہفت روزے نکل رہے ہیں۔ پاکستان ٹائمز اور نیشن۔ یہ بھی بڑی تعداد میں پڑھے جاتے ہیں۔ 80 کے اواخر میں پہلا ماہ نامہ اردو ادب معین الدین شاہ نے ذاتی محنت، تن تنہا، خود ٹائپ کر کے، ذاتی خرچ پر، خود تقسیم و فروخت کرتے ہوئے تاحیات نکالا۔ اس میں بے حد عمدہ اور معیاری مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس کا غالب نمبر بے حد جامع اور یادگاری کارنامہ رہا جو یقیناً حوالہ جات کے لیے مثالی دستاویز کی طرح کام آتا رہے گا۔ 90 کے عشرے میں رسائل و جرائد کا سلسلہ چل نکلا۔ اس کے وسط میں ماہنامہ صدا کا اجرا ہوا اور اب تک جاری ہے۔ سہ ماہی سفیر اردو بھی اب تک پابندی سے نکل رہا ہے۔ 2000 میں اردو ٹرسٹ کا مجلّہ اس کی پہلی

کانفرنس کی روداد پر مشتمل اور 2001 میں یورپین اردو رائٹرس سوسائٹی کا مجلّہ اس کی روداد کی دستاویز اہم جریدے رہے۔ اسی اثنا میں ایک اور ماہنامہ پرواز کا اضافہ ہوا وہ بھی ابھی تک پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ایک اور ضخیم وخوش رنگ سہ ماہی شہرزاد شائع ہوا۔ بعد میں اردو تحریک عالمی کے دو ماہی اردو تحریک نے بھی اس کاروان صحافت کو آگے بڑھایا۔ اخبارات کا سلسلہ 80 کے اواخر اور 90 کے عشرے میں اور آگے بڑھا۔ 90 میں ہفت روزہ نیشن نکلا جو آگے چل کر 90 کے اواخر میں روزنامہ میں منتقل ہو گیا اور رواں دواں ہے۔ 90 کے وسط میں دو ہفت روزہ پاکستان پوسٹ اور نوائے وقت جاری ہوئے اور اچھی طرح چلتے آ رہے ہیں ہفت روزہ انصاف بھی روزنامہ میں تبدیل ہو کر شائقین کے ذوق صحافت کی آبیاری کر رہا ہے۔

برطانیہ میں الیکٹرانک اردو میڈیا کی نمائندگی بی بی سی کرتا ہے۔ یہ ایک سیاسی، معلوماتی، تعلیمی، تجزیاتی اور تفریحی پروگرام نشر کرنے والا دنیا کا ایک بڑا نشریاتی ادارہ ہے۔ اس کی اردو نشریات کا آغاز 1949 میں ہوا۔ یہ سروس انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ اسے www.bbcurdu.com پر کسی بھی وقت سنا جا سکتا ہے۔ بی بی سی کی اردو سروس کے پروگراموں میں خبریں، جہاں نما، حالات حاضرہ، سیربین، فیچر، سب رس، انجمن، میزان، سائنس کلب، کھیل کے میدان میں، شب نامہ، شاہین کلب، برگ گل، روشنی کا سفر، ستاروں کی محفل اور اہم سیاسی رہنماؤں، عالمی مدبرین اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ادبی و علمی شخصیات سے انٹرویو وغیرہ اردو نشریات کا اہم جزو ہیں۔

امریکہ

آج امریکہ کے متعدد شہروں میں بھی اردو صحافت کا اجالا پھیل گیا ہے اور کئی بڑے اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکہ میں اردو اخبارات اشتہاروں سے اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں اور مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ سید تقی عابدی کے مطابق آج سے تقریباً چالیس سال قبل امریکہ سے اردو کا پہلا اخبار شائع ہوا تھا۔ وہ دو ورقی

تھااوراس کا نام کریسنٹ تھا۔اس کے مالک ومدیرڈاکٹرمظفرشکوہ تھے۔انہوں نے چالیس یا پچاس کاپیاں نکالی تھی۔

اس وقت امریکہ کا جوسب سے بڑااردواخبار ہے وہ ہفت روزہ اردوٹائمز ہے۔اس نے 2005 میں اپنی سلورجوبلی منائی ہے یعنی 29 برسوں سے شائع ہورہاہے۔اس کے مالک ،مدیراورسرپرست خلیل الرحمان ہیں۔یہ امریکہ کا پہلااردواخبارہے جو92 برسوں سے مسلسل اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔یہ اخبارآج 14 شہروں سے شائع ہورہاہے۔دوسرااہم اخبار پاکستان پوسٹ ہے جو امریکہ کے علاوہ کناڈا سے بھی شائع ہوتا ہے۔ایک اوراخبار نکلتا تھا پاکستان بنک جواب بند ہو چکا ہے۔ان کے علاوہ ٹورنٹو ٹائمس ،کارواں، پاکیزہ اورآفاق جیسے اخبارات ورسائل بھی شائع ہوتے ہیں۔ان کے علاوہ سالانہ ادبی انجمنیں بھی اپنے جرائدشائع کرتی ہیں جن میں ادبی وثقافتی مضامین ہوتے ہیں۔کیلی فورنیا کی اردوانٹرنیشنل سوسائٹی ہرسال مشاعرے کرواتی ہےاوراس موقع پرایک عمدہ سامجلّہ بھی شائع کرتی ہے۔

خلیل الرحمٰن کے اخباراردوٹائمز کا مزیدذکرکرناضروری ہے کیونکہ اسے اس وقت امریکہ میں اردوصحافت کی قیادت کرنے کا شرف حاصل ہے۔اس سلسلے میں خلیل الرحمان بتاتے ہیں کہ یہ اخبار میں نے نہیں نکالا بلکہ ایک صاحب جن کا نام صابر جاوید تھا نکالا کرتے تھے، میں نے 1979 میں انگریزی اخبار ایشین نکالا تھا جب ایشین ٹائم بند ہواتو وہ میرے پاس آئے اور کہا کہ بھائی انگریزی صحافت کے ذریعے آپ اخبار چلا نہیں سکتے بلکہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد انگریزی سے زیادہ ہےاور میں تھک چکا ہوں یہ اخبارآپ لے لیں۔میں آپ کے ساتھ کام کروں گا اگرآپ مجھے تھوڑا بہت معاوضہ دیتے رہیں۔اس طرح اردوٹائمز میرے پاس آ گیااور جب میں نے اسے شروع کیا تو یہ پندرہ روزہ تھا۔اس وقت اخبارنام کی اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی۔چھوٹے چھوٹے فلائیرنکلا کرتے تھے۔کبھی نکلے،کبھی بند ہو گئے۔جب اردو ٹائمز کی پہلی کاپی ہم نے چھاپی جوآٹھ صفحوں کی ہوتی تھی۔کاتب جسے میں نے پاکستان سے منگوایا بہت اچھا نہیں تھا۔سرخیاں ہم ہاتھ سےفوٹو کاپی کو بڑا کرکے لگایا کرتے تھے۔میں تین

تین دن تک دفتر میں سوتا تھا اور آٹھ پیج کا اخبار جوڑنا میرے لیے عذاب بن جایا کرتا تھا۔ اخبار چھپنے کے بعد خود ہی بانٹا کرتا تھا اور میں سائیڈ میں اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار چلایا کرتا تھا جس سے میرے بچوں کی روزی روٹی چلتی تھی۔ بہرحال اس طرح سے پہلے اخبار نکالا۔ پھر کمپیوٹر آیا۔ 1989 میں پہلا سافٹ ویئر سُرخاب آیا جو 12 پوائنٹ تک اردو ٹائپ کرتا تھا۔ کمپیوٹر کی اسپیڈ اتنی کم تھی کہ ایک پیج کا میٹر ٹائپ کر کے ہم چائے پینے کے لیے چلے جایا کرتے تھے، چائے پی کے آتے تھے تو پرنٹ نکلا کرتا تھا۔

اس وقت میں امریکہ کے مختلف شہروں سے اخبار نکال رہا ہوں۔ پاکستان پوسٹ جو امریکہ کے اندر دوسرے نمبر پر ہے وہ صرف پانچ یا چھ شہروں تک پہنچتا ہے اور اردو ٹائمز 14 شہروں تک پہنچتا ہے۔ اس کے الگ الگ ایڈیشن ہیں، نیویارک الگ ہے، نیو جرسی الگ ہے، مری لینڈ کے اندر دو ایڈیشن ہیں۔ اٹلانٹا ہے، میامی، ڈیوپرائنڈ، شکاگو، ہوسٹن، کیلی فورنیا، مونٹریال اور ٹورنٹو سے بھی ایڈیشن نکلتا ہے اور اب لندن سے نکلنے والا ہے۔ پچھلے چار برسوں سے انٹرنیٹ پر اردو ٹائمز موجود ہے جس میں ڈیلی خبروں کو اپ لوڈ کیا جاتا ہے اور انٹرنیٹ پر اپنے کام کو بڑھانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ ادبی اور سماجی تنظیموں سے اردو ٹائمز کا بہت گہرا تعلق ہے۔ نیویارک میں جتنے مشاعرے ہوئے اور نیویارک میں جتنی تقریبات ہوئی ہیں اتنی کسی اور شہر میں نہیں۔ شکاگو، ہوسٹن، ایلیو بڑے بڑے شہر ہیں لیکن نیویارک ہمیشہ نمایاں رہا اور وہاں جتنے بھی ادبی و ثقافتی پروگرام ہوتے ہیں ان میں سے تقریباً 50% کو اردو ٹائمز اسپانسر کرتا رہا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا امریکہ میں بیشتر اخبارات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ یہ اردو اخبار چلانے والوں کا تقریباً متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ اردو اخبار فروخت نہیں کریں گے بلکہ مفت دیں گے۔ قابل ذکر بات یہ ہیکہ دو تین اخبارات کے علاوہ باقی سبھی خسارے میں چلتے ہیں۔ ہاں اردو ٹائمز اور پاکستان پوسٹ ضرور منافع میں ہیں۔ یہ اپنا خسارہ باہر سے پورا کرتے ہیں۔ نیویارک میٹرو پالیٹن علاقہ میں 1140 مراکز پر یہ اخبارات ملتے ہیں۔ ہوٹلوں اور

ریستورانوں میں بھی رکھے جاتے ہیں۔خلیل الرحمان کا عزم ہے کہ وہ لندن سے جو اخبار شروع کریں گے اسے بھی مفت تقسیم کریں گے۔شاید یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں اخبار جنگ اور نوائے وقت نہیں پہنچ سکے۔اخبار جنگ کے شکیل الرحمان نے امریکہ کا دورہ کر کے اس سلسلے میں پلاننگ کی مگران کا کہنا ہے کہ اخبار بیچنا چاہیے۔جبکہ اردو ٹائمز کے ذمہ دار بیچنے کے خلاف ہیں۔انہوں نے جان بوجھ کر مفت اخبار بانٹنے کا چلن شروع کیا ہے تا کہ جنگ اور نوائے وقت جیسے ادارے وہاں نہ پہنچ سکیں۔خلیل الرحمان کا کہنا ہے کہ اگر امریکہ میں پانچ ہزار خریدار پیدا ہو گئے تو ان دونوں اخباروں کو وہاں پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ان اخبارات کے ذمہ داران نے امریکہ میں اخبار بیچنے کے تعلق سے کمیٹیاں بھی بنائی ہیں مگر وہ ابھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں اور ایک طرح سے اخبار اردو ٹائمز نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔بہر حال یہی کیا کم ہے بلکہ بہت بڑی بات ہے کہ اخبارات اپنے خرچ خود پورے کرتے ہیں اور اردو داں طبقہ کو مفت میں اخبار حاصل ہو جاتے ہیں۔

یہ اخبار کمیونٹی اخبار سے بڑھ کر اپنے وقت کی ثقافتی اور معاشرتی دستاویز کی شکل اختیار کر چکا ہے۔آج اردو ٹائمز 20 سے 25 لاکھ امریکن، کینیڈین اور برطانوی مسلمانوں نیز اردو اسپیکنگ کمیونٹی کی آواز بن کر نہ صرف انہیں ایک دوسرے سے آگاہ رکھنے کا کام کر رہا ہے بلکہ ان کے ذریعہ روزگار کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں سہولیات اور معلومات بھی فراہم کر رہا ہے۔

تارکین وطن کے مسائل خواہ وہ معاشرت اور ثقافت سے تعلق رکھتے ہوں یا لسانیات اور نئے ملکی قوانین سے متعلق، خلیل الرحمٰن انہیں عوامی، سرکاری اور ذاتی سطح پر حل کرتے ہوئے پیش پیش نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اردو ٹائمز ہر مکتبہ فکر، مسلک اور مذہب کا اخبار محسوس ہوتا ہے۔اردو بولنے والے چاہے ان کا تعلق بنگلہ دیش سے ہو یا ہندوستان سے، پاکستان سے ہو یا مشرق وسطی سے، اردو ٹائمز پڑھنے کے دلدادہ اور شوقین نظر آتے ہیں۔جہاں اردو ٹائمز سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار بن چکا ہے وہاں وہ اپنے سے پہلے اور اپنے

وقت کے تمام اخباروں میں پہلا اخبار ہے جو نہ صرف مسلسل چھپ رہا ہے بلکہ مسلسل چھپنے کا ایک تاریخی ریکارڈ بھی قائم کر چکا ہے۔ اردو ٹائمز بیک وقت چودہ مختلف ریاستوں اور ملکوں سے چھپ کر کچھ ہی پلوں میں تارکین وطن کے ہر خاص و عام فرد تک پہنچ جاتا ہے۔

آن لاین اردو ٹائمز

اردو ٹائمز کو آن لاین ایڈیشن شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اردو ٹائمز ڈاٹ کام نہ صرف پرنٹڈ اخبار کی آن لاین فراہمی کو ممکن بنا رہا ہے بلکہ بہت سی دوسری خبروں اور معلومات کو بھی جن کا اردو قارئین کو مکمل علم نہیں ہوسکتا، پیش کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اردو ٹائمز ڈاٹ کام اگر چہ کوئی کمیونٹی سائٹ نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کا نصب العین اردو پڑھنے والوں کو بالعموم اور امریکن کمیونٹی کو بالخصوص ان تمام بین الاقوامی موضوعات سے آگاہ کرنا ہے جو کسی نہ کسی طرح یا تو کمیونٹی سے متعلق ہیں یا جن کا علم کمیونٹی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے۔ اردو ٹائمز ڈاٹ کام کا اصل مقصد تو تازہ ترین خبروں کی فراہمی ہے چاہے وہ کسی بھی شعبہ زندگی سے تعلق رکھتی ہوں لیکن اپنے پڑھنے والوں کو جدید مسائل پر جاری بحثوں سے مطلع رکھنا اور ان بحثوں پر قارئین کی آرا کو ایک دوسرے تک پہنچانا بھی اس کی ترجیحات میں شامل ہے۔ اردو ٹائمز ڈاٹ کام ہر عمر اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایسی سائٹ ہے جو نہ صرف ان سب کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے بلکہ ایک دوسرے کی بہتر سمجھ بوجھ اور ان کے خیالات کو ایک دوسرے تک پہنچانے میں بھی اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔

اردو ٹائمز ڈاٹ کام کا دوسرا مقصد 14 سے زیادہ ملکوں یا ریاستوں میں بیورو آفس چلانے والے اردو ٹائمز کے بیورو چیفز کو مرکزیت فراہم کرنا بھی ہے۔ اردو ٹائمز ڈاٹ کام کے قارئین نہ صرف اردو ٹائمز کے بیورو چیفز کو انفرادی طور پر جان سکتے ہیں بلکہ ان کے اپنے اپنے دفاتر سے پرنٹ ہونے والے اخبارات پڑھ بھی سکتے ہیں اور وہاں کے مسائل

سے روشناس بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اردو ٹائمز ڈاٹ کام اپنے پڑھنے والوں کو دنیا کے بہت بڑے حصے کے مسائل اور ترجیحات کو ایک ہی جگہ مہیا کرتا ہے چاہے سماجی اور ثقافتی تقریبات ہوں یا کمیونٹی کی مشترکہ بحثیں اردو ٹائمز ڈاٹ کام ہر شعبے اور ہر پہلو کی بروقت اور مکمل معلومات پہنچانے کا اعزاز رکھتا ہے۔

اردو ٹائمز کے ایک ذمے دار کا کہنا ہے کہ اردو ٹائمز ڈاٹ کام کو اس حقیقت کا مکمل ادراک ہے کہ فرد واحد کے مسائل اور خیالات کسی نہ کسی سطح پر کمیونٹی نہیں تو اس جیسے بہت سے دوسرے افراد کے مسائل اور خیالات کی طرح ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک شخص کے خیالات اور دلچسپیاں بے شمار لوگوں کے خیالات اور دلچسپیوں سے مل جل کر ایک بہت بڑی کمیونٹی کے خیالات اور دلچسپیاں بن جاتی ہیں۔

وائس آف امریکہ

وائس آف امریکہ ایک سرکاری نشریاتی ادارہ ہے جہاں سے چوبیس گھنٹے میں 65 زبانوں میں پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ وائس آف امریکہ نے اپنی نشریات کا آغاز 1943 میں کیا اور غیر ملکی زبانوں کے شعبہ اردو نے 1951 میں اپنے پروگرام پیش کرنا شروع کیے۔ وائس آف امریکہ سے اردو سامعین کے لیے ہر روز مسلسل بارہ گھنٹے کی نشریات پیش کی جاتی ہیں جو ہندوستانی وقت کے مطابق شام ساڑھے سات بجے سے صبح ساڑھے سات بجے تک مسلسل چلتی رہتی ہیں۔ یہ سروس انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے اور اسے کسی بھی وقت voanews.com\urdu پر سنا جا سکتا ہے۔

کینیڈا

کینیڈا میں اردو کا پہلا رسالہ 'صہبا' حفظ الکبیر قریشی نے شائع کیا جو 1968 میں پہلی بار منظر عام پر آیا۔ بعد ازاں پاکیزہ، الہلال، امروز، پیغامبر اور ملاقات نے صحافت میں قدم

رکھا۔ ان ہفتہ واروں میں سے اب صرف پاکیزہ باقی ہے۔ اسے صبیح الدین منصور گزشتہ تیس سال سے پابندی سے نکال رہے ہیں۔ گزشتہ دس بارہ سالوں میں ٹورنٹو اردو روزناموں اور جرائد کا مرکز بن چکا ہے آج کل پاکیزہ کے علاوہ پاکستان اسٹار، اردو ٹائمز، عوام، کارواں، اخبار پاکستان، سنڈے ٹائمز، پاکستان ٹائمز، ایسٹرن نیوز، صداقت، آفاق، پاکستان پوسٹ، ٹورنٹو ٹائمز اردو کے اخبارات ہیں جو پابندی کے ساتھ ہر ہفتہ شائع ہوتے ہیں۔ اردو میں ریڈیو کے پروگرام صدائے پاکستان، ریڈیو پاکستان، ساز آواز، ریڈیو کارواں، اور سن شائن کے ناموں سے ہر ہفتہ مختلف دنوں اور اوقات میں اپنی نشریات پیش کرتے ہیں۔ ٹی وی کے پرگراموں میں وژن آف پاکستان، دل دل پاکستان اردو کے ہفتہ وار پروگرام ہوتے ہیں اور سرساگر، اور ATN جن کا پروگرام چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے، مشہور شاعر اور صحافی تسلیم الٰہی زلفی اور اشفاق حسین پیش کرتے ہیں۔ سرساگر سکھوں کا پنجابی اسٹیشن ہے لیکن اس میں زلفی صاحب ہر روز چار گھنٹے اردو کے معیاری پروگراموں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ATN پر اشفاق حسن مجالس، تقریر، مشاعرے، گفتگو اور ڈرامے پیش کرتے ہیں۔

عرصہ قبل دو سہ ماہی انتہائی معیاری اور نگارشات سے بھرپور جرائد ٹورنٹو اور انووا سے نکالے گئے تھے۔ وہ اشفاق حسین کا اردو انٹرنیشنل اور ولی عالم شاہین کا Urdu Canada تھے۔ یہ دونوں انگریزی زبان میں ہوتے تھے۔ دونوں جرائد میں صف اول کے مصنفین اور شعرا کا کلام ہوتا تھا اور ان کا ہر لحاظ اور زاویے سے برصغیر کے گرانقدر مجلوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔

کینیڈا اور امریکہ کے کئی شہروں میں سنی جانے والی غیر ملکی نشریات کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں قائم ریڈیو چن انٹرنیشنل سے پیش کی جاتی ہیں۔ ریڈیو چن انٹرنیشنل کے اردو شعبہ نے تقریباً 32 سال قبل کام شروع کیا اور ان نشریات کو ''وائس آف پاکستان'' کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ کینیڈا دنیا کا شاید پہلا غیر اسلامی ملک ہے جہاں سے ریڈیو چن انٹرنیشنل کے ذریعہ رمضان شریف میں مسلمانوں کے لیے ہر روز سحری کا خصوصی پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ اس پروگرام کا آغاز بھی 1986 میں آدھے گھنٹے کی نشریات سے ہوا اور بعد ازاں مقبولیت کو

دیکھتے ہوئے اس پروگرام کا دورانیہ بڑھا کر ایک گھنٹہ کر دیا گیا۔

چین

چائنا ریڈیو انٹرنیشنل کو قائم ہوئے 38 سال ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن اردو سروس کے آغاز سے ہی ریڈیو چین کے سامعین کے درمیان دوستی کا جو رشتہ قائم ہوا ہے وہ آج تک جاری ہے۔ سامعین کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے علاوہ چین میں اردو کی مقبولیت دیکھ کر وہاں سے ایک اردو اخبار اور ایک اردو رسالہ نوائے دوستی کے نام سے نکل رہا ہے۔ یہ اخبار چین کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کو اردو دنیا سے متعارف کرانے میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔

ماریشس

ماریشس میں بھی مقامی ریڈیو سے اردو نشریات کا سلسلہ جاری ہے اور یومیہ ڈھائی گھنٹے کا وقت مخصوص ہے۔ مقامی ٹی وی پر بھی اردو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں اور نعت خوانی وقوالی وغیرہ کے پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ اردو اسٹیشن یونین کے قیام کے بعد ماریشس سے ایک ماہنامہ اخبار صدائے اردو بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

خلیجی ممالک

خلیجی ممالک سے بڑی تعداد میں اردو اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں جن میں اردو کا سب سے بڑا اخبار روزنامہ اردو نیوز ہے جس کی اشاعت یومیہ پچاس ہزار ہے۔ اس کے علاوہ کویت ٹائمز جدہ الخلیج، عرب ٹائمز، قطر سے گلف ٹائمز، سعودی عربیہ سے المدینہ اردو، اور الریاض یومیہ قابل ذکر ہیں۔ خلیجی ممالک کے ریڈیو اور ٹی وی سے اردو پروگرام کے ذریعہ بھی اردو کو عام کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔ لوگ باگ اپنے خطے کی خبروں میں

اشتیاق کے باعث آل انڈیا ریڈیو، ریڈیو پاکستان، ریڈیو سیلون، بی بی سی، وائس آف جرمنی اور وائس آف امریکہ کی نشریات شوق سے سنتے ہیں۔ شارجہ ٹی وی نے جب سے اردو نشریات کا آغاز کیا ہے خلیجی ممالک کا سب سے مقبول ٹی وی چینل بن گیا ہے۔ جس کی پیروی میں خلیج کے کئی ٹی وی چینل اردو نشریات کا دورانیہ بڑھا رہے ہیں۔ المدینہ اردو ایام حج میں بڑی تعداد میں شائع ہوتا ہے اور ان دنوں میں اس کی اشاعت چالیس ہزار سے ایک لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ جدہ سے نسیم سحر کی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ سیماب شائع ہوتا ہے، ادھر کویت میں کویت ٹائمز اردو صحافت کے ذریعہ اردو کو فروغ دے رہا ہے۔

ناروے

ناروے میں 1972 میں اردو پہنچی اور اخبارات کی اشاعت پمفلٹ سے شروع ہوئی۔ بعد میں صدائے پاکستان، اخبار پاکستان، نوائے پاک، ندائے پاکستان، جہاد اور آواز شائع ہوئے۔ 1979 میں ایک پندرہ روزہ سفیر شائع ہوا۔ ایک ہفت روزہ اخبار پاکستان نیوز، ناروے کے ایک اور بڑے شہر ستوانگر سے شائع ہوا۔ رفیق چودھری نے جون 1978 میں اردو زبان میں پردیس کے نام سے ماہوار رسالے کا اجرا کیا مگر بوجوہ اس کا دوسرا شمارہ شائع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ یہ چالیس صفحات پر مشتمل ہاتھ سے لکھا ہوا پرچہ تھا۔ ایک ماہانہ رسالہ انٹرنیشنلسٹ اور بازگشت کی اشاعت ہوئی۔ 1992 میں بازگشت کا ایک ضخیم ادبی نمبر بھی شائع ہوا۔ 462 صفحات کے اس مجلّے میں پاکستان، ہندوستان اور دنیا کے دیگر ممالک میں بسنے والے اردو کے اہل قلم کی نمائندہ تخلیقات پیش کی گئی ہیں۔ اوسلو ناروے سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا اردو کا ایک اور ماہوار رسالہ کارواں شروع ہوا۔ بعد میں سہ ماہی بوٹیکا، پیام مشرق کلچر اور روزن رسالے بھی نکلے۔

باب سوم

میڈیا اور مسلم معاملات

میڈیا کی مسلم صورت گری

اب یہ بات دوسرے لوگ بھی کہنے لگے ہیں کہ میڈیا نے مسلمانوں کی ایسی صورت گری کی ہے جو حقیقت سے کافی بعید ہے۔ وہ مسلمانوں کی مثبت شبیہ پیش کرنے کے بجائے ایسی شبیہ پیش کرتا ہے جو منفی ہے اور جس کا مسلمانوں کے اصل کردار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب غیر مسلم قلمکاروں کے قلم بھی یہ بات لکھنے لگے ہیں کہ میڈیا مسلمانوں کی امیج کو خراب کرنے کی منظّم کوشش کرتا ہے اور اس کی بدولت مسلمان ایک جاہل، غیر مہذب، متشدد، عدم رواداراور جرائم پسند قوم کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ میڈیا کے ذمے داران خود اب یہ بات کہہ رہے ہیں۔ تاہم وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی ذمے داری جہاں میڈیا پر عائد ہوتی ہے وہیں مسلمان بھی اس سے بچ نہیں سکتے۔

بہر حال اس بات کا اظہار گذشتہ دنوں انسانی حقوق کی ایک غیر سرکاری تنظیم ’انہد‘ کی ایک تین روزہ کانفرنس میں بھی ہوا جو ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کے جائزے کے لئے دہلی میں بلائی گئی تھی۔ اس میں انسانی حقوق کے کارکنوں کے علاوہ متعدد ریاستوں سے ان مسلمانوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جو سرکاری دہشت گردی کے شکار ہیں اور جو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ انسانی حقوق کے کارکن اور سابق آئی اے ایس افسر ہرش مندر، صحافی شیش نارائن، جاوید نقوی، سہیل ہاشمی اور دوسرے لوگوں نے اپنے اس تجربے پر روشنی ڈالی کہ میڈیا نے مسلمانوں کی شبیہ سازی میں انتہائی بے ایمانی سے کام لیا ہے اور فلموں نے اس سلسلے میں خاص رول ادا کیا ہے۔ فلموں میں مسلمانوں کو

ایسے کرداروں میں دکھایا جاتا ہے جو حقیقت سے پرے ہوتے ہیں۔ان کو اونچے پائجامے، داڑھی اور گول ٹوپی میں دکھایا جائے گا اور وہ یا تو جہادی ہوں گے یا دہشت گرد۔ان میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی اور اسمگلنگ، جرائم پسندی، خون خرابہ اور انسانیت کشی ان کے پسندیدہ کھیل ہوں گے۔وہ یا تو مافیا ڈان ہوں گے یا اکثریت کے ہندو ہیرو کے لئے اپنی جان دینے والے ہوں گے۔ان فلموں میں تعلیم یافتہ مسلمان خال خال ہی نظر آئیں گے۔ایسے مسلمانوں کا کردار کہیں نہیں دکھائی دے گا جو تعلیم یافتہ ہوں، پروفیشنل ہوں یا جو گندی بستیوں میں رہنے کے بجائے اعلی سوسائٹی میں رہنے کو ترجیح دیتے ہوں۔اس کانفرنس میں شامل مقررین کے مطابق فلموں نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ مسلمان اپنی آواز اٹھانے اور انہیں آگے بڑھانے کے لئے سیکولر ہندوؤں کے محتاج ہو گئے ہیں۔اگر سیکولر ہندو ان کی آواز بلند نہ کریں تو ان کی آواز کہیں سنائی نہیں دے گی۔گویا مسلمانوں کی اکثریت سیکولر آوازوں کے رحم و کرم پر ہے۔

کانفرنس میں فلموں کے ساتھ ساتھ میڈیا کے رول کا بھی جائزہ لیا گیا اور الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں مسلمانوں کی امیج اور شبیہ کو پرکھنے کی کوشش کی گئی۔مقررین نے اس بات کو شدت سے نوٹ کیا کہ میڈیا مسلمانوں کے بارے میں اپنی رپورٹنگ میں تعصب سے کام لیتا ہے اور ان کے معاملات کی رپورٹنگ میں انتہائی ہتک آمیز رویہ اختیار کرتا ہے۔اگر کوئی ہندو متاثر ہے تو رپورٹ کا انداز دوسرا ہوگا اور مسلمان ہے تو دوسرا۔ہندوؤں کے معاملات کر رپورٹنگ کے سلسلے میں باعزت انداز اختیار کیا جائے گا اور مسلمانوں کے ساتھ ذلت آمیز۔

اس مباحثے کے شرکا نے مسلمانوں کو درپیش دیگر مسائل کا بھی جائزہ لیا اور مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز مہم کو بے نقاب کیا۔اس کے علاوہ مسلمانوں کی شناخت، مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی صورت حال، میڈیا کے ذریعے بنائی گئی مسلم امیج، قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک، وقف

املاک کی بد انتظامی، قبرستانوں کے سلسلے میں حکومتوں کے رویے اور حکومتی اداروں کی جانب سے مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت میں امتیازی سلوک جیسے متعدد امور زیر بحث آئے۔ اس مباحثے میں دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویے اور بلا وجہ ان کو نشانہ بنانے کے واقعات پر بھی بحث کی گئی۔ فرقہ وارانہ تنازعات میں انتظامیہ اور پولیس کی جانبداری اور گجرات اور بی جے پی حکومت والی ریاستوں میں مسلمانوں کی ابتر صورت حال کو جاننے کی بھی کوشش کی گئی۔

بعض مقررین نے اس پر بھی روشنی ڈالی کہ کس طرح سنگھ پریوار سے وابستہ جرائم اور سنگھیوں کی مسلم دشمنی کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور گؤکشی کی آڑ میں کس طرح بے قصور مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ فسادات یا قدرتی آفات کے بعد باز آبادکاری اور ریلیف کے کاموں کے دوران مسلمانوں کے ساتھ امتیازی رویے اور ان کی اقتصادی ناکہ بندی جیسے ایشوز پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ گجرات اور گوا کے بعض علاقوں میں قبرستانوں پر قبضے کر لئے گئے ہیں اور اگر مسلمان قبرستانوں کا مطالبہ کرتے ہیں تو انہیں ان کے علاقے سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ گجرات، مہاراشٹرا، کرناٹک، راجستھان، مدھیہ پردیش اور اتر پردیش میں گؤکشی کے نام پر متعدد بے قصور مسلمانوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ گؤکشی جیسے جذباتی ایشو کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی اور فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کا ایک بہانہ بنا لیا گیا ہے۔

کئی مقررین نے انکشاف کیا کہ کئی ریاستوں میں مسلمانوں کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی گئی ہے اور انتظامیہ کی جانب سے بھی یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ان کو ملک کی اقتصادی ترقی کے فوائد حاصل نہ ہوں۔ مسلمانوں کو جان بوجھ کر تعلیمی میدان میں پیچھے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مسلم علاقوں میں واقع سرکاری تعلیمی اداروں کو ان کی آبادیوں سے دور منتقل کرنے کا سلسلہ بھی چل رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں مسلم لڑکیوں کی تعلیمی صورت حال ابتر ہوگئی ہے۔

بنگلور کے انسانی حقوق کے ایک کارکن نے بتایا کہ وہاں مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز مہم چلائی جا رہی ہے۔ مختلف فرقوں کے طلبہ اور طالبات کو ایک دوسرے سے ملنا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور اخلاقیات کے نام پر مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے۔ معروف قانون داں ورندا گروور کے خیال میں اگر فرقہ وارانہ تشدد میں پولیس افسران ملوث ہیں تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔ ان کا کہنا ہے کہ فرقہ پرستی کی آڑ میں لوگوں کو نشانہ بنانے کے واقعات کو بھی فرقہ پرستی کے ضمن میں لایا جانا چاہئے۔

ہرش مندر نے مسلمانوں میں موجود عدم تحفظ اور خوف و دہشت کے ماحول پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پولیس اور عدلیہ کی جانب سے مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا جاتا اور سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ خاص طور پر میڈیا بھی ان کے ساتھ تعصب اور جانبداری سے کام لیتا ہے۔ ان کے خیال میں دہشت گردی کے مقابلے کے نام پر جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے یا کر دی گئی ہے وہ انتہائی تشویش ناک ہے اور صرف گجرات ہی میں نہیں بلکہ دوسری ریاستوں میں بھی ایسے مسلمانوں کو پولیس غیر قانونی طور پر اٹھا لیتی ہے جن کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ نہیں ہوتا۔ ایسے نوجوانوں کو کئی دنوں تک فارم ہاوسوں میں رکھا جاتا ہے، ان کو ٹارچر کیا جاتا ہے، ان پر نا کردہ جرائم کو قبول کر لینے کا دباؤ ڈالا جاتا ہے اور پھر ان کی گرفتاری دکھا دی جاتی ہے اور ان پر تیس تیس چالیس چالیس مقدمات لاد دیے جاتے ہیں۔

گجرات کی بی بی خاتون، صالحہ خاتون، شازیہ بانو، زیب النسا قاضی اور مسرت جہاں وغیرہ نے اپنی روداد الم سنائی اور خاص طور پر عشرت جہاں کی بہن مسرت جہاں نے بتایا کہ کس طرح عشرت کو مارنے کے بعد ان لوگوں کی زندگی جہنم بنا دی گئی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح عشرت جہاں گھر کی مالی دشواریوں پر قابو پانے کے لئے سخت جد و جہد کر رہی تھی مگر اسے دہشت گرد بتا کر مار دیا گیا جبکہ اس کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا ہندوستان میں مسلمان ہونا جرم ہے۔

شاہنواز عالم اور راجیو یادو نے بتایا کہ اتر پردیش میں دہشت گردی کے خاتمے کے

نام پر جو آپریشن چلایا جا رہا ہے وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ گجرات میں چلایا جا رہا ہے۔ جبکہ یوسف شیخ نے جو کہ بڑودہ سے تعلق رکھتے ہیں بتایا کہ اب وہاں ایک نیا طریقہ اختیار کر لیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کو ان کے گھروں سے اٹھا لیا جاتا ہے اور پھر ان کو ٹارچر کر کے اعتراف کروایا جاتا ہے کہ وہ دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور پھر ان کی گرفتاری دکھا دی جاتی ہے۔ آندھرا پردیش کے ایک صحافی ابو ظفر کے مطابق 1997 سے 2007 کے دوران یعنی دس برسوں کے بیچ ریاست میں اٹھارہ ہزار انکاونٹر کئے گئے ہیں۔ ابوظفر کے بھائی کو بھی گرفتار کیا گیا ہے اور اس سے ملاقات کی پاداش میں پولیس نے ابوظفر کو بھی جیل میں ڈال دیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اپنی گرفتاری کے بعد انھوں نے قومی انسانی حقوق کمیشن کو اس سلسلے میں لکھا لیکن ان کی بات کو سنا ان سنا کر دیا گیا۔ انھوں نے یہاں تک بتایا کہ جیلوں میں بھی ناانصافی سے کام لیا جاتا ہے۔ سابرمتی جیل میں مسلم قیدیوں کو اردو میں خط لکھنے کی اجازت نہیں ہے اور انہیں عید کی نماز بھی ادا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

حیدرآباد کی مکہ مسجد دھماکہ کیس کے وکیل شفیق رحمان مہاجر کے مطابق پولیس نے لوگوں کے خلاف تشدد برپا کرنے کا جو الزام مسلم نوجوانوں پر لگایا ہے اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اگر کہیں مسلمانوں کی جانب سے کوئی احتجاج کیا جاتا ہے اور کسی مسجد سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا جاتا ہے تو ان کو دہشت گرد بتا کر گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ انہوں نے ریاستی حکومت کی جانب سے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک پر کھل کر اظہار خیال کیا۔

اسی طرح مالیگاؤں کے نہال احمد نے بتایا کہ وہاں بم دھماکوں کے سلسلے میں ایک ہی طریقہ اختیار کیا گیا یعنی سب کے سب جمعہ کی نماز کے دوران ہوئے اور پھر مسلم نوجوانوں کو ہی گرفتار کیا گیا۔ جبکہ دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ابرار احمد کے بڑے بھائی جلیل احمد نے انکشاف کیا کہ اس کے بھائی کی گرفتاری میں کس طرح قانون کا مذاق

اڑایا گیا۔

اس تین روزہ کانفرنس کے اختتام پر حکومت کے سامنے سفارشات پیش کی گئیں جن میں ملک میں انصاف کی بالادستی کے لئے متعدد باتیں رکھی گئیں۔اس کانفرنس میں جیوری کے ممبران میں احمد سعید ملیح آبادی، اصغر علی انجینئر، ایڈمرل رام داس، کولن گونزالویز، گگن سیٹھی، گھنشیام سنگھ، حنیف لکڑاوالا، ہرش مندر، کویتا سریواستو، مہیش بھٹ، پرشانت بھوشن، رام پنیانی، ظفر آغا، زاہد علی خان، زویا حسن اور ترون تیج پال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کانفرنس کی فائنڈنگس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آج ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت دوسرے درجے کے شہریوں جیسی ہے اور اس کے لئے حکومت اور سرکاری مشینری بھی پوری طرح ذمے دار ہے۔اس کے علاوہ مسلمانوں کے اذیت ناک شب وروز کے لئے میڈیا بھی بڑی حد تک ذمے دار ہے۔وہ مسلمانوں کی ایسی صورت گری کرتا ہے جو ان کو مجرم ثابت کرنے میں معاون ہو۔میڈیا کی جانب سے حقائق کا پتہ لگانے کے بجائے پولیس کے بیانات کو سچ مان لیا جاتا ہے اور اس سے پہلے کہ مسلم نوجوانوں پر عائد کئے جانے والے الزامات کو عدالت میں ثابت کیا جا سکے، میڈیا انہیں مجرم بنا کر پیش کرتا ہے اور ان کی گرفتاری پر ایسی زبان میں رپورٹنگ کرتا ہے کہ عام اور سادہ لوح ناظرین ان کو انتہائی خطرناک دہشت گرد اور انسانیت کے دشمن مان لیتے ہیں۔میڈیا پولیس کے بیانات کی روشنی میں گرفتار شدگان کے خلاف ایسی مہم چلاتا ہے کہ پکڑے جانے والے بعض اوقات خود بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہوں گے کہ واقعی وہ دہشت گرد اور جرائم پیشہ ہیں۔ان کی آڑ میں وہ پورے مسلم فرقہ کو نشانہ بناتے ہیں اور ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ ان کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت اور خوشگوار حقیقت ہے کہ پورا کا پورا میڈیا ایسا نہیں ہے۔اس تاریک سرنگ میں کہیں کہیں روشنی کی کرنیں بھی نظر آتی ہیں اور متعصب اور تنگ ذہن صحافیوں کے درمیان انصاف پسند اور وسیع القلب صحافیوں کی موجودگی بھی

دکھائی دیتی ہے۔ دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو میڈیا کی آبرو بچائے ہوئے ہیں اور جو ناانصافی کے اس طوفان میں چراغ راہ گزر کا کام کر رہے ہیں۔ خود اس کانفرنس کے حوالے سے بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ جہاں اس کانفرنس کی بہت کم کوریج الیکٹرانک میڈیا میں ہوئی وہیں پرنٹ میڈیا میں اس کی قدرے اچھی کوریج ہوئی اور ویب سائٹوں پر تو پوری فراخ دلی کے ساتھ اس کی رپورٹیں پیش کی گئیں۔ یہ صورت حال ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ایک طرف اگر میڈیا ہی مسلمانوں کی منفی صورت گری کرتا ہے تو دوسری طرف میڈیا ہی کا ایک طبقہ ایسے لوگوں کو بے نقاب بھی کرتا ہے اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں کے تار و پود کو بکھیرتا ہے۔ جب تک میڈیا میں یہ انصاف پسند طبقہ موجود ہے مسلم مخالف سازشیں کامیاب نہیں ہو سکتیں اور میڈیا کی آبرو خاک آلود نہیں ہو سکتی۔

قومی میڈیا اور مسلمان

(کچھ غیر مسلم صحافیوں کی نظر میں)

اس بات پر اکثر و بیشتر بحث ہوتی ہے کہ کیا قومی میڈیا مسلم مخالف ہے اور کیا وہ عمداً مسلمانوں کی مسخ شدہ تصویر بناتا ہے۔ کیا وہ تمام مسلمانوں کو خواہ وہ خواندہ ہوں یا ناخواندہ ایک ہی ڈنڈے سے ہانکتا ہے اور کیا اسے مسلمانوں کے مسائل سے بس اسی قدر دلچسپی ہے کہ وہ ان کی آڑ میں ان کی اسٹیریوٹائپ امیج پیش کرے؟

ان سوالات پر ہونے والی بحث کے شرکاء عموماً اپنے طے شدہ نظرئے کی روشنی میں اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوشش دونوں فریقوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ ادیب اور صحافی اطہر فاروقی کی حال ہی میں منظر عام پر آئی انگریزی کتاب 'مسلمس اینڈ میڈیا امیجز' (Muslims And Media Imajes) اس سلسلے میں صورت حال کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوگی۔ یہ کتاب ایسے سوالات کا گہرائی میں جا کر جائزہ لیتی ہے اور ان سے متعلق ضمنی سوالات کو بھی ٹٹولنے اور ان کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اطہر فاروقی چونکہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہیں اور کسی بھی مسئلے کو تعصب کی عینک لگا کر دیکھنے کے بجائے معروضی انداز میں سوچتے اور تحقیقی زاویہ نظر سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لئے انھوں نے اس موضوع پر کسی ایک حلقے کی رائے جاننے کے بجائے ایسے لوگوں کی خدمات

حاصل کی ہیں جو ایک تو میڈیا کے گہرے سمندر کے شناور ہیں اور دوسرے یہ کہ اس مسئلے کے دونوں پہلوؤں کے راز دار ہیں۔

ونود مہتہ

انگریزی صحافی اور ہفت روزہ ’آوٹ لک‘ کے چیف ایڈیٹر ونود مہتہ نے انگریزی میڈیا پر مسلمانوں کی جانب سے عائد کئے جانے والے الزامات کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا ہے اور جہاں ان الزامات میں انہیں بہت حد تک صداقت نظر آتی ہے وہیں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ مسلمان انگریزی میڈیا کی مجبوری نہیں سمجھتے۔ان کے خیال میں میڈیا بزنس مینوں کے ہاتھ میں ہے اور بزنس مین مالی مفاد پر نظر رکھتا ہے۔انہوں نے میڈیا میں مسلمانوں کی خراب شبیہ کے لئے دونوں کو مورد الزام ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ انگریزی میڈیا مسلم مسائل سے لاعلم ہے اور وہ مسلمانوں کے حقیقی نمائندوں تک نہیں پہنچ پاتا۔صحافیوں کا طبقہ ایک کاہل طبقہ ہے اور وہ لوگوں کے خیالات جاننے اور ان کی ساؤنڈ بائٹ لینے کے لئے زیادہ محنت کرنا نہیں چاہتا۔انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ جب جامع مسجد کے امام آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں تو میڈیا کا نمائندہ زیادہ محنت کیوں کرے گا اور حقیقی مسلم نمائندوں کی تلاش میں کیوں بھاگے گا۔میڈیا میں مسلم شبیہ کے لئے وہ مسلمانوں کو بھی ذمے دار مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ خود انگریزی میڈیا تک رسائی حاصل نہیں کرتے۔انہوں نے نام نہاد مسلم قیادت کو بھی قصوروار مانا ہے۔

ونود مہتہ کے مطابق میڈیا میں گلا کاٹ مقابلہ آرائی ہے اور یہ مقابلہ آرائی صابن یا آئس کریم فروخت کرنے کے مقابلے سے کہیں زیادہ ہے۔میڈیا کی بہت زیادہ موجودگی بھی ایک مسئلہ ہے۔واشنگٹن یا نیویارک میں آپ کو کوئی ایک ہی بڑا انگریزی روزنامہ ملے گا جبکہ دہلی میں بارہ بڑے روزانہ اخبارات ہیں اور چھوٹے اخبارات کی کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔لہذا مسلمانوں کے معاملات سمیت دوسرے معاملات کے بارے میں بھی اسی تناظر

میں سوچنا ہوگا۔انہوں نے مسلمانوں کی جانب سے لگائے جانے والے کئی الزامات کو صحیح قرار دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جس طرح مولانا بخاری کو میڈیا زیادہ جگہ دیتا ہے اسی طرح سیکولر ہندوؤں کے مقابلے میں پروین توگڑیا جیسے لوگوں کو بھی زیادہ جگہ دیتا ہے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ میڈیا والوں کو لبرل مسلمانوں کے خیالات جاننے میں دشواری ہوتی ہے۔وہ آسانی سے ہاتھ نہیں آتے۔وہ کہتے ہیں کہ ملک میں سولہ کروڑ مسلمان ہیں مگر ان کے ترجمان کے طور پر بہت کم لوگ ملتے ہیں اور اگر متنوع آواز سننے کو ملے تو ہم ان میں سے مسلمانوں کی نمائندہ آواز کا انتخاب کر سکتے ہیں۔جب بھی کوئی موقع آتا ہے تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔لبرل مسلمان نہیں ملتے۔ہمیں مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے اداروں کے علما سے ہی بات کرنی پڑتی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ملک میں مسلمانوں کے اصل مسائل سے بحث نہیں ہو پاتی۔مسلمانوں کو بھی اپنا احتساب کرنا چاہئے کہ کون سی آواز ان کی نمائندہ آواز ہے۔ونود مہتہ کہتے ہیں کہ ایڈیٹر کے پاس صرف مسلمانوں کا ہی مسئلہ نہیں ہوتا، اس کے سامنے ملک کے ہزاروں مسائل ہوتے ہیں۔اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے۔اور پھر جب میڈیا ایک بزنس ہے تو اسے وہی چیز بازار میں رکھنی ہوگی جو بک سکے۔اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہی ایک پلیٹ فارم ہے جو آپ کی آواز کو دنیا میں پہنچا سکتا ہے۔

کیا انگریزی میڈیا مسلمانوں سے تعصب رکھتا ہے؟ وہ اس سوال کا نفی میں جواب دیتے ہیں۔تاہم ان کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میڈیا مسلمانوں کی مسخ شدہ شبیہ پیش کرتا ہے۔لیکن اس پر بحث ہونی چاہئے کہ ایسا کیوں ہے۔مسلمان بھی اس بحث میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔انگریزی میڈیا ایسا کیوں ہے اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ مسلم معاشرے کی جدید کاری اور ان کی سوچ میں بدلاؤ سے حالات میں تبدیلی آئے گی۔مسلمانوں کو خود اس سلسلے میں کوشش کرنی ہوگی۔مسلمانوں کو انگریزی میڈیا اور دوسرے فرقوں کے ساتھ اپنے ربط ضبط کو بڑھانا ہوگا۔انگلش میڈیا بھی مسلمانوں کے ساتھ

زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ وہ صرف طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتا ہے عام مسلمانوں سے نہیں۔ جبکہ یہ طبقہ خود ہی عام مسلمانوں سے کٹا ہوا ہے اور مسلمانوں کا ٹھیکیدار بھی بنا ہوا ہے۔

وہ مسلمانوں کی نئی نسل کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ تعلیم مرکوز ذہنیت رکھتی ہے اور وہ مقابلہ جاتی مارکیٹ میں داخل ہوگئی ہے۔ لیکن یہاں ایک منفی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ تعلیم یافتہ مسلمان قائد بننے کی لالچ میں پڑ جاتے ہیں اور عام مسلمانوں کی سیاست کرنے لگ جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلم طبقے میں آنے والی تبدیلی رک جاتی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ حکومتوں نے مسلمانوں کی عام فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہیں کیا ہے۔ تقسیم کے بعد اور 1980 تک مسلم قیادت ہی اس کی ذمے دار رہی ہے۔ وہ تقسیم کے بعد پیدا شدہ صورت حال کا مقابلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن میرا سوال یہ ہے کہ خاص کر شمالی ہند میں مسلمان صرف جذباتی ایشوز تک کیوں خود کو محدود رکھتے ہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد انھوں نے عام مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ میں یہ سوال بھی کرنا چاہوں گا کہ مسلمان صرف مدرسے ہی کیوں قائم کرتے ہیں، وہ اپنے بل بوتے پر سیکولر تعلیمی اداروں کے قیام کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ وہ اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ طبقہ اشرافیہ کو اپنی سیاسی بقا کے لئے ان مدارس کی ضرورت ہے۔ جبکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنے بچوں کو مدارس میں پڑھنے نہیں بھیجتے۔ وہ اپنی بات اس پر ختم کرتے ہیں کہ مسلمان، بشمول تعلیم یافتہ مسلمان، مدرسوں کی دل سے حمایت کرتے ہیں۔ وہ عام مسلم بچوں کی سیکولر تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ کیونکہ مدارس قیادت کرنے کی ان کی امنگوں کی تکمیل کی راہ آسان بنا دیتے ہیں۔ ان کی قیادت اسی وقت چل سکتی ہے جب مسلمان تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہوں۔

چندن مترا

انگریزی روزنامہ 'پائنیر' کے ایڈیٹر اور بی جے پی کے ایم پی چندن مترا جب میڈیا

اور مسلمانوں کے رشتے پر بات کرتے ہیں تو اپنی ساری توانائی اسلامی مدارس کے خطرناک ہونے اور ان کی مذمت میں صرف کر دیتے ہیں۔ان کے خیال میں مدارس نہ صرف ملک کے لئے بلکہ مسلمانوں کے لئے بھی انتہائی خطرناک ہیں اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے بڑھتے دائرے کو کیسے روکا جائے۔تاہم ان کی ان باتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی میڈیا مسلمانوں کے مسائل کو نظر انداز کرتا ہے اور مسلمان معاشی طور پر پسماندہ ہیں۔لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر تقسیم کے بعد اردو زبان کو قومی نصاب تعلیم میں شامل کیا گیا ہوتا تو مسلمان اپنے بچوں کو مدارس میں نہیں بھیجتے۔ان کے مطابق مدارس میں اس وقت پانچ کروڑ ریگولر اسٹوڈنٹس ہیں۔اس میں ان لوگوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے جو مدارس میں جز وقتی جاتے ہیں۔انہوں نے مدارس کی دن بہ دن بڑھتی تعداد پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور اسے روکنے پر زور دیا ہے۔ان کے خیال میں دہلی میں رہنے والے اعلا تعلیم یافتہ مسلمان اور ریٹائرڈ مسلم بیوروکریٹ عام مسلمانوں کے مسائل سے واقف نہیں ہیں۔اس لئے وہ ان کی نمائندگی نہیں کرتے۔عام تعلیم یافتہ مسلمان بھی ایسے لوگوں سے واقف نہیں ہیں اور اگر کچھ ہیں بھی تو وہ ان سے نفرت کرتے ہیں۔مسلمانوں کی پسماندگی کے لئے وہ حکومتوں کو ذمے دار مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے ہی وہ مدارس قائم کرتے ہیں اسکول نہیں۔کیونکہ وہ حکومت کے متوازی سیکولر تعلیم کا بند و بست نہیں کر سکتے۔وہ مزید کہتے ہیں کہ انگریزی میڈیا پر عائد کئے جانے والے الزامات میں بہت کچھ صحیح ہیں لیکن پورا انگریزی میڈیا غیر ذمے دار ہو ایسا نہیں ہے۔یہ صحیح ہے کہ انگریزی میڈیا ایسے لوگوں کو پکڑتا ہے جو تمام مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتے۔اس کے لئے وہ بھی میڈیا کے کاہل ہونے اور ایسے لوگوں کے آسانی سے دستیاب ہو جانے کو ذمے دار مانتے ہیں۔ان کے خیال میں اس کا الٹا اثر پڑتا ہے۔وہ شبانہ اعظمی کی مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فلمی دنیا میں ہیں، آسانی سے ہاتھ آجاتی ہیں، انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہیں۔حالانکہ وہ کسی کی نمائندگی نہیں کرتیں۔میڈیا کی یہ دشواری ہے کہ وہ صحیح لوگوں تک نہیں

پہنچ پاتا بلکہ وہ ایسے لوگوں کو تلاش ہی نہیں کرتا۔ تاہم وہ اعتراف کرتے ہیں کہ میڈیا نے مسلمانوں کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پال رکھی ہیں۔ وہ اس کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ نائن الیون کے بعد بہت سے میڈیا نمائندے دار العلوم دیو بند گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں صرف انتہا پسند مسلمان ہی پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ لیکن مسلمان بھی اس تاثر کو توڑنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ جب رپورٹروں نے وہاں کے لوگوں سے بات کی تو کئی لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی، انہیں انتہا پسند مسلمان ملے ہی نہیں۔ انہیں اس بات پر مایوسی ہوئی کہ وہ جیسا سوچ کر آئے تھے دار العلوم تو ویسا ہے ہی نہیں۔

چندن مترا کہتے ہیں کہ میڈیا میں مسلمانوں کے بارے میں دو قسم کے نظریات ہیں۔ ایک حلقہ مسلمانوں کو Patronize کرتا ہے اور دوسرا اس کے برعکس ہے۔ اول الذکر کے خیال میں مسلمانوں کے ساتھ بہت غلط ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو ہمیں سپورٹ کرنا چاہئے اور انہیں یہ بتانا چاہئے کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ یہ تاثر ہندو دانشوروں اور میڈیا کے ایک حلقے میں ہے۔ دوسرا نظریہ ونود مہتہ جیسے لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک خاص امیج بنا دی گئی ہے اور وہ اس امیج کے قیدی ہو گئے ہیں۔ یہ طبقہ مسلم مسائل کے بارے میں کسی قسم کے ڈائلاگ تک پہنچنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ چندن مترا مسلمانوں کے بارے میں میڈیا کی لاعلمی کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ انگریزی میڈیا میں کام کرنے والے مسلمان بھی مسلم معاشرے کو وسیع پیمانے پر نہیں جانتے۔ وہ صرف طبقہ اشرافیہ کو ہی جانتے ہیں۔ گویا اگر کوئی تعصب ہے بھی تو وہ لاعلمی کی بنیاد پر ہے عمداً نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اس تاثر کے خول سے باہر نکلیں کہ میڈیا جان بوجھ کر ان کو نشانہ بناتا ہے اور ہندوستانی معاشرے میں ان کو ایک ویلن بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ میڈیا مسلم مسائل کے تئیں غیر حساس ہے۔ انگریزی میڈیا ایک جوابدہ اور ذمے دار میڈیا ہے۔ تمام میڈیا کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانکنا مناسب اور قرین حقیقت نہیں ہے۔ وہ اپنی بات اس پر

ختم کرتے ہیں کہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلمان خود بہت سے ایشوز کو نہ پڑھنا چاہتے ہیں اور نہ ہی ان پر بحث چاہتے ہیں۔

کلدیپ نیر

کلدیپ نیر جب ان ایشوز پر بات کرتے ہیں اور قومی میڈیا میں مسلم صورت گری کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ بھی اس کی گرفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے مسلم مسائل سے نہ تو آگاہی ہے اور نہ ہی کوئی دلچسپی ہے۔ وہ تمام مسلمانوں کی صورت ایک ہی برش سے بناتا ہے۔ ان کے مطابق قومی پریس کا کہنا ہے کہ گڑبڑ کی شروعات مسلمان کرتے ہیں اور چونکہ وہ تعداد میں کم ہیں اس لئے نقصان بھی وہی اٹھاتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے خیال میں فساد ان کے اور ہندوؤں کے مابین نہیں بلکہ ان کے اور پولیس کے مابین ہوتا ہے اور پولیس اکثریت کے اشارے پر کام کرتی ہے۔ علاقائی زبانوں کے اخبارات جیسے کہ گجراتی، مراٹھی اور ہندی بھی مسلمانوں کے تئیں زیادہ سخت ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شیوسینا اور بی جے پی سے ڈرتے ہیں۔ وہ بی جے پی کے ذریعے صحافیوں کو استعمال کرنے کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جہاں بھی وہ اقتدار میں رہی اس نے ہندو صحافیوں کو اچھی پوزیشنوں پر پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ جنتا دور حکومت میں جب ایل کے آڈوانی وزیر اطلاعات تھے تو انھوں نے بہت سے ہندو صحافیوں کو اہم سرکاری عہدوں پر بٹھا دیا تھا۔

ان کے خیال میں مسلمان اور ہندو دونوں ایک دوسرے کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں اس لئے زیادہ گڑبڑ ہوتی ہے۔ انگریزی پریس مسلم مسائل کے بارے میں لاعلم ہے۔ لیکن وہ بعض اوقات مسلمانوں کے بچاؤ میں بھی آتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ بابری مسجد انہدام اور ممبئی کے فسادات کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں انگریزی میڈیا نے ان کی مذمت کی جبکہ علاقائی زبانوں کے اخبارات نے مسلمانوں کے خلاف رول ادا کیا تھا۔ وہ مسلمانوں پر ہونے والی زیادتی کو کم کر کے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلم پریس

کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ایک زخمی فریق کا رول ادا کرتا ہے۔ وہ مبالغے سے بھی کام لیتا ہے اور بعض اوقات فرضی کہانیاں بھی گھڑتا ہے۔ وہ مسلم ایشوز پر غیر ممالک میں ہونے والے ردعمل کو زیادہ دکھاتا ہے۔

کلدیپ نیر کہتے ہیں کہ گڑبڑ اس وقت بھی ہوتی ہے اور فرقہ وارانہ ماحول بننے لگتا ہے جب مسلمان محکمہ آثار قدیمہ کی مساجد میں نماز کی ادائگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے فرقہ واریت پھیلانے والوں کو ایک موقع مل جاتا ہے۔ مین اسٹریم پریس بھی ایسے لوگوں کو زیادہ جگہ دیتا ہے اور پھر معاشرے میں ہنگامہ ہو جاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ میں یہ نہیں مانتا کہ قومی پریس ہندو فرقہ پرستوں کے ہاتھ کا کھلونہ ہے یا وہ مسلمانوں کے خلاف سازش کرتا ہے۔ علاقائی پریس میں بعض ناپسندیدہ عناصر موجود ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پورا پریس ایسا ہی ہے۔ انگریزی پریس کا موقف ہمیشہ متوازن اور معروضی رہا ہے۔ اگر کبھی مسلمانوں کو کسی رپورٹ یا مضمون سے تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ رپورٹر یا مضمون نگار اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا یا وہ لاعلم ہوتا ہے۔ وہ اس معاملے میں شاہ بانو کیس کی مثال دیتے ہیں۔ پریس کی مسلم مخالف سوچ کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزی میڈیا میں مسلم صحافیوں کی تعداد کم ہے۔ انگریزی پریس کو چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ نوجوان مسلمانوں کو بھی آگے آنا چاہئے اور جواں مردی سے حالات کا سامنا کرنا چاہئے۔

سدھارتھ ورداراجن

سدھارتھ ورداراجن نے انگریزی میڈیا کا زینہ بہ زینہ جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح وہ مسلم دشمنی پر آمادہ رہتا ہے۔ انہوں نے قومی میڈیا کی ذہنیت کا گہرائی میں جا کر جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران متعصّبانہ رپورٹنگ کی جاتی

ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ فسادات کے خاتمے کے بعد میڈیا کا رخ تبدیل ہوتا ہے اور وہ کسی حد تک حقائق کو منظر عام پر لاتا ہے لیکن اگر یہی رویہ فسادات کے دوران اپنایا جائے تو فسادات کی سنگینی کو کم کرنے میں مدد ملے گی۔ ورداراجن نے بہت سی مثالیں دی ہیں اور کہا ہے کہ پولیس بھی اس دوران فرقہ پرست ہو جاتی ہے اور میڈیا والے پولیس کی اطلاعات پر آنکھ موند کر بھروسہ کر لیتے ہیں۔انہوں نے اسلامی دہشت گردی، مسلم انتہا پسندی اور اس قسم کی دوسری اصطلاحات پر بھی شدید تنقید کی ہے۔

رام مندر تحریک کو میڈیا میں بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا تھا۔اس کے بعد وہ بنگلہ دیشی تارکین وطن کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب بنگلہ دیش سے کوئی ہندو یہاں آتا ہے تو اسے پناہ گزیں کہہ کر احترام کے ساتھ مغربی بنگال میں بسا دیا جاتا ہے اور جب کوئی مسلمان کام کرنے کے لئے آتا ہے تو اسے درانداز کہا جاتا ہے۔ بی جے پی نے 1980 کی دہائی میں بنگلہ دیشی دراندازوں کا خوب پرچار کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اخبار والے بھی ہندو بنگلہ دیشی کو رفیوجی اور مسلم بنگلہ دیشی کو درانداز کہتے ہیں۔

مدارس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ متعدد اخبارات انہیں غیر قانونی قرار دیتے ہیں اور انہیں دہشت گردی اور تخریب کاری کا اڈہ بتاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آڈوانی نے وزیر داخلہ کی حیثیت سے مدارس پر بحث کا مطالبہ تک کر ڈالا تھا اور اس سلسلے میں مشرف کے اقدامات کا حوالہ دیا تھا۔ جبکہ انہیں معلوم ہونا چاہئے ہندوستان میں مسلمان دینی تعلیم کے لئے مدارس کا قیام کرتے ہیں۔ جب حکومت ان کے لئے اسکول کا بندوبست نہیں کرتی تو مسلم بچے کہاں جائیں گے۔انہوں نے سید شہاب الدین کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے کہ حکومت مسلم علاقوں میں اسکول نہیں پولیس چوکی کے قیام میں دلچسپی رکھتی ہے۔وہ مزید کہتے ہیں کہ فسادات کے دوران اخبارات کوڈ آف کنڈکٹ کی پابندی نہیں کرتے اور اگر نقصان ہندوؤں کا ہوا ہے تو ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جس سے واضح ہو جائے کہ حملہ آور مسلمان ہیں اور نشانہ ہندوؤں کو بنایا گیا ہے۔انہوں نے اس کی کئی مثالیں بھی دی

ہیں۔متعصب رپورٹنگ کی ایک وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اخبارات ہر شہر میں اپنے نامہ نگار نہیں رکھتے۔ وہ مقامی صحافیوں کی رپورٹنگ پر بھروسہ کرتے ہیں اور مقامی صحافیوں کو چونکہ کم پیسے ملتے ہیں اس لئے وہ مقامی ذی اثر لوگوں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں فسادات کے دوران ان کی رپورٹنگ غیر جانبدار نہیں رہ پاتی کیونکہ پرتشدد واقعات سے مقامی لوگوں کا بھی تعلق ہوتا ہے۔سدھارتھ وردا راجن نیوز ڈیسک پر موجود متعصب صحافیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان میں سے کئی غیر پیشہ ورانہ ذہنیت کے ہوتے ہیں اور پھر ڈیڈ لائن کا دباؤ بھی ہوتا ہے۔ وہ فسادات کے دوران استعمال کی جانے والی اصطلاحات پر بھی سوال اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں 84 کا سکھ مخالف فساد اور 93 کا ممبئی کا مسلم مخالف فساد فرقہ وارانہ نہیں تھا۔ بلکہ کانگریسیوں نے سکھوں کا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتل کیا تھا۔ تاہم وہ کہتے ہیں کہ پورے ہندو فرقہ کو فرقہ پرست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

وہ انگلش میڈیا میں مسلم مخالف تعصب کو آر ایس ایس کی دین قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق سنگھ پریوار نے اپنی مسلسل کوششوں سے یہ ذہنیت بنائی ہے۔ آر ایس ایس اور بی جے پی سے وابستہ یا ان کے تئیں نرم گوشہ رکھنے والے صحافی اپنے ساتھ تعصب لاتے ہیں۔ بی جے پی کے دور میں تو کئی اخباروں کی فنڈنگ تک کی گئی۔ تاہم وہ انگلش میڈیا کی رپورٹنگ کو علاقائی اخبارات کی رپورٹنگ سے بہتر مانتے ہیں۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں سے متعلق رپورٹوں کی چھان بین نہیں کرتے۔ وہ ٹائمز آف انڈیا کے اپنے تجربے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایڈیٹر متعصب نہیں ہوتا۔ ہاں مسلمانوں کی جو امیج بنا دی گئی ہے وہ کام کرتی ہے۔ آر ایس ایس نے برسوں کی محنت سے مسلمانوں کی یہ شبیہ بنائی ہے اور المیہ یہ ہے کہ سیکولر ہندوستان اس کے اس پرچار کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ زیادہ نہیں کر سکا ہے۔

وردا راجن اس پورے معاملے کا جائزہ لیتے ہوئے کشمیر کی بھی مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بعض اوقات سیاستدانوں اور پولیس کا دباؤ بھی حقیقی رپورٹنگ نہیں کرنے

دیتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کشمیری رپورٹر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی رپورٹ دے تو کہہ دیا جائے گا کہ اسے آئی ایس آئی سے پیسے ملتے ہیں۔ اس لئے وہ ایسی رپورٹنگ کے لئے دو بار سوچے گا۔ اگر وہ مسلمان ہے تو اور بھی صحیح رپورٹنگ نہیں کرسکتا۔ اس پر بہت دباؤ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میں مسلمان ہوتا تو فرقہ واریت کے خلاف جو کچھ برسوں سے لکھ رہا ہوں نہیں لکھ پاتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کے نائن الیون کے بعد جن لوگوں نے امریکی ردعمل پر نکتہ چینی کی انہیں اسامہ بن لادن اور القاعدہ سے جوڑ دیا گیا۔ وہ مالیگاؤں کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ نائن الیون کے بعد وہاں کچھ پرچے بانٹے گئے اور کہا گیا کہ ہندوستانی بنو اور ہندوستانی اشیاء خریدو۔ افغانستان میں امریکی کارروائی کے خلاف کہا گیا کہ امریکی کمپنیوں کی مصنوعات کا بائکاٹ کیا جائے اور کوکا کولہ جیسی چیزیں نہ خریدی جائیں۔ لیکن کیا ہوا کہ پولیس نے ان پرچوں کی تقسیم سختی سے روک دی اور فائرنگ میں کئی لوگ مارے گئے۔ لیکن جب یہ خبر ممبئی اور دہلی پہنچی تو اس شکل میں پہنچی کہ اسامہ حامی پرچے بانٹے جانے سے فساد ہوگیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ جہاں بھی مسلمانوں کے ذریعے تشدد ہو پورے ملک کے مسلمان اس کی مذمت کریں۔ یہ بات غلط ہے۔ مذمت کرنا جن کا کام ہے وہ کریں سب لوگ کیوں کریں۔

رجنی کوٹھاری

رجنی کوٹھاری کہتے ہیں کہ مسلمانوں اور میڈیا کے رشتے کو جاننے کے لئے چار اسباب کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ نمبر ایک: ہندوستانی معاشرے میں انتہا پسندانہ موقف کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں ایک خود ساختہ حد قائم ہے، سنگھ پریوار نے اسے بالکل نہیں سمجھا ہے۔ نمبر دو: پریس ایک دائرے کے باہر ذہن سازی کرنے میں موثر نہیں ہوسکتا۔ نمبر تین: اونچی ذات کی ہندو فرقہ پرستی صرف مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ خود ہندوؤں کے اندر کی اقلیتوں جیسے کہ دلتوں اور قبائلیوں تک بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اور نمبر

چار: ہندوؤں کے اندر کی اقلیتوں کے ساتھ ساتھ تمام اقلیتوں کو اس سلسلے میں ایک مشترکہ حکمت عملی بنانی پڑے گی۔ اس کا تعلق مسلمانوں سے بھی ہے یعنی مسلمانوں کو بھی اس حکمت عملی میں شامل ہونا ہوگا۔ مسلمان ہندوستانی سیاست میں کمزور قوت نہیں ہیں وہ ایک قابل ذکر طاقت ہیں۔ اس تناظر میں رجنی کوٹھاری نے میڈیا کا جائزہ لیا ہے۔

مرنال پانڈے

ہندی کی سرکردہ صحافی مرنال پانڈے نے نیشنل میڈیا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ چونکہ زیادہ تر میڈیا اکثریت کے کنٹرول میں ہے اس لئے اس میں تعصب ہے۔ انہوں نے مغربی میڈیا کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ عالمی میڈیا بھی اکثریت حامی ہے اور اسی لئے ایشیا میں اسلام مخالف تعصب پایا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں انگریزی میڈیا کے صحافیوں کا غریبوں کی اکثریت سے کوئی زیادہ رشتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ ان کے مسائل سے زیادہ واقف نہیں ہوتے۔ جب وہ مسلمانوں اور ان کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو جذباتی ہو جاتے ہیں۔ جب وہ اقلیتوں کے پرسنل لا یا متنازعہ قلم کاروں کی اسلام مخالف تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ البتہ علاقائی زبانوں کے صحافی اقلیتوں کے قریب ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ قربت اقلیتوں کے تئیں جلن اور حسد میں بدل جاتی ہے۔ مسلمانوں کی خوشحالی کا کوئی بھی واقعہ دیکھ کر، جیسے کہ خلیج میں ان کے لئے روزگار کے مواقع میں اضافہ، حکومت یا کابینہ میں مسلمانوں کی شمولیت اور مسجدوں کی صفائی ستھرائی وغیرہ کی رپورٹنگ کے دوران ان کا لہجہ استہزائیہ ہو جاتا ہے اور وہ اسے مسلمانوں کی منھ بھرائی سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں پانچ جنیہ اور سامنا جیسے اخباروں نے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کو ہیرو کے طور پر پیش کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندی صحافت پر زیادہ ذمے داری عائد ہوتی ہے لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پاس ایکسپرٹ کمنٹ دینے کے لئے ہندی ماہرین

نہیں ہیں وہ بھی انہی انگریزی ماہرین کی رائے لینے پر مجبور ہوتے ہیں جن سے انگریزی اخبارات لیتے ہیں۔مرنال پانڈے کہتی ہیں کہ اجودھیا واقعہ کے بعد پریس کونسل کی سختی کی وجہ سے متعصّبانہ رپورٹنگ میں کچھ کمی آئی ہے۔لیکن اب بھی خاص مواقع پر تعصب عود کر آتا ہے۔انہوں نے ہندی کے کئی اخباروں کی متعصّبانہ رپورٹنگ کی مثالیں بھی دی ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح یہ اخبارات پریس کونسل کی ہدایات کی نہ صرف خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ پریس کونسل کے بلانے پر اپنے موقف کی وضاحت کے لئے آتے بھی نہیں ہیں۔مرنال پانڈے نے اس کی بھی مثالیں دی ہیں کہ قومی میڈیا سے وابستہ صحافی مسلمانوں کی کردارکشی بھی کرتے ہیں اور جب اس کے جواب میں کوئی چیز بھیجی جاتی ہے تو وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں وہ اس کو شائع نہیں کرتے۔یہاں تک کہ پولیس کی چھان بین میں مسلمانوں کے بے قصور ثابت ہونے کی خبریں بھی یہ لوگ نہیں چھاپتے۔اس سلسلے میں انہوں نے ہندی اخبار آج، ہندی راشٹریہ سہارا، امر اجالا اور دوسرے اخباروں کی مثالیں پیش کی ہیں۔اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے اردو کے بھی اکادکا اخباروں کی مثال دی ہے کہ کس طرح وہ بھی پریس کونسل کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔انہوں نے قومی میڈیا کی ایک اور جانبداری کا تذکرہ کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جب بات مسلم خواتین کی آئے گی تو ان میں بڑا جوش پیدا ہو جائے گا اور ایسا تاثر دیا جانے لگے گا کہ وہ بہت ہی مظلوم اور مجبور ہیں۔

دہشت گردی اور میڈیا
ایک انتہائی متعصّبانہ جائزہ

’ملک کا مین اسٹریم میڈیا وسیع النظر، وسیع القلب اور وسیع الذہن ہے، وہ فرقہ پرستی اور دہشت گردی کا مخالف اور قومی مفادات کا ترجمان اور نمائندہ ہے اور پکا و سچا دیش بھکت ہے۔۔۔جبکہ اردو میڈیا تنگ نظر، تنگ ذہن اور تنگ دل ہے، دہشت گردی کا حامی اور نمائندہ ہے، ایک خاص مذہب کی صحافت کرنے کا عادی ہے اور دیش بھکتی کے بجائے دیش دروہ میں یقین رکھتا ہے۔‘‘

یہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ حال ہی میں منظر عام پر آئی ایک کتاب کہہ رہی ہے جو دہشت گردی کے تناظر میں ملکی میڈیا کا تقابلی جائزہ لینے کے لئے شائع کی گئی ہے۔اس میں تین ایشوز لئے گئے ہیں اور ان پر انگریزی، ہندی اور اردو میڈیا کی رپورٹنگ کے نمونوں کی روشنی میں تینوں زبانوں کی صحافت کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تین ایشوز ہیں: بٹلہ ہاؤس انکاونٹر، ممبئی پر دہشت گردانہ حملے اور عبد الرحمٰن انتولے معاملہ۔اس کتاب کا نام ہے’ آتنک واد اور بھارتیہ میڈیا‘۔اسے پروفیسر راکیش سنہا نے لکھا ہے اور بھارت نیتی پرتشٹھان حوض خاص، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ کہنے کو تو اس میں تینوں زبانوں کے میڈیا کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا واحد اور اصل مقصد اردو میڈیا اور مسلمانوں کو بدنام کرنا، ان کی شبیہ کو داغدار کرنا اور ان کو کٹہرے میں کھڑا کرنا ہے۔156 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں انگریزی میڈیا پر 52، ہندی میڈیا پر 21 اور اردو میڈیا پر 61 صفحات خرچ کئے گئے

ہیں۔ تینوں زبانوں کے معروف اخبارات کی خبروں اور تجزیوں کے نمونے پیش کئے گئے اور ان کی روشنی میں نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

اس میں اردو میڈیا کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ 'اردو ملک کی 17 ریاستوں میں بولی جاتی ہے اور اردو اخباروں کی ہر جگہ پہنچ ہے۔ لہذا ایک خاص مذہب کی صحافت کرنا اس زبان کے تنگ نظر ہونے کا ثبوت ہے۔ ایسی صحافت آزادی اور غیر جانبداری کے نام پر من مانی اور فرقہ پرست ہو جاتی ہے۔ اردو اخباروں نے بٹلہ ہاوس انکاونٹر کو فرضی مانا اور ممبئی میں دہشت گردانہ حملوں کو جہاں مین اسٹریم کے اخبارات نے جہادی سازش کے طور پر دیکھا وہیں اردو اخباروں نے اسے یہودیوں، مسعد، امریکہ اور سی آئی اے کی سازش قرار دیا۔ وہ اپنے اس نظریے پر اس وقت بھی قائم رہے جب ممبئی پولیس نے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر گیارہ ہزار صفحات کی چارج شیٹ دائر کر دی۔' اس جائزے میں اردو اخباروں پر فرضی اور بے بنیاد جائزوں کی روشنی میں سنسنی خیزی کا الزام لگایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اردو صحافت افواہوں کا گھوڑا دوڑانے والی صحافت ہے۔ اس کا مزید کہنا ہے کہ بٹلہ ہاوس انکاونٹر کو فرضی قرار دینے کا مقصد فرقہ وارانہ ذہنیت کو پروان چڑھانا ہے۔ اس معاملے کو مسلم سیاست کا مرکز ومحور بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور دہشت گردی سے زیادہ دہشت گرد کے مذہب کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مصنف کو اس بات پر بھی بہت دکھ ہے کہ پولیس کی کارروائی پر شکوک وشبہات ظاہر کئے جا رہے ہیں اور انکاونٹر میں مارے گئے دونوں دہشت گردوں کو معصوم اور بے قصور بتایا جا رہا ہے۔ اردو اخباروں کی جانب سے ان بیانات کو شائع کرنے پر بھی ان پر لعن طعن کی گئی ہے جن میں اس واقعہ کی سچائی پر شبہہ ظاہر کیا گیا ہو۔

مصنف نے لکھا ہے کہ مسلم سیاست کا مرکز اب جامع مسجد سے جامعہ نگر میں منتقل ہو گیا ہے اور اسی تناظر اور اسی روشنی میں مذکورہ تینوں معاملات کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قابل ذکر ہے کہ بہت پہلے بی جے پی نے بھی یہ ہوا کھڑا کیا تھا کہ جامعہ نگر کا علاقہ منی پاکستان بنتا جا رہا ہے اور اب ایک بار پھر ان معاملات کی روشنی میں یہی بات کہنے کی کوشش

کی گئی ہے۔

اردو کے جن اخباروں کی رپورٹوں کو نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہ ہیں: روزنامہ راشٹریہ سہارا، اردو ٹائمز، سیاست، آزاد ہند، انقلاب، منصف، اخبار مشرق، ہندوستان ایکسپریس، رہنمائے ملت، جدید مرکز، نشیمن، نئی دنیا اور عالمی سہارا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ تینوں زبانوں کے اخباروں سے صرف ان خبروں کے تراشے شامل کئے گئے ہیں جو مصنف کے مقصد کی تکمیل کرتی ہوں۔ ان خبروں اور جائزوں کو نظر انداز کیا گیا ہے جو مصنف کے پہلے سے طے شدہ نظریے کے خلاف ہوں۔ اسی لئے اردو اخباروں کی ان خبروں کو چھوا تک نہیں گیا جن میں دہشت گردی کی مخالفت کی گئی ہے یا دہشت گردی کے خلاف کانفرنسوں اور پروگراموں کی رپورٹنگ کی گئی ہے۔ اردو اخباروں سے صرف ان خبروں کو چنا گیا ہے جن میں سوالات کھڑے کئے گئے ہیں اور پولیس کے بیانات کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح انگریزی اور ہندی کی صرف انہی خبروں کی کٹنگ کی گئی ہے جن میں بٹلہ ہاوس انکاونٹر میں پولیس کے بیانات کو شائع کیا گیا ہے، جن میں مسلمانوں کو دہشت گرد کہا گیا ہے، جن میں جہادی دہشت گردی کی آڑ میں مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا ہے اور جن میں اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مین اسٹریم میڈیا حقیقت پسند بھی ہے لیکن وہیں وہ مسلمانوں کے معاملات میں ڈنڈی بھی بہت مارتا ہے اور مسلمانوں کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ بعض اوقات حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ہو رہی نا انصافی اور زیادتی پر آواز بھی بلند کرتا ہے۔ ہندوستان ٹائمز، انڈین ایکسپریس، ہندو، میل ٹوڈے، جن ستہ اور ایسے کئی اخبارات ہیں جو فسادات میں مسلمانوں کے ساتھ زیادتیوں پر کھل کر لکھتے ہیں۔ انہوں نے بٹلہ ہاوس انکاونٹر معاملے پر بھی بہت سے سوالات اٹھائے ہیں اور چند لوگوں کی حرکتوں کی آڑ میں پوری مسلم قوم کو دہشت گرد ثابت کرنے پر تلے ایک طبقے کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ لیکن اس

جائزے میں ایسی چیزوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔

پروفیسر راکیش سنہا کو روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر عزیز برنی کی تحریریں بھی کافی چبھی ہیں اور ان کے قسطوار مضمون 'ہندوستانی مسلمان: ماضی، حال اور مستقبل' کو بھی انہوں نے اپنی اوچھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں 'راشٹریہ سہارا اردو نے بٹلہ ہاؤس انکاونٹر کو فرضی مڈبھیڑ ٹھہرانے میں پورا زور لگا دیا۔ اس نے اس سلسلے میں ایک ماہ تک یومیہ مہم چلائی جس میں اس انکاونٹر اور ملک میں چل رہی دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ہندو انتہا پسندوں کا ہاتھ ہونے کے الزام کو ثابت کرنے کے لئے جم کر خبریں اور مضامین چھاپے گئے۔ ویسے تو اس اخبار نے شروع میں ہی اس انکاونٹر کی سچائی پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر عزیز برنی نے اپنے خاص اداریوں میں حکومت، کانگریس، پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کی جم کر نکتہ چینی کی ہے۔ اس اخبار نے میڈیا پر بھی الزام لگایا ہے کہ اس کا رویہ غیر ہندوؤں کے تئیں بھید بھاؤ والا ہے۔'

مصنف کو یہ بھی اعتراض ہے کہ 'اردو اخباروں نے دہشت گردی کو اجودھیا تنازعے اور بابری مسجد انہدام اور مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں سے کیوں جوڑنے کی کوشش کی ہے'۔ دہشت گردانہ واقعات میں خفیہ ایجنسیوں کی ناکامی کی بات تو حکومت تک نے تسلیم کی ہے اور مین اسٹریم میڈیا نے بھی اسے اٹھایا ہے لیکن جب اردو اخبارات اسے اٹھاتے ہیں تو وہ مصنف پر گراں گزر جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں 'اردو اخباروں نے دہشت گردی سے لڑنے کی ہندوستان کی مہم کے لئے خفیہ ایجنسیوں کی ناکامی کو اچھالنا شروع کیا۔ مین اسٹریم کے اخباروں نے بھی اس ناکامی کو پیش کیا ہے لیکن انہوں نے ذمے دارانہ انداز اختیار کیا اور اس سے دہشت گردی مخالف مہم کو کمزور نہیں ہونے دیا۔ جبکہ اردو اخباروں نے ایسا نہیں کیا'۔ گویا اردو اخباروں نے دہشت گردی مخالف مہم کو ناکام کر دیا۔

مصنف کو اس بات کا بڑا قلق ہے کہ مسلمان دہشت گردی کے واقعات کو موساد اور سی آئی اے سے کیوں جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ انہوں نے شکوہ کیا ہے کہ اردو اخباروں نے

مذکورہ واقعات میں فوراً غیر ملکی ایجنسیوں کا ہاتھ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ مین اسٹریم میڈیا نے ایسا نہیں کیا۔لیکن کیا مصنف کے پاس اس کا کوئی جواب ہے کہ جب بھی کہیں دہشت گردی کی کوئی واردات ہوتی ہے تو قومی میڈیا کو فوری طور پر کسی مسلم تنظیم کا پتہ کہاں سے چل جاتا ہے اور وہ اس میں مسلمانوں کے ملوث ہونے کی بات کہاں سے کرنے لگتا ہے۔ پولیس کے بیانات پر شبہہ کرنا بھی مصنف کے نزدیک ایک جرم ہے۔اسی لئے انہوں نے اردو میڈیا کو جانبدار اور ایک مذہب کا نمائندہ قرار دیا ہے۔بعض اوقات پولیس کے بیانات میں کتنی سچائی ہوتی ہے اس کا پردہ قومی میڈیا بھی فاش کرتا رہتا ہے لیکن جب معاملہ مسلمانوں کا ہو تو آنکھ بند کر کے پولیس کے بیان پر یقین کر لیتا ہے۔

اس کتاب میں اس پر بھی آنسو بہائے گئے ہیں کہ اردو اخباروں نے ممبئی حملوں کو مالیگاؤں کے واقعات سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔لیکن مصنف کی بددیانتی دیکھئے کہ بٹلہ ہاؤس انکاونٹر معاملے میں انہوں نے پولیس کے بیان کو فوراً مان لیا لیکن مالیگاؤں معاملے میں پولیس کے بیانات کو ماننے سے انکار کر دیا۔اس سلسلے میں اخبارات نے جو کچھ لکھا ہے اور جس طرح انگریزی اور ہندی کے میڈیا نے ہندو دہشت گردی کا کچا چٹھا کھولا ہے، اس پر خاموشی اختیار کر لی ہے۔ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، دونوں نے مالیگاؤں بم دھماکوں میں سادھوی پرگیہ اور کرنل پروہت کے دہشت گردانہ عزائم کو بے نقاب کیا ہے اور آئی ایس آئی اور آر ایس ایس کے بعض لوگوں کے مابین رشتوں کو بھی واشگاف کیا ہے لیکن وہ مصنف کو نظر نہیں آیا۔اردو اخباروں نے ممبئی حملوں اور مالیگاؤں کے واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کی تو مصنف کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔

کتاب کے مصنف نے مرکزی وزیر عبدالرحمٰن انتولے کے اس بیان کو بھی اردو میڈیا پر حملے کا ایک بہانہ بنا لیا جس میں انہوں نے ممبئی اے ٹی ایس کے چیف ہیمنت کرکرے کی موت پر سوال اٹھایا تھا۔انہوں نے اس معاملے پر اردو اخباروں کی رپورٹنگ کو انتولے نامہ قرار دیا اور اسے ایک سازش سے تعبیر کیا۔انھوں نے انتولے کے بیان کے

لئے بھی اردو اخباروں کو ہی ذمے دار قرار دیا اور کہا کہ انہوں نے از خود یہ بیان نہیں دیا تھا بلکہ اردو اخباروں نے جو سازش رچی تھی اس کی وجہ سے انتولے نے مذکورہ بیان دیا۔ انہوں نے انتولے کے بیان کو اردو میڈیا کی سازشی داستان کی ترجمانی قرار دیا اور کہا کہ جہاں ملک کے قومی میڈیا نے اس بیان کی وجہ سے انتولے کو ایک غیر ذمے دار سیاستداں بتایا وہیں اردو میڈیا نے اس بیان پر ان کی خوب عزت افزائی کی اور انہیں مسلمانوں کا مسیحا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ انتولے کو ملی مسلم تنظیموں کی حمایت بھی آنجناب کو پسند نہیں آئی اور انہوں نے ان تنظیموں کو بھی برا بھلا کہا ہے۔

مصنف نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کے اس فیصلے کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جس میں انہوں نے یونیورسٹی کے طلبہ کو قانونی مدد فراہم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس سلسلے میں جب اردو اخباروں نے ان کا بیان شائع کر کے ان کے قدم کی حمایت کی تو وہ بھی ان پر گراں گزرا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو اخباروں نے بھی ممبئی حملے کی مذمت کی تھی لیکن اس کے لئے انہوں نے امریکہ، اسرائیل اور مسعد کو ذمے دار قرار دیا جس کی وجہ سے دہشت گردی کے خلاف ملک کی لڑائی کمزور پڑ گئی۔

پروفیسر راکیش سنہا نے اپنے تجزیے میں انگریزی اخباروں کی خوب تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ ابھی تک ہوتا یہ آیا ہے کہ قومی معاملات پر انگریزی اخبارات ہندی اخبارات سے الگ راہ اختیار کرتے تھے کیونکہ وہ خود کو اعلی سوسائٹی کے اخبار سمجھتے ہیں لیکن بٹلہ ہاؤس انکاونٹر، ممبئی حملے اور عبد الرحمٰن انتولے کے معاملے پر پہلی بار انگریزی اخباروں نے ہندی اخباروں کا ساتھ دیا اور حقیقت پسندی سے کام لیا۔ گویا اس سے پہلے انگریزی اخبارات حقیقت پسندی سے کام لینے کی صلاحیت اور اہلیت سے عاری تھے اور ان کو قومی معاملات میں صحیح موقف اختیار کرنے کی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ انگریزی اور ہندی پریس کے درمیان آزادی کے پہلے سے ہی فرق رہا ہے۔

ہندی پریس عوامی جذبات کے قریب رہا ہے جبکہ انگریزی پریس پر اعلی طبقے کی نمائندگی کا الزام لگتا رہا ہے۔ اکثر مواقع پر دونوں زبانوں کے اخبارات میں مقابلہ جاتی تنازعات بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ انکاونٹر کے معاملے پر بھی میڈیا میں اختلافات رہے ہیں لیکن جب دہشت گردی کی شکل بدلنے لگی تو میڈیا کا قومی سروکار سامنے آیا۔ اس معاملے میں ہندی اور انگریزی میڈیا کے درمیان رپورٹنگ، تجزیہ اور دہشت گردی کی سمجھ میں تقریباً مماثلت دکھائی پڑتی ہے۔ بٹلہ ہاوس انکاونٹر پر دونوں زبانوں کے میڈیا نے آزاد اور غیر جانبدارانہ رخ اختیار کیا۔ پولیس کی دہشت گردی مخالف مہم کو اس نے تنقیدی نظر سے دیکھا لیکن بٹلہ ہاوس انکاونٹر پر اٹھائے گئے سوالوں کی جانچ پڑتال کی۔ اس طرح اس نے اسے صحیح قرار دیا۔ انہوں نے اسے اقلیتوں پر مظالم کے الزام سے الگ رکھا۔ جبکہ اردو میڈیا نے ممبئی حملے کے بارے میں الگ تصویر ابھارنے کی کوشش کی اور اس واقعہ کو عالمی دہشت گردی سے جوڑنے کو ناپسند کیا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اردو اخباروں نے اسے اسلام کو بدنام کرنے والا بتایا۔

آخر میں ''میڈیا اور قومی سروکار'' اور ''مطالعہ کا نتیجہ'' کے عنوان سے دو مختصر مضامین ہیں۔ ان میں بھی اردو میڈیا کی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں سے اردو اخباروں کی اشاعت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کتاب میں کہا گیا ہے کہ ان اخبارات کی ریڈرشپ اردو زبان بولنے والوں تک ہی محدود ہے۔ علاقائی اور لسانی اخباروں کو مقامی سطح پر قومی روزناموں کے مقابلے میں زیادہ موثر مانا جاتا ہے۔ اردو اخباروں کے پاس اپنا ایک الگ قارئین کا طبقہ ہے۔ بیشتر اردو اخباروں نے ممبئی حملے اور مالیگاؤں بم دھماکہ جانچ میں تعلق جوڑنے کی کوشش کی۔ یہ سب افواہوں کا گھوڑا دوڑانے جیسی صحافت ہے جس کے لئے ان کے پاس نہ حقائق ہیں اور نہ ہی ثبوت۔ اس سازش کے نظریے کی بنیاد ہیمنت کرکرے کے قتل کو بنایا گیا۔ اردو اخباروں نے اپنے اداریوں اور تجزیاتی رپورٹوں میں بار بار اس کو دہرایا۔ اس کے لئے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کے اس قسم کے بیانات کو بار بار شائع

کیا گیا۔اردو اخباروں نے ممبئی حملوں کی جانچ کے نتیجے میں سامنے آئے حقائق کو نظر انداز کیا۔ کچھ نے تو اجمل عامر قصاب کے اقبالیہ بیانات پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا۔ان اخباروں نے حکومت ہند کی اس لئے نکتہ چینی کی کہ وہ اس کے لئے پاکستان کو کیوں ذمے دار قرار دے رہی ہے۔ بیشتر اخباروں نے ممبئی حملوں کی جانچ کے عمل میں امریکہ برطانیہ اور اسرائیل کی سرگرمی پر اعتراض کرتے ہوئے اسے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت قرار دیا۔اردو کے زیادہ تر اخباروں نے قومی اخبارات پر جنگی جنون پیدا کرنے کا الزام لگایا۔ان پر پاکستان مخالف ذہنیت سے متاثر ہونے کا بھی الزام لگایا گیا۔دہشت گردی کا تجزیہ کرنے میں اردو اخبارات نے بابری مسجد کے انہدام، گجرات فسادات، اقلیتوں پر مظالم، مسلمانوں کی غریبی اور بے روزگاری کے مسائل کو بنیاد بنا کر اس موضوع کو قارئین کے سامنے رکھا اور انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کی۔اردو اخباروں نے دہشت گردی کے خلاف سخت قوانین بنانے کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ ان کا استعمال مسلمانوں کے خلاف کیا جائے گا۔ان اخباروں نے انڈین اسٹیٹ کو متنبہ کیا کہ وہ ایسا کچھ بھی نہ کرے جس سے ہند پاک تعلقات میں تلخی پیدا ہو اور جنگ کی صورت حال بن جائے۔

اس طرح مصنف نے اردو اخباروں پر الزامات کی یلغار کر دی ہے جن میں بہت سی باتیں بالکل بے بنیاد ہیں۔انہوں نے مسلمانوں کے جائز خدشات کو بھی غلط رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور تجربات کی روشنی میں ان کے شکوک وشبہات کو بھی ملکی مفاد کے منافی قرار دیا ہے۔ پولیس کس طرح زور زبردستی سے لوگوں سے بیانات لکھوا لیتی ہے یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔اور اخبارات میں ان بیانات پر سوالیہ نشانات لگائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن جب اردو اخبار سوال اٹھاتے ہیں تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ٹاڈا اور پوٹا کو کس طرح مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا گیا یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے سخت قانون کی مخالفت کی۔اور یہ شبہ تو برقرار ہی ہے کہ ایسے قوانین کا استعمال مسلمانوں کے خلاف ہوگا۔لیکن جب اردو اخبار یہ شبہ ظاہر کرتے ہیں تو اسے

دہشت گردی مخالف جنگ کے منافی قرار دیا جاتا ہے۔اردو اخبارات بھی دہشت گردی کے اتنے ہی مخالف ہیں جتنے کہ انگریزی اور ہندی کے اخبارات۔لیکن وہ اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ دہشت گردی مخالف جنگ میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہئے کسی ایک شخص کی حرکتوں کی آڑ میں اس مذہب کے پیروؤں کو نشانہ نہیں بنایا جانا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی نہیں چاہے گا کہ اس کے ملک کے معاملات میں دوسرے ممالک مداخلت کریں لیکن جب اردو اخبارات یہی بات کہتے ہیں تو اس کو دوسرا رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ملک کا کوئی بھی سنجیدہ اور دانشمند شخص یہ نہیں چاہے گا کہ ہندوستان کی پاکستان سے یا کسی اور ملک سے جنگ ہو۔لیکن جب اردو اخباروں نے بھی یہی بات کہی تو ان کو پسند نہیں آئی۔

دہشت گردی اور میڈیا

تصویر کا دوسرا رخ

جیسا کہ گذشتہ مضمون میں عرض کیا گیا ہے کہ کتاب 'دہشت گردی اور بھارتیہ میڈیا' میں مصنف نے انتہائی جانبداری سے کام لیا ہے۔ انہوں نے صرف اپنے مطلب کی رپورٹوں کو کتاب میں پیش کیا ہے۔ انگریزی اور ہندی اخباروں کی ان رپورٹوں کو اس میں شامل نہیں کیا ہے جن میں بٹلہ ہاؤس انکاونٹر پر شکوک وشبہات ظاہر کئے گئے ہیں یا پولیس کی کہانی کو مشکوک بتایا گیا ہے۔ جس طرح اردو کے اخبارات نے بہت سے سوالات اٹھائے ہیں، اسی طرح انگریزی اور ہندی کے اخبارات نے بھی متعدد بار پولیس کارروائی پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ انگریزی اور ہندی میڈیا میں بھی ایسے انصاف پسند لوگوں کی کمی نہیں ہے جو کھل کر اظہار خیال کرتے ہیں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں خواہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہوں یا کسی اور کے خلاف۔ بٹلہ ہاؤس انکاونٹر اور پولیس کی کارروائیوں کے سلسلے میں ان اخبارات نے کیا لکھا ہے اس کا ایک ہلکا سا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز کے 28 ستمبر کے شمارے میں سابق مدیر اور کالم نگار ویر سنگھوی نے 'دی بیلنسنگ ایکٹ' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے بہت سی باتوں کے علاوہ پولیس کے بیانات کی قلعی بھی کھولی ہے اور مذاق اڑاتے ہوئے کہا ہے کہ ہر دھماکے میں ایک ماسٹر مائنڈ کہاں سے آجاتا ہے آخر کتنے

ماسٹر مائنڈ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں 'بٹلہ ہاوس انکاونٹر پر اسرار کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور ایسی صورت حال میں جبکہ ایک اعلی پولیس افسر بھی مارا گیا ہے ہمیں جاننے کا حق ہے کہ واقعتاً کیا ہوا تھا۔ لیکن پولیس کچھ نہیں بتا رہی ہے اور سوالات اپنی جگہ پر موجود ہیں۔' انہوں نے آخر میں کہا ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم بالغ نظری اور توازن کا مظاہرہ کریں۔ نائن الیون کے بعد امریکہ میں مشتبہ دہشت گردوں کو تو قانونی مدد ملتی ہے لیکن ہندوستان میں وکلا کی تنظیمیں مشتبہ دہشت گردوں کے بائکاٹ کے لئے گروہ بند ہو جاتی ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں میں علاحدگی پسندی پیدا ہوگی بلکہ ہمیں ایک لبرل جمہوری ملک ہونے کے ناطے شرمندگی بھی ہوگی۔

ویر سنگھوی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کے قدم کی بھی حمایت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں 'وائس چانسلر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو قانونی مدد فراہم کریں۔ بی جے پی کا یہ اعلان کہ اس طرح وہ دہشت گردی کی حمایت کر رہے ہیں ایک احمقانہ بات ہے۔ اگر کسی کو بے قصور سمجھا جائے تو کیا ہو جائے گا۔ یہ لڑکے دہشت گرد ہو سکتے ہیں لیکن پہلے عدالت سے یہ ثابت تو ہو اور جب تک یہ ثابت نہیں ہوتا ہے ان کو وکلا اور قانون کی مدد لینے کا حق ہے'۔

26 ستمبر کے ہندوستان ٹائمز ہی کے شمارے میں اپنے کالم میں پرتیک کانجی لال کہتے ہیں 'اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک میں دہشت گردی کا نیٹ ورک ہے تاہم سوال یہ ہے کہ کیا اعظم گڑھ کے چند بچے اس سب کے ذمے دار ہیں۔ یا پولیس بڑھا چڑھا کر ثبوتوں کے ساتھ کیس بنا رہی ہے۔ ان ملزموں نے دباؤ میں آکر ہر بات کا اعتراف کر لیا۔ مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے نائن الیون کی سازش اور گاندھی جی کے قتل میں ملوث ہونے کا اعتراف کیوں نہیں کیا۔

پرتیک کانجی لال نے پارلیمنٹ حملہ کیس میں عبدالرحمٰن گیلانی کی مثال پیش کی ہے کہ کس طرح پولیس نے انہیں پھنسایا اور عدالت نے انہیں بری کر دیا اور کس طرح

عدالت کے حکم پر گجرات کے پولیس افسر ڈی جی ونزارا کو سہراب الدین انکاونٹر کیس میں جیل کی ہوا کھانی پڑ رہی ہے۔اس طرح انہوں نے پولیس کے اقدامات پر سوال اٹھائے ہیں۔وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ گجرات کے فسادات اور عیسائی مخالف تشدد کو لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے ساتھ اس انداز میں نہیں سوچا جاتا۔ ان کی کارروائیوں کو فوراً دہشت گردی قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ دوہرا رویہ ٹھیک نہیں ہے۔ روزنامہ میل ٹوڈے نے 22 ستمبر کے شمارے میں اپنی کور اسٹوری میں پولیس بیانات پر سوال اٹھائے ہیں اور عاطف امین کے بارے میں دہلی پولیس کے دعوے کی یو پی اور گجرات پولیس کے ذریعے تردید کی خبر چھاپی ہے۔25 ستمبر کے شمارے میں 'خاکی دہشت کے تین گھنٹے' کے عنوان سے روہت وادھوانی نے دہلی پولیس کے اسپیشل سیل کے ذریعے ثاقب اختر کو اٹھانے کا پورا واقعہ شائع کیا ہے۔

اسی شمارے میں میل ٹوڈے بیورو نے لکھا ہے 'مشتبہ دہشت گرد ساجد اور عاطف کی لاشوں کی جانچ کرنے والے ایک فورنسک ایکسپرٹ نے کہا ہے کہ 'ان دونوں کو ایک سے پانچ میٹر کی مسافت سے گولی ماری گئی ہے اور انہیں ختم کرنے کی نیت سے مارا گیا۔' پھر اس کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔اس نے قومی انسانی حقوق کمیشن کی یہ گائڈ لائن بھی چھاپی ہے کہ 'تمام انکاونٹروں کی تعصب کے بغیر جانچ ہونی چاہئے۔انکاونٹر میں ہونے والی ہر موت کو اس وقت تک اقدام قتل سمجھا جائے جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ کارروائی اپنے تحفظ میں کی گئی تھی۔ جانچ رپورٹ چھ ہفتوں کے اندر قومی انسانی حقوق کمیشن کو پیش کی جائے اور جانچ آزادانہ ہو اور انکاونٹر میں ملوث پولیس کو اس سے دور رکھا جائے'۔26 ستمبر کے ٹائمز آف انڈیا نے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کے ذریعے جامعہ کے طلبہ کو بدنام کرنے کے خلاف مارچ کی تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔

روزنامہ انڈین ایکسپریس نے 23 ستمبر کے شمارے میں مشتبہ دہشت گردوں

کے چہرے پر اسلامی اسکارف باندھنے پر اعتراض کیا ہے۔ جبکہ ٹائمز آف انڈیا نے 28 ستمبر کے شمارے میں اس معاملے پر سوال اٹھایا ہے کہ کیا یہی پولیس کی ذہنیت ہے۔ راہل ترپاٹھی نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے 'ایسا لگتا ہے کہ جان بوجھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ نوجوان مسلمان ہیں۔ اس تصویر سے بہت ٹھوس پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے'۔ اسی صفحے پر نیچے کی جانب متعدد قارئین کے خطوط شائع کر کے سوال اٹھایا گیا ہے کہ صرف ایک فرقہ کو نشانہ کیوں بنایا جا رہا ہے؟

ٹائمز آف انڈیا ہی نے 30 ستمبر کے شمارے میں 'بجرنگ دل: بھگوا خاندان کا دہشت گرد چہرہ' کے عنوان سے 25 اگست، اگست ستمبر 2008 اپریل 2006 اور جنوری 1999 میں ملک میں ہونے والے بم دھماکوں کی تفصیل پیش کر کے بتایا ہے کہ یہ بھگوا دہشت گردوں کی کارستانی ہے۔ مضمون نگار راج دیپ سر دیسائی لکھتے ہیں 'بجرنگ دل والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گجرات فسادات کے دوران مسلمانوں کو قتل کرنے اور ان کے گھروں کو جلانے میں وہ پیش پیش رہے ہیں'۔ انہوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف بجرنگ دل کے کارکنوں کے تشدد کی تفصیل پیش کی ہے۔ انہوں نے نصف صفحے کے مضمون میں ضمنی سرخی 'نفرت کا ابھار' کے تحت ان کی قلعی کھولی ہے۔ اسی طرح 29 ستمبر کے شمارے میں 'جامعہ نگر کے خلاف یہ تعصب کیوں' کے زیر عنوان جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پی۔ آر۔ او، رخشندہ جلیل کا ایک تفصیلی مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اس صفحے پر دوسری اسٹوریز بھی ہیں۔

روزنامہ انڈین ایکسپریس نے 28 ستمبر کے شمارے میں اندر کے دو صفحات پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس پورے علاقے پر ایک اسٹوری شائع کی ہے۔ جس کا عنوان ہے 'ایک بڑی تصویر، جامعہ نگر کے اندر سے'۔ رپورٹر وی شو بھا نے اس بارے میں دو مضامین لکھے ہیں۔ ایک جامعہ کے مسلمانوں پر اور دوسرا بہت اچھا مضمون اوکھلا گاؤں میں رہ رہے ہندوؤں پر، جن میں اکثریت کمہاروں کی ہے۔ پہلے مضمون

میں انہوں نے جامعہ نگر کے مسلمانوں کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور بہت سارے لوگوں کے بارے میں لکھنے کے ساتھ ساتھ زویا اور ان کے شوہر ہاشمی کی کہانی بھی شائع کی ہے۔

زویا غیر مسلم تھیں مگر انہوں نے اسلام قبول کیا اور پھر ہاشمی سے شادی کی۔ زویا ایل18 کے پاس ایک بوطیق چلاتی ہیں۔ وہ اپنے ڈھائی سال کے بیٹے ابیر کے لئے فکر مند ہیں اور نمناک آنکھوں کے ساتھ کہتی ہیں کہ کون جانتا ہے کہ جب وہ اٹھارہ انیس سال کا ہوگا تو اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ کوئی بھی ماں دہشت گرد پیدا نہیں کرتی اور اس وقت دنیا میں جو ہو رہا ہے میں اس سے اسے کیسے بچا پاؤں گی۔ ہم لوگوں پر کوئی بھی بھروسہ نہیں کرتا'۔ زویا کہتی ہیں کہ مذہب کے نام پر ان کے ساتھ تفریق برتی جاتی ہے۔ اچھے اسکولوں میں ہمارے بچوں کو داخلہ نہیں دیا جاتا۔ انہوں نے نیوفرینڈس کالونی میں مکان تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی بھی مسلمان کو اپنا کرایے دار بنانا نہیں چاہتا۔

وی شوبھا نے دوسری رپورٹ میں اوکھلا گاؤں کے بیچوں بیچ رہائش پذیر کمہاروں کے حالات بیان کئے ہیں۔ ایک 80 سالہ بزرگ شری رام سرن کہتے ہیں کہ انہیں یاد نہیں ہے کہ وہ کب یہاں آئے تھے۔ لیکن وہ اتنا جانتے ہیں کہ وہ 1946 سے جامعہ نگر میں رہ رہے ہیں وہ لوگ متھرا سے یہاں آئے تھے۔ وہ اپنی بیوی، چار بیٹوں اور پوتوں پوتیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ سرن کے 54 سالہ بیٹے کمل سنگھ کہتے ہیں 'جامعہ نگر میں فرقہ وارانہ تشدد کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بابری مسجد انہدام اور گجرات فساد کے دوران بھی یہاں تشدد نہیں ہوا۔ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے تہواروں کا انتظار کرتے ہیں۔ ہم لوگ بڑی بے تابی سے عید کا انتظار کرتے ہیں۔ البتہ جب حالات فرقہ وارانہ طور پر حساس ہو جاتے ہیں تو تھوڑا ڈر لگتا ہے'۔

جبکہ سرن کا کہنا ہے کہ ان کا بزنس مسلمانوں ہی میں چلتا ہے۔انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے خاندان کو مٹی کے برتن بیچے ہیں۔اور جب تک ریفریجریٹر کا دور نہیں آیا تھا وہ جامعہ نگر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لوگوں کو مٹی کے برتن بیچا کرتے تھے۔جب کمل سنگھ سے سوال کیا گیا کہ کیا ان حالات میں انہوں نے کبھی یہاں سے کہیں اور منتقل ہونے کے بارے میں سوچا؟ تو ان کا کہنا تھا ’فرید آباد میں رہنے والے ہمارے رشتے دار کہتے ہیں کہ یہاں چلے آؤ۔لیکن ہم یہاں سے نہیں جائیں گے، یہ ہمارا گاؤں ہے، ہمارا گھر ہے اور ہم یہاں خوش ہیں۔اور ہم یہ بھی نہیں چاہیں گے کہ اس طرح اس علاقے کو بدنام کیا جائے۔‘ کمل سنگھ یماہا موٹرس میں کام کرتے ہیں۔

وی شوبھا نے دوسرے غیر مسلموں سے بھی بات کی اور بیشتر نے کہا کہ وہ یہاں مطمئن ہیں۔بٹلہ ہاؤس میں واقع اگروال سویٹس میں کام کرنے والے راکیش کا کہنا ہے ’اس سے پہلے میں مہرولی میں مٹھائیاں بیچا کرتا تھا، میں وہیں رہتا ہوں، لیکن میں اسے زیادہ پسند کرتا ہوں، یہاں کے لوگ زیادہ مہذب ہیں‘۔اسی طرح باندہ کے باشندہ مونو کمار 2004 سے یہاں مٹھائی بیچتے ہیں۔وہ کہتے ہیں ’میرے مسلم دکان مالک نے مجھے اور بیس ہندوؤں کو رہنے کی جگہ دی ہے، میرے والدین جو کہ باندہ ہی میں رہتے ہیں بہت پریشان رہتے ہیں لیکن ہم یہاں محفوظ ہیں‘۔ایسے ہی لوگوں میں ڈاکٹر آنند کمار گپتا ہیں۔وہ نیو فرینڈس کالونی میں رہتے ہیں اور تکونہ پارک کے پاس تیس برسوں سے کلینک چلا رہے ہیں۔وہ کہتے ہیں ’اس وقت یہ سب سے سستی جگہ تھی۔میں نے یہاں سے کہیں اور جانے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔میں چھ اور سات دسمبر 1992 کو بھی اپنا کلینک کرنے آیا تھا۔حالیہ انکاونٹر کے بعد بھی میں آیا۔جامعہ نگر میں کبھی بھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔یہ علاقہ ایک جنگل سے تعلیم یافتہ اور خوشحال مسلمانوں کی کالونی بن گیا ہے۔یہاں لوگوں کے پاس سیڈان کار بھی ہے۔اس علاقہ میں کلینک کرنے پر مجھے فخر ہے‘۔

ہندی روزنامہ جن ستہ نے 22 ستمبر کے شمارے میں اپنے اداریے میں سوال اٹھایا ہے کہ 'جب بھاری تعداد میں پولیس نے اس مکان (ایل 18) کو گھیر رکھا تھا اور بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں بچی تھی تو وہ دونوں مشتبہ دہشت گرد کیسے بھاگ گئے۔ پولیس کا دعوی ہے کہ مارے گئے دو دہشت گردوں میں سے ایک انڈین مجاہدین کا ممبر تھا اور حیدرآباد، جے پور اور احمد آباد میں ہوئے سلسلے وار بم دھماکوں میں شامل تھا۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے اور پولیس کے پاس اس کی جانکاری تھی تو انہیں زندہ پکڑنے کی کوشش زیادہ ضروری تھی'۔ جبکہ 25 ستمبر کے شمارے میں اخبار نے پیپلز یونین فار ہیومن رائٹس کی جانب سے بٹلہ ہاوس انکاونٹر پر اٹھائے گئے سوالوں پر مشتمل ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔

اخبار کے رپورٹر امبریش کمار نے لکھا ہے 'انکاونٹر کے بعد سے ہی سنجر پور گاؤں پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کے نشانے پر ہے۔ گاؤں کے زیادہ تر لڑکے اپنے رشتے داروں کے یہاں دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ زیادہ تر کے موبائل بند ہیں، وہ چوری چھپے اپنے گھر والوں سے رابطہ کر رہے ہیں'۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں 'مسلم نوجوانوں کو ڈر ہے کہ دھماکوں کے نام پر کہیں انہیں پھنسا نہ دیا جائے۔ اسی درمیان پیپلز یونین فار ہیومن رائٹس کے ایک وفد نے گاؤں کا دورہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ پولیس انکاونٹر میں مارے گئے اور گرفتار کئے گئے ملزموں کے گھر والوں سے پوچھ تاچھ کے نام پر بدسلوکی کر رہی ہے۔ خواتین سے ناشائستہ سلوک کیا گیا اور مذہب کے حوالے سے گالیاں دی گئیں۔ پی یو ایچ آر نے انکاونٹر کو مشتبہ بتاتے ہوئے سپریم کورٹ کے سٹنگ جج سے پورے معاملے کی جانچ کا مطالبہ کیا ہے۔ پولیس کے چھاپے سے لوگ دہشت زدہ ہیں۔ انکاونٹر میں ہلاک ساجد کے بھائی زاہد کا کہنا ہے کہ میرے بھائی کی عمر سولہ سال تھی اور پولیس اسے پانچ سال پہلے کے دھماکے میں ملوث بتا رہی ہے۔ کیا گیارہ سال کی عمر میں ہی وہ دہشت گرد بن گیا تھا۔ دلی دھماکوں کا ماسٹر مائنڈ مانے جانے والے

عاطف کے اکاونٹ میں محض 1409 روپے نکلے۔ اسی طرح دیگر کھاتوں میں رقم کچھ ہزار تک ہی محدود رہی‘۔

اخبار مزید لکھتا ہے کہ ایک ٹی وی چینل نے بھی اس خبر کو نمایاں انداز میں پیش کیا تھا لیکن جب یہ خبر غلط نکلی تو اس نے اس کی صفائی تک نہیں پیش کی۔ رپورٹر نے انسانی حقوق تنظیم کے ایک رکن کے حوالے سے کہا ہے کہ پولیس کو اب یہ بتانا چاہئے کہ اس نے یہ الزام کس بنیاد پر لگایا تھا۔ تنظیم کے رکن شاہنواز عالم نے کہا کہ ہلاک اور گرفتار شدگان کو لکھنؤ سے لے کر سنکٹ موچن مندر دھماکوں کا ماسٹر مائنڈ بتایا گیا اگر یہ سچ ہے تو سنکٹ موچن دھماکے کے سلسلے میں اصل ملزم ولی اللہ کو دس سال اور پانچ ملزموں کو پانچ پانچ سال کی سزا کیوں دی گئی۔ پی ایچ یو آر نے دعوی کیا کہ بٹلہ ہاوس انکاونٹر مشکوک نظر آرہا ہے۔ اس نے پولیس انسپکٹر کی موت کے سلسلے میں بھی سوال اٹھائے ہیں۔

ان اخباروں کی مانند دوسرے انگریزی اور ہندی روزناموں نے بھی تقریباً وہی باتیں لکھی ہیں اور وہی سوالات اٹھائے ہیں جو اردو اخباروں نے اٹھائے ہیں۔ لیکن ایک طبقہ صرف اردو میڈیا اور مسلمانوں کو ہی تختۂ مشق بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ جبکہ صحافتی غیر جانبداری کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسرا نقطۂ نظر بھی پیش کیا جائے لیکن اردو میڈیا سے مخاصمت رکھنے والوں سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے اس مضمون میں جو مثالیں دی ہیں وہ انہی اخبارات سے دی ہیں جن سے پروفیسر سنہا نے مثالیں پیش کی ہیں۔ لیکن انہوں نے جان بوجھ کر ان خبروں کو نظر انداز کیا یا پس پشت ڈال دیا جو ان کے مطلب کی نہیں تھیں۔ یہ رویہ دیانتداری کے سراسر خلاف ہے۔

سلسلے وار بم دھماکے اور میڈیائی دہشت گردی

جے پور، بنگلور اور احمد آباد کے بم دھماکوں کے بعد راجدھانی دہلی میں بھی جب سلسلے وار بم دھماکے ہوئے تو بجا طور پر پورے ملک میں کہرام مچ گیا اور یہ کہا جانے لگا کہ جب راجدھانی خود محفوظ نہیں ہے تو دوسرے شہروں اور مقامات کے تحفظ کی کیا بات کی جائے۔ بات سچ بھی ہے۔ دہلی ملک کا دل ہے اور یہاں پارلیمنٹ اور پوری حکومت موجود ہے۔ دہلی میں جتنی سخت سیکورٹی ہوتی ہے اور کہیں نہیں ہوتی اور اگر یہاں ایک پتہ بھی کھڑکتا ہے تو پورے ملک میں زلزلہ آجاتا ہے۔ اس کے باوجود یہاں سیریل بلاسٹ ہوئے اور متعدد لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔

ان واقعات کے بہت دنوں کے بعد بھی دہلی میں خوف و ہراس کا ماحول قائم رہا اور قومی نیوز چینلوں پر ان دھماکوں سے متعلق اتنی رپورٹیں آرہی تھیں کہ ایسا لگتا تھا کہ یہ ابھی کل کا واقعہ ہے۔ ان رپورٹوں کی بھرمار پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، ہمیں اعتراض نیوز چینلوں کے انداز کار پر ہے۔ دہشت گردوں کا ایک مقصد جہاں تخریبی سرگرمیاں انجام دے کر لوگوں کو ہلاک کرنا ہوتا ہے وہیں ایک دوسرا مقصد عوام میں خوف و ہراس پھیلانا بھی ہوتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اپنی رپورٹوں کے ذریعے خوف و دہشت کا ماحول پیدا کرکے دہشت گردوں کے دوسرے مقصد میں ان کو بھرپور تعاون دیتا ہے۔ اس وقت بھی نیوز چینلوں نے اپنی رپورٹوں سے پورے ملک میں دہشت پیدا کر دی تھی اور چند ایک کو چھوڑ کر

تمام چینلوں کا یہی حال تھا کہ وہ خوف و ہراس سے بھرپور ماحول پیدا کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ جب بھی ایسا کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو ان چینلوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ آپ کوئی بھی نیوز چینل آن کیجئے ایسا لگتا ہے کہ پورا ملک دہشت گردی کے آتش فشاں پر بیٹھا ہوا ہے اور یہ آتش فشاں بس پھٹنے کو تیار ہے۔ دہلی میں سلسلے وار بم دھماکوں کے کافی دنوں بعد تک میڈیائی رپورٹوں سے یہی تاثر ملتا تھا کہ ملک کے سب سے بڑے دشمن مسلم نوجوان ہیں اور وہ نوجوان جو کمپیوٹر انجینئر ہیں یا کمپیوٹر کی معلومات رکھتے ہیں' چلتے پھرتے انسانی بم ہیں۔ اگر ان کو ڈی فیوز نہیں کیا گیا تو وہ پورے ملک کو خاک وخون میں لت پت کر دیں گے۔

اس وقت الیکٹرانک میڈیا' بعض چینلوں کو چھوڑ کر' ایک ہسٹیریا میں مبتلا تھا اور دیوانگی کی حد تک مسلم مخالف کوریج کر رہا تھا۔ ایسے موقع پر نیوز چینل خود ساختہ طور پر عدالتوں کا فریضہ بھی انجام دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس وقت ملک میں دو قسم کے نظام عدل متوازی طور پر چل رہے ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ ایک نظام عدل وہ ہے جسے کورٹ سسٹم کہتے ہیں اور دوسرا وہ ہے جسے نیوز چینلوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ لوگ جس کو چاہیں مجرم بنا دیں اور جس کو چاہیں ہندوستان کا غدار قرار دے دیں۔ یہ ایسی عدالتیں ہیں جہاں نہ کیس داخل ہوتا ہے' نہ جرح ہوتی ہے اور نہ گواہیاں ہوتی ہیں۔ بس براہِ راست فیصلے سنا دئے جاتے ہیں۔ اور ان فیصلوں میں کسی کو باعزت بری کرنے کا قانون لاگو نہیں ہوتا بلکہ سب کو یک لخت مجرم قرار دے دیا جاتا ہے۔ لیکن اس ٹرائل بائی میڈیا پر انگلش لگانے کے لئے کوئی آواز نہیں اٹھتی اور کوئی احتجاج نہیں ہوتا۔ جب اس سے پہلے پولیس نے سیمی کے لیڈر صفدر ناگوری کے بارے میں بتایا کہ وہ ملک میں دھماکوں کا ماسٹر مائنڈ ہے تو میڈیا نے ایسا شور وغوغہ کیا کہ جیسے ناگوری کو اگر پھانسی پر نہیں چڑھایا گیا تو ملک کی خیر نہیں۔ اس کے بعد ابوالبشر کو ماسٹر مائنڈ بتایا گیا تو اس کے بارے میں بھی میڈیا نے اسی طرح آسمان سر پر اٹھایا اور جب عبدالسبحان عرف توقیر قریشی کو

دہلی اور احمد آباد دھماکوں کا ماسٹر مائنڈ بتایا گیا تو اس وقت بھی میڈیا اس کو ملک کا غدار اور پورے عوام کا دشمن بتا رہا تھا۔ ایسے مواقع پر اس خوفناک انداز میں رپورٹنگ کی جاتی ہے کہ کمزور دل کے لوگوں کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں اور ہارٹ اٹیک کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ چن چن کر ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ برادران وطن کے دلوں میں پوری مسلم قوم کے خلاف نفرت کا لاوا پھوٹنے لگے۔

ہم کسی کی حمایت نہیں کر رہے ہیں۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو اسے یقیناً سخت سے سخت سزا ملنی چاہئے۔ لیکن فرد جرم عائد کئے بغیر، عدالتوں میں مقدمہ چلائے بغیر اور بحث و جرح کے مرحلے سے گزارے بغیر صرف پولیس کے بیانات کی بنیاد پر کسی کو خطرناک دہشت گرد قرار دے دینا کہاں کا انصاف ہے۔ میڈیا کا کام غیر جانبدارانہ انداز میں خبر دینی اور رپورٹنگ کرنی ہے۔ اس کا کام کسی کے خلاف فیصلے سنانا نہیں ہے۔ اس کے لئے عدالتیں موجود ہیں۔ ان کو اپنا کام کرنے دیجئے۔ آپ اپنا کام کیجئے۔ جب کبھی عدالتیں زیادہ سرگرم ہو جاتی ہیں تو یہی میڈیا ان پر اوور ایکٹی وزم کا الزام لگاتا ہے لیکن جب میڈیا خود اسی راستے پر چل پڑے تو اس کو کیا کہا جائے۔ میڈیا کے ذمہ داروں کو اپنے گریبان میں منھ ڈال کر سوچنا چاہئے کہ کہیں وہ اپنے دائرہ اختیار سے باہر تو نہیں جا رہے ہیں۔

جب توقیر کی ماں نے ممبئی میں پریس کانفرنس کر کے کہا کہ ان کا بیٹا بے قصور ہے اور اگر قصوروار ہے تو اس کو سرعام ایسی سزا دی جائے جس سے دوسرے بھی عبرت پکڑیں، تو اس خبر کو بیشتر نیوز چینلوں نے دکھایا لیکن اپنے اپنے انداز میں۔ کئی چینلوں نے زبیدہ قریشی کی پریس کانفرنس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی کہ توقیر دہشت گرد ہے۔ ایسے ایسے احمقانہ سوالات اٹھائے گئے جن کے جواب بھی نہیں دیے جا سکتے۔ ایک نیوز چینل نے توقیر کے وکیل محمد مبین سے انٹرویو کیا اور اپنے سوالوں سے ان کو بھی پھنسانے کی کوشش کی۔ ایک وکیل کی ذمہ داری اپنے موکل کا دفاع کرنا ہے۔ لیکن اس پر بھی مبین ایڈووکیٹ کو گھیرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ توقیر کی حمایت کر رہے ہیں۔ جب رام جیٹھ ملانی جیسے سینئر اور بزرگ

وکیل خطرناک قسم کے مجرموں کا کیس لڑتے ہیں تو ان چینلوں کے ذمہ داروں میں اتنی جرات نہیں ہوتی کہ وہ ان سے پوچھیں کہ ان کے منھ میں کتنے دانت ہیں۔لیکن جب معاملہ تو قیر جیسے مسلم نوجوانوں کا ہو اور وکیل دفاع مبین جیسے مسلم نوجوان ہوں تو انھیں وکیل بھی مشکوک نظر آنے لگتے ہیں۔ مذکورہ چینل نے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی کہ تو قیر کی ماں نے جو پریس کانفرنس کی وہ ایک سیاسی معاملہ تھا۔ جب یہ بتایا گیا کہ اس میں سیاستداں نہیں تھے بلکہ سرکردہ مسلم شخصیات تھیں تو یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش کی جانے لگی کہ انھوں نے بی جے پی اور دوسری سیاسی جماعتوں پر نکتہ چینی کی تھی۔ گویا اگر عام لوگ بھی کسی معاملے پر کسی سیاسی جماعت پر نکتہ چینی کریں تو ان کے مطابق وہ معاملہ سیاسی بن جاتا ہے۔

تاریکی میں امید کی کرن

لیکن اسی کے ساتھ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ تمام نیوز چینل ایسے نہیں ہیں جو عصبیت اور جانبداری کی اس بہتی دھارا میں گلے گلے تک ڈوبے ہوں۔ان میں این ڈی ٹی وی جیسے میڈیا ادارے بھی ہیں جو جذباتیت اور جانبداری سے نہیں بلکہ انصاف پسندی سے کام لیتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ میڈیائی دہشت گردی کی اس خوفناک تاریکی میں این ڈی ٹی وی امید وبیم کی ایک روشن کرن ہے۔ ایسے ہی نیوز چینلوں سے میڈیا کا وقار قائم ہے اور جب تک ایسے چینل رہیں گے میڈیا پر عوام کا اعتماد بھی باقی رہے گا۔

مسلمانوں کی جانب سے بار بار یہ بات اٹھائی جاتی ہے کہ دہشت گردانہ واقعات کی جانچ صحیح سمت میں نہیں چل رہی ہے اور جب بھی کوئی واقعہ ہوتا ہے تو پولیس صرف اسی پہلو پر جانچ کرتی ہے کہ اس میں مسلمان ملوث ہوں گے۔ جبکہ متعدد بم دھماکوں میں بجرنگ دل کے لوگ بھی ملوث پائے گئے ہیں۔ کانپور میں تو بم بناتے ہوئے بجرنگ دل کے دو لیڈر بھی مارے گئے اور ان کے گھروں سے ڈھیر سارا دھما کہ خیز مادہ بھی برآمد کیا گیا۔لیکن مسلمانوں کی جانب سے بار بار کے مطالبے کے باوجود تحقیقات کی سمت اور رخ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جارہی۔

این ڈی ٹی وی انڈیا نے ۱۷ستمبر 2008 کی شب میں اپنے نصف گھنٹے کے پروگرام ''خبروں کی خبر'' میں اس معاملے کو اٹھایا اور شدت کے ساتھ یہ سوال پوچھا کہ کیا دہشت گردانہ واقعات کی جانچ صحیح سمت میں اور صحیح خطوط پر چل رہی ہے۔اس تجزیاتی پروگرام میں اس پر زور دیا گیا کہ صرف اس پہلو پر جانچ نہ کی جائے کہ دہشت گردی میں مسلمان ہی ملوث ہیں۔ذرا دوسرے آنگنوں میں بھی جھانکنے کی زحمت اٹھائی جائے۔کہیں دہشت گردی کے ڈانڈے ان گوشوں سے تو نہیں ملے ہوئے ہیں۔اس کا بھی تجزیہ کیا گیا کہ اگر مسلم نوجوان واقعی دہشت گردی کی راہ پر چل پڑے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ کیا ہے۔بابری مسجد انہدام سے لے کر گجرات کے بدترین مسلم کش فسادات تک پر اجمالی روشنی ڈالی گئی اور یہ پوچھا گیا کہ کیا دہشت گردی کی جڑیں ان واقعات میں تو پنہاں نہیں ہیں۔یہ بھی کہا گیا کہ اگر مسلم نوجوان دہشت گردی کے قصوروار ہیں تو مذکورہ واقعات کے ذمہ داران بھی اتنے ہی مجرم ہیں۔این ڈی ٹی وی نے انتہائی مدلل انداز میں بتایا کہ کس طرح شک کی سوئی ایک فرقہ کی طرف موڑ دی گئی ہے۔اس نے پولیس کے ذریعے بم دھماکوں کے ماسٹر مائنڈ کی تھیوری کا بھی مذاق اڑایا اور کہا کہ اتنے سارے ماسٹر مائنڈ کہاں سے پیدا ہورہے ہیں۔پولیس ہر بار ایک نیا ماسٹر مائنڈ کہاں سے تلاش کر لیتی ہے۔اس نے یہ چبھتا ہوا سوال کیا کہ جب اصل ماسٹر مائنڈ کو پولیس پکڑ لیتی ہے تو پھر ماسٹر مائنڈوں کی قطار کہاں سے لگ رہی ہے۔کسی چینل پر پہلی بار اس قسم کی بحث شروع کی گئی۔اسے اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ آج حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔لیکن اس کے اصل ذمہ دار کون لوگ ہیں اس پر غور کیا جانا چاہئے۔ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ میڈیا اپنا دہشت گردانہ مزاج بدلے اور غیر جانبداری کے اصول پر کاربند ہوکر اپنا فریضہ انجام دے تاکہ اصل مجرموں کو پکڑا جا سکے اور ملک سے دہشت گردی کا خاتمہ کیا جا سکے۔

میں یہاں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ میڈیا ہمیشہ ہی خوف و دہشت کا ماحول بناتا ہو،ایسا نہیں ہے۔بلکہ وہ بیشتر معاملات میں غیر جانبدار اور مبنی برانصاف رپورٹنگ کرتا

ہے۔لیکن جب دہشت گردی کا معاملہ ہوتو وہ عموماً یکطرفہ ٹریفک چلانے لگتا ہے اور پولیس کے بیانات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا ہے۔ بہر حال میں بابری مسجد انہدام کی جانچ کرنے والے جسٹس لبراہن کمیشن کی رپورٹ کے حوالے سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔انہدام کے وقت الیکٹرانک میڈیا کا دائرہ بہت محدود تھا اور نیوز ٹریک نامی ایک الیکٹرانک میگزین ہی تھا، اس وقت پرائیویٹ چینل زیادہ نہیں تھے۔ کچھ غیر ملکی چینل تھے، جنھوں نے انہدام کے مناظر دکھائے تھے۔ اس وقت پرنٹ میڈیا کے نمائندوں نے جس طرح بے باکی سے کوریج کی تھی، وہ اپنی مثال آپ تھی۔اخبارں کے رپورٹروں اور نمائندوں نے نام نہاد کارسیوکوں کی غنڈہ گردی پر کھل کر لکھا تھا اور اسے فسطائی دہشت گردی قرار دیا تھا، انھوں نے کارسیوکوں کو غنڈے اور سنگھ پریوار کوان کا سرغنہ قرار دیا تھا۔

اب جبکہ جسٹس لبراہن کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آ گئی ہے، تو اس پر بھی پرنٹ میڈیا نے زبردست کوریج کی ہے اور آٹھ کروڑ روپے کے صرفے اور سترہ سال کی مدت لگانے کے بعد جو رپورٹ سامنے آئی ہے اس کی خامیوں کو کھل کر اجاگر کیا ہے۔انھوں نے رپورٹ میں اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہاراؤ کو کلین چٹ دینے پر کمیشن کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور کہا ہے کہ اس رپورٹ میں کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے کہ جو لوگوں کو نہ معلوم ہو۔تاہم بیشتر مضامین میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اب وہ ایک سرکاری دستاویز ہے اس لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ اس وقت کے مرکزی وزیر ایم ایل فوتیدار نے انہدام کے خلاف بطور احتجاج وزارت سے استعفا دیدیا تھا۔اخبارات نے لکھا ہے کہ کمیشن نے ان جیسے لوگوں سے جرح کیوں نہیں کی۔اس طرح موجودہ میڈیا نے کمیشن رپورٹ کی خوبیوں کو جہاں سراہا ہے وہیں انھوں نے اس کی خامیوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔غرضیکہ انصاف سے کام لیا ہے۔ اس طرح جہاں میڈیا کا ایک حصہ مسلمانوں کے معاملے میں یکطرفہ رپورٹنگ کرتا ہے وہیں بڑا حصہ غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔جس کے لیے اسے بہر حال مبارکباد پیش کی جانی چاہئے۔

بٹلہ ہاؤس اِنکاونٹر اور میڈیا رپورٹنگ

میڈیا بعض اوقات اپنی رپورٹنگ کے دوران ایک فریق بن جاتا ہے اور اگر معاملہ مسلمانوں اور دہشت گردی کی رپورٹنگ کا ہو تو اچانک اس کے لب و لہجے میں تلخی و ترشی آجاتی ہے۔ اس کے رپورٹروں کی آستینیں چڑھ جاتی ہیں اور وہ انتہائی جوش و جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر آتش نوا رپورٹر ماحول کو مزید پراگندہ کر دیتے ہیں اور پر امن فضا میں مسلم مخالف منافرت کی بارود بھر دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی منظر بٹلہ ہاؤس انکاونٹر کی رپورٹنگ کے دوران دیکھنے کو ملا تھا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے میڈیا بھرے بازار میں ننگا ہو گیا ہو۔ کئی دنوں تک زبردست طوفان بدتمیزی برپا رہا اور پورے ملک کے مسلمانوں کو شکوک و شبہات کے دائرے میں لا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ بیشتر نیوز چینلوں اور اخباروں نے مسلمانوں کے گلے میں دہشت گردی کا پٹہ ڈالنا اپنا فرض منصبی تصور کر لیا تھا۔ دو تین روز تک تو انکاونٹر کی آڑ میں مسلمانوں کے خلاف جو زہر افشانی کی گئی تھی اس کی مثال نہیں ملتی۔

پہلے یہ تأثر دینے کی کوشش کی گئی کہ آج کا مسلم طبقہ انتہائی خونخوار ہو گیا ہے اور اب نہ صرف مدارس کے طلبہ بلکہ کالج اور یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس بھی لائیو بم میں تبدیل ہو گئے ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا اسٹوڈنٹ اسامہ بن لادن کا مداح اور سیمی و انڈین مجاہدین کا خطرناک کارکن ہے۔ جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس وقت کے وائس چانسلر

پروفیسر مشیر الحسن نے جامعہ کے دو طلبہ شکیل اور ضیاء کو، جنھیں دہشت گردی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا، قانونی مدد فراہم کرنے کا اعلان کیا تو ایسا لگا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو اور چینلوں کے ذریعے زبردست ہنگامہ آرائی کی گئی اور یہ کہا گیا کہ سرکاری پیسے سے دہشت گردوں کی مدد کی جا رہی ہے۔اسی طرح جب ارجن سنگھ نے وی سی کے فیصلے کی تائید کی تو ایک بار پھر جامعہ مخالفین نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور وی سی کے ساتھ ساتھ ارجن سنگھ کی بھی مذمت کی جانے لگی۔ نیوز چینلوں نے ارجن سنگھ کے بیان کو کم اور بی جے پی لیڈر روی شنکر پرساد اور ارون جیٹلی کے بیانات کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ انھوں نے جامعہ کے اس قدم کی مخالفت کی تھی اور وی سی کو برطرف کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ان کی دریدہ دہنی پر تب کہیں جا کر کچھ تھوڑی بہت لگام لگائی جا سکی جب ملک کے انصاف پسند طبقے کی جانب سے انکاونٹر کی سچائی اور انسپکٹر شرما کی موت پر سوالیہ نشان لگائے گئے۔اور انکاونٹر کو مشکوک بتایا جانے لگا۔ جب میڈیا کی زہر افشانی پر چاروں طرف سے یلغار ہوئی تب کہیں جا کر اس کے لب و لہجے کی شدت میں کچھ کمی آئی۔ تاہم اس دوران یہ کوشش بھی کی جاتی رہی کہ مسلمانوں اور جامعہ کی امیج داغدار ہو جائے۔ جانبدارانہ رپورٹنگ کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک چینل کو چھوڑ کر کسی نے بھی مقامی باشندوں کے خیالات پر مبنی کوئی پروگرام نہیں دکھایا۔ رپورٹنگ کے دوران اگر کسی نے انکاونٹر، پولیس کی جانبداری یا میڈیا کی زہر افشانی پر کچھ کہنے کی کوشش کی تو بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا جاتا تھا۔

اس درمیان انسانی حقوق کے کارکنوں اور بعض سیاست دانوں نے بٹلہ ہاوس کا دورہ کیا اور حکومت و پولیس کے رویے پر شکوک وشبہات کی انگلی اٹھائی تو اس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ البتہ اگر کوئی سڑک چھاپ نیتا بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی بیان دیتا تو اس کو نمایاں انداز میں پیش کیا جاتا۔ البتہ انکاونٹر کے تیسرے روز سہارا این سی آر نے ایک نصف گھنٹے کے پروگرام میں جامعہ کے طلبہ کو کھل کر بولنے کا موقع دیا لیکن چونکہ اس کو بہت زیادہ لوگ نہیں دیکھتے اس لئے وہ پروگرام بڑے حلقے تک نہیں پہنچ سکا۔ تاہم چینل کی

اس کوشش کا خیر مقدم ضرور کیا گیا۔ جب جامعہ کے طلبہ نے کیمپس میں ایک خاموش جلوس نکالا جس میں وی سی اور بڑی تعداد میں اساتذہ نے بھی شرکت کی تو نیوز چینلوں کو اس کی اطلاع ہی نہیں ہوسکی۔ وہ چینل جو انتہائی معمولی اور خفیہ باتوں کا بھی علم رکھتے ہیں اس زبردست جلوس سے لاعلم ہی رہے۔ بات صرف یہیں تک محدود ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ بات تو یہاں تک پہنچ گئی کہ جب نصف درجن سے زائد مسلم جماعتوں پر مشتمل انڈین مسلم کوآرڈینیشن کمیٹی نے جمعۃ الوداع کو پارلیمنٹ اسٹریٹ کے نزدیک جنتر منتر پر عظیم الشان مظاہرہ کیا تو اس کی آواز بھی ان بہرے رپورٹروں کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔ اس عظیم الشان احتجاجی مظاہرہ کی کوئی خبر نہ تو پرنٹ میڈیا میں دکھائی دی تھی اور نہ ہی الیکٹرانک میڈیا میں۔ بعض اخبارات نے ایک دو کالمی خبر لگا کر جیسے اپنی ذمہ داری پوری کر دی تھی۔ لیکن نیوز چینلوں کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ بہت بڑی خبر صرف اردو اخبارات کی زینت بن کر رہ گئی تھی۔ اوکھلا علاقہ کے اس وقت کے ممبر اسمبلی پرویز ہاشمی نے پولیس کارروائی اور جامعہ کو بدنام کرنے کی مہم کے خلاف جب پریس کانفرنس کی تو اس میں بیشتر چینلوں کے رپورٹر موجود تھے لیکن رپورٹ کہیں نظر نہیں آئی۔ ہاں صرف ایک چینل جامعہ کو بدنام کرنے کی مہم میں شامل نہیں تھا، اس کی ایک خاتون رپورٹر مسلسل دو روز تک جامعہ میں موجود رہی اور صحافتی دیانتداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاملے کے دوسرے پہلو کو بھی پیش کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ متعدد صحافیوں سے جب اس سلسلے میں میری بات ہوئی تو انھوں نے نیوز چینلوں کے رویے کو صحافتی اصولوں کے منافی قرار دیا اور کہا کہ کسی بھی معاملے کے دوسرے پہلو کو بھی پیش کرنا صحافیوں کی ذمہ داری ہے۔ لیکن بیشتر صحافیوں نے اپنی اس ذمہ داری سے عمداً اور عملاً پہلو تہی کی جس کے نتیجے میں پورے حقائق سامنے نہیں آسکے۔ بہر حال جب بہت زیادہ اعتراض ہونے لگا تب کہیں جا کر عزائم پسند رپورٹروں کی مہم کی شدت کم ہوئی اور علاقے میں سکون و اطمینان کی ایک فضا قائم ہوسکی۔

میڈیا کی بد نیتی اور اس سے بھی زیادہ دروغ گوئی کی ایک مثال اور ملاحظہ

فرمائیں۔ مڈبھیڑ میں ہلاک ہوئے اور گرفتار کئے گئے طلبہ کے سلسلے میں ایسی ایسی کہانیاں نمک مرچ لگا کر پیش کی گئیں کہ جھوٹ نے بھی شرم و حیا سے اپنا منھ چھپا لیا۔ یوں تو پولیس اور میڈیا کے تعلقات کوئی بہت خوشگوار نہیں رہتے اور پولیس کی زیادتی کی خبریں نمایاں انداز میں دکھائی جاتی ہیں۔لیکن جب معاملہ مسلمانوں کا ہو تو دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور پھر مشترکہ مہم شروع ہو جاتی ہے۔ اس معاملے میں بھی یہی ہوا۔ پولیس نام نہاد دہشت گردوں اور مسلمانوں کے بارے میں بے بنیاد مگر خطرناک اطلاعات چپکے سے میڈیا کو لیک کر دیتی اور پھر میڈیا اس بے بنیاد اطلاع کی بنیاد پر دروغ گوئی کا فلک بوس محل کھڑا کر دیتا لیکن جب وہ محل حقائق کی ٹھوس چٹانوں سے ٹکراتا تو پاش پاش ہو جاتا اور پولیس اور میڈیا کی ملی بھگت کی قلعی کھل جاتی۔ان جھوٹی کہانیوں کی آڑ میں دہلی سے اعظم گڑھ اور سنجر پور تک ایک ایسی فضا تشکیل دے دی گئی تھی کہ جہاں بھی کوئی مسلمان نظر آتا لوگ اسے دہشت گرد تصور کرنے لگتے۔اب تو میڈیا اور پولیس کی کرم فرمائیوں سے ایسے واقعات بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں کہ اگر کوئی لمبی داڑھی اور کرتا پائجامے میں ملبوس شخص کسی غیر مسلم کالونی سے گزر جائے تو بچے تو بچے بڑے بھی اس کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

میڈیا نے اعظم گڑھ، سرائے میر، سنجر پور اور دوسرے مقامات میں مسلمانوں کی خوشحالی کو بھی نشانہ بنایا اور نوجوانوں کے ذریعے پاس پورٹ کی درخواستوں کو بھی شک کے دائرے میں لانے کی کوشش کی۔لیکن کیا ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ آج تعلیم یافتہ طبقہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، بہتر مستقبل کی خاطر دوسرے ممالک کا رخ کر رہا ہے۔لیکن اعظم گڑھ کے نوجوان جب ایسا کرتے ہیں تو اس کا سلسلہ دہشت گردی سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔مہم جو رپورٹروں نے یہ بھی پتہ لگا لیا کہ اعظم گڑھ میں کتنا زرمبادلہ آتا ہے اور اس پر بھی سوال کھڑے کئے گئے کہ ہر ماہ لاکھوں روپے کس مقصد سے آتے ہیں۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ غیر ممالک میں فون کال کرنے کی تفصیلات یکجا کر لی گئیں اور یہ پوچھا جانے لگا کہ ڈبل زیرو والے نمبروں پر زیادہ فون کیوں ہوتے ہیں۔کیا ان کور چشموں کو یہ نہیں معلوم کہ جب

اعظم گڑھ کے ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد باہر رہتا ہے اور ملازمت ومزدوری کرتا ہے تو لوگ وہاں فون نہیں کریں گے تو کیا ان کے گھر کریں گے۔

میڈیا کی بدنیتی اس وقت بھی دیکھنے کو ملی جب بٹلہ ہاوس انکاونٹر کے ایک ہفتہ بعد مہرولی علاقے میں بم دھماکہ ہوتا ہے۔اس وقت بھی یہ کوشش کی گئی کہ اس کا سرا مسلمانوں سے جوڑ دیا جائے۔میڈیا نے پولیس کے حوالے سے یہ ضرور بتایا کہ اس سلسلے میں دو لوگ پکڑے گئے ہیں لیکن ان کے نام راز میں رکھے گئے اور آج تک زیادہ لوگوں کو نہیں معلوم کہ وہ کون تھے۔وجہ صاف ہے کہ وہ دونوں مسلمان نہیں تھے۔جبکہ دھماکے میں زخمی ایک مسلمان سے جو کہ اسپتال میں موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا تھا' پولیس نے اپنی عادت اور فطرت کے مطابق پوچھ تاچھ کی اور اس کا تعلق دہشت گردی سے جوڑنے کی گھناونی کوشش کی۔میڈیا نے بلند آواز میں بتایا کہ اس کا نام علاء الدین ہے اور اس پر بم لے کر جانے کا شبہہ ہے۔پولیس نے جب اس دھماکے کو مسلمانوں سے جورنے کے لئے بنگلہ دیشی 'کنکشن' کا انکشاف کیا تو بیشتر چینل اس کو لے اڑے اور دہلی میں مقیم بنگلہ دیشیوں کے خلاف ایک مہم شروع ہوگئی۔اسی درمیان ایک چینل ابوالبشر کو راون بتا تا رہا اور کئی روز تک اس کے دس سر دکھا کر اس کی مبینہ دہشت گردی کی فرضی کہانیاں مزے لے لے کر سنا تا رہا۔ ایک چینل نے تو فرضی کردار پکڑ کر ایک داڑھی والے نوجوان سے ابوالبشر کا رول کروایا اور دو لوگوں کو پولیس کی شکل میں اس سے پوچھ تاچھ کرتے دکھایا گیا جس کے دوران وہ فرضی کردار متعدد دھماکوں میں اپنا رول قبول کرتا رہا اور چینل بڑے فخر کے ساتھ یہ بتا تا رہا کہ اس نے ابوالبشر کی زبانی اس کی خطرناک کہانی عوام کے سامنے پیش کر دی ہے۔ایک چینل نے مقتول عاطف کی فرضی محبوباؤں کی کہانی قسطوار پیش کی۔

اس معاملے میں الیکٹرانک میڈیا کا رول انتہائی گھناونا رہا جبکہ پرنٹ میڈیا نے اس قدر جانبداری کا مظاہرہ نہیں کیا۔انڈیا ٹوڈے نے جہاں دہشت گردی کے خلاف لڑائی لڑنے کی بات اپنے خاص انداز میں کہی وہیں اس نے بجرنگ دل کی دہشت گردی کو بھی پابہ

زنجیر کرنے کی بات اٹھائی۔اس کے باوجود ہندی اور انگریزی کے بعض اخبارات مسلم مخالف مہم میں پیش پیش رہے۔لیکن چونکہ پرنٹ میڈیا کی خطرناک رپورٹنگ کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا الیکٹرانک میڈیا کا ہوتا ہے لہذا اس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اخبارات جو پہلے مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ رپورٹنگ کرتے تھے اب دہشت گردانہ رپورٹنگ کر رہے ہیں۔تاہم پرنٹ میڈیا کی خطرناک رپورٹنگ کا اثر فوری طور پر نہیں ہوتا جبکہ الیکٹرانک میڈیا فوری طور پر اور بیک وقت پورے ملک میں آگ لگا دیتا ہے۔ پھر بھی بعض اخبارات ایسے بھی ہیں جو حق و انصاف سے کام لے لیتے ہیں اور مسلمانوں کے زخموں پر مرہم پاشی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مثال کے طور پر اخبار ہندوستان ٹائمز نے جہاں بم دھماکوں کے مبینہ ماسٹر مائنڈ توقیر کو ہندوستان کا اسامہ بن لادن بتایا اور ایک معمولی سی بات کو بتنگڑ بنا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ جامعہ نگر کے علاقے کو ملٹی نیشنل کمپنیوں اور یہاں تک کہ پزا اور کوریئر والوں نے بلیک لسٹڈ کر دیا ہے وہیں اس نے چند ایسے مضامین بھی شائع کئے جو کئی معاملات میں مسلمانوں کے موقف کی تائید کرتے تھے۔

بہر حال بٹلہ ہاوس انکاونٹر سے متعلق میڈیا کی جانبداری کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔اب بھی کوئی نہ کوئی بھولی بھٹکی رپورٹ یہ بتانے کے لئے آجاتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو دہشت گرد ہے یا دہشت گردوں کی حامی ہے۔(یہ تفصیل میڈیا کی جانبداری اور مسلمانوں کے تئیں اس کے گھناونے رویے کی محض ہلکی سی جھلک ہے ورنہ حقائق اس سے بھی کہیں بھیانک ہیں۔)

رائی کو پربت بنانے کا فن

(میڈیا کمالات کا ایک نمونہ)

کہتے ہیں کہ جب روم جل رہا تھا تو وہاں کا بادشاہ نیرو بنسی بجا رہا تھا۔اسی طرح جب راجدھانی دہلی پے بہ پے بم دھماکوں سے لرز رہی تھی اور ہلاک شدگان کے اعزاء و اقرباا ور زخمیوں کی چیخ و پکار سے ایوان اقتدار کے در و بام کانپ رہے تھے تو میڈیا کے مطابق مرکزی وزیر داخلہ شیوراج پاٹل سوٹ پر سوٹ بدل رہے تھے۔یوں تو پورے ملک کے تحفظ کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے لیکن داخلی سلامتی کی ذمہ داری بطور خاص مرکزی وزیر داخلہ کی ہوتی ہے۔اور پھر اگر راجدھانی میں ایسے واقعات ہو رہے ہوں تو پھر پوری حکومت کٹہرے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ایسے میں اگر وزیر داخلہ واقعی بار بار لباس تبدیل کرنے کو لاء اینڈ آرڈر پر ترجیح دے رہا ہو تو یقیناً یہ بات تشویشناک ہے۔نیوز چینلوں کے بقول شیو راج پاٹل نے پانچ گھنٹے کے اندر تین بار نئے سوٹ بدلے اور ہر بار ایک سے ایک بند گلے کے نفیس و نستعلیق لباس میں جلوہ گر ہوئے۔

نیوز چینلوں میں غضب کی مقابلہ آرائی کے سبب کوئی معمولی سا واقعہ بھی غیر معمولی بن جاتا ہے اور اس ایشو کو اتنی ہوا دی جاتی ہے کہ چھوٹی سی چنگاری بھی شعلہ جوالہ بن جاتی ہے۔کچھ ایسا ہی ہوا شیوراج پاٹل کے نفیس و نستعلیق لباس کے ساتھ۔ایک چینل کی تیز نظر نے دیکھ لیا کہ شام ساڑھے چار بجے پاٹل صاحب کسی اور سوٹ میں تھے، ساڑھے چھ بجے کسی اور میں اور ساڑھے آٹھ بجے کسی اور میں۔بس پھر کیا تھا مل گیا ایک گرما گرم موضوع۔

اس میں نمک مرچ لگانے کی بھی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ سلسلے وار دھماکوں سے لوگوں کے جذبات پہلے ہی بھڑکے ہوئے تھے اور حکومت کی ناکامی پر ان میں زبردست اشتعال موجود تھا۔ ایسے میں جب یہ گرما گرم خبر آئی تو وزیر داخلہ کو صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ بعض چینلوں نے شام سے جو اس ٹیپ کو بجانا شروع کیا تو وہ اگلے دن بھی پوری شدت سے اسے بجاتے رہے۔ سوء اتفاق تیسرے روز دہلی میں انڈیا پیسفک ریجن کے تیرہ ممالک کا ایک سمینار ہونے والا تھا اس کا موضوع دہشت گردی ہی تھا اور اس کا افتتاح شیوراج پاٹل ہی کو کرنا تھا۔ پاٹل صاحب کی بدقسمتی کہ اسی روز پارٹی اعلیٰ کمان نے داخلی سلامتی کے موضوع پر ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ طلب کر لی جو کہ وقت کا تقاضہ بھی تھا۔ میٹنگ میں وزیر اعظم، وزیر خارجہ، وزیر دفاع اور دیگر سینئر لیڈران موجود تھے۔ ادھر شیوراج پاٹل بین الاقوامی سمینار کا افتتاح کر رہے تھے۔ ایسے میں وہ میٹنگ میں کس طرح آتے۔ بس پھر تو نیوز چینلوں کو ایک اور موقع مل گیا۔ اس بار انھوں نے شیوراج پاٹل کو پوری طرح مصلوب کر دیا اور پیشین گوئی کر ڈالی کہ پاٹل صاحب اب گئے کہ تب گئے۔ مذکورہ نیوز چینلوں کے عزائم پسند ذمہ دار اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ انھوں نے تبدیلی لباس کی جو اسٹوری چلائی تھی اس کا نزلہ بالآخر پاٹل پر گر گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاٹل ایک خوش پوش، نفیس اور نستعلیق شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن ان کی یہ خوش پوشی ان کے لئے عذاب جان بن گئی۔ طرفہ تماشہ یہ کہ ان کے گنتی کے بال بھی بڑے سلیقے سے سنورے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گویا وہ بھی منت پذیر شانہ تھے۔ اس کا بھی حوالہ بار بار دیا گیا۔ اس اسٹوری کی گونج ابھی تک سنائی دے رہی تھی اور وزیر داخلہ کو اس کی ضرورت پیش آئی کہ وہ اپنی بے گناہی کی داستان سنائیں۔ چوتھے روز یکے بعد دیگرے کئی چینلوں پر ان کے انٹرویوز نشر ہوئے اور ظاہر ہے کہ ان کو بھی اس کا علم تھا کہ ان سے تبدیلی لباس کے بارے میں بھی سوال پوچھے جائیں گے۔ اور نامہ نگار بھی جوش و جذبات سے پر تھے کہ وہ اپنے سوالوں سے وزیر داخلہ کو نادم و شرمندہ کر کے چھوڑیں

گے۔لہذا جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا حکومت دہشت گردی کے مسئلے پر بری طرح ناکام نہیں ہے اور کیا ان کی وزارت اور بھی ناکامی سے دوچار نہیں ہے تو انھوں نے بڑے ہی دلدوز اور رقت آمیز انداز میں اور کسی قدر جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا کہ کیا وہ کسی بے قصور کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیں اور کسی بے گناہ کو پھانسی پر چڑھا دیں۔ جب مقطعے میں ٹھہری ہوئی سخن گسترانہ بات سامنے آئی اور ان کی خوش پوشی مجسم سوال بن کر کھڑی ہوگئی تو انھوں نے ایک زیرک اور تجربے کار سیاستداں ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اس سوال کو ایک دم غیر اہم بنا دیا اور اسے مسکراہٹوں میں اڑاتے ہوئے کہا کہ یہ سب بیکار کی باتیں ہیں لوگوں کو مزا لینے دیجئے۔گویا انھوں نے سوٹ پر سوٹ لوگوں کے مزے کے لئے بدلے تھے۔ایک سوال کے جواب میں انھوں نے اشاروں کنایوں میں یہ جتانے کی بھی کوشش کی کہ ان کو ہٹایا نہیں جا رہا ہے کیونکہ پارٹی اعلی کمان کا دست شفقت ان کے سر پر ہے۔(یہ الگ بات ہے کہ انھیں بہر حال جانا ہی پڑا۔) ویسے اگر دیکھا جائے تو خوش پوشی کوئی عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔لیکن ایسے موقع پر جب راجدھانی بم دھماکوں اور متاثرین کی آہ و بکاء سے لرزہ براندام ہو، پاٹل کی یہ خوبی ایک عیب بن گئی اور یقاناً اس کا سہرہ نیوز چینلوں کے سر جاتا ہے۔

اب ذرا ان کے ایک جواب کا تجزیہ کر لیا جائے۔ان کا کہنا ہے کہ کیا میں کسی بے گناہ کو جیل میں ڈال دوں اور پھانسی پر چڑھا دوں۔یقیناً ایسا نہیں ہونا چاہئے۔لیکن کیا کیا جائے کہ ایسا ہو رہا ہے۔مرکزی وزیر داخلہ اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے کہ لاتعداد بے قصور افراد کو جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے اور وہ گردنیں جن پر بے شمار افراد کا خون ناحق عائد ہوتا ہے، آزاد ہیں۔جی ہاں۔دہشت گردی کے قلع قمع کے نام پر ایسے بے شمار بے قصور اور سادہ لوح مسلم نوجوانوں کو کال کوٹھریوں کی زینت بنا دیا گیا ہے جو شائد دہشت گردی کی ہجے بھی نہ بتا سکیں۔لیکن جن ناپاک ہاتھوں کے یہ کارنامے ہیں وہ نہ صرف آزاد ہیں بلکہ وہ ایسے ہی دوسرے گھناونے واقعات کی سازشوں کے تار و پود بھی بن رہے ہیں۔یہ زخم ابھی

ذرا مندمل ہوگا کہ پھر دھماکے کر کے بے قصور مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کا سامان کر دیا جائے گا۔آج بقول شاعر صورتحال یہ ہے ''کہ سنگ وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد''۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جن مسلم نوجوانوں کو سنگین الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا ہے ان کی حیثیت تو سنگ وخشت سے بھی کمتر ہے۔ سنگ وخشت کی یہ خصلت ہے کہ وہ جب کسی کے ہاتھ میں آتے ہیں تو کسی دوسرے پر ضرب لگاتے ہیں لیکن ان مسلم نوجوانوں کے اپنے حالات تو اپنے ہاتھ میں نہیں ہیں یہ کسی کو کیا ضرب لگائیں گے۔ ہاں یہ پولیس کے ہاتھوں میں ضرور پہنچ جاتے ہیں اور پھر ان پر پے بہ پے ضربیں لگائی جاتی ہیں۔آج دہشت گردی کی آڑ میں پوری مسلم قوم اور خاص طور پر تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔اس کی تمام تر ذمہ داری جہاں حکومت اور محکمہ پولیس پر عائد ہوتی ہے وہیں میڈیا بھی اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ جب پولیس نے عبدالسبحان عرف توقیر نامی نوجوان کو ان دھماکوں کا ماسٹر مائنڈ بتایا تو بعض چینلوں نے وہ شور وغوغہ کیا کہ خود پولیس کی آواز دب کر رہ گئی۔توقیر کی تصویر دکھا کر انتہائی خوفناک انداز میں اور ڈراونی آواز کے ساتھ یہ بتایا جانے لگا کہ ''پہچان لیجئے......اس چہرے کو......یہ ہمارا آپ کا دشمن ہے......ہندوستان کا دشمن ہے...... بھارت کا غدار ہے......'' وغیرہ وغیرہ۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ سنجیدہ سمجھے جانے والے انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز نے اس خبر کو بینر بنایا اور توقیر کو ہندوستان کا بن لادن بتا دیا۔اس کے کتنے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔میڈیا بھی آجکل پولیس اور انٹلی جنس کا کام کر رہا ہے۔ پولیس ذرائع اور معتبر ذرائع کا نام لے کر ایسی ایسی کہانیاں پیش کی جاتی ہیں کہ جن کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔لیکن ان کہانیوں کے طفیل میں معمولی جرائم میں گرفتار مسلم نوجوانوں کو بھی خونخوار اور خطرناک دہشت گرد بنا دیا جاتا ہے۔بعض اوقات تو یہ کہانیاں اس قدر پھیلائی جاتی ہیں کہ انتظامیہ کو یہ ہدایت دینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے تخیلات کی قوت پرواز کو ذرا قابو میں رکھیں کہیں ایسا نہ ہو کہ جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ان کی عمارتیں دھڑام سے زمین بوس ہو جائیں۔

میڈیا کی تعلیم اور مسلمان

تعلیم اور مسلمان، کہنے اور سننے میں یہ محض دو الفاظ ہیں مگر ان دونوں میں ایک جہان معانی پنہاں ہے۔ تعلیم کی اہمیت تو ہمیشہ سے مسلّم رہی ہے اور ہر تہذیب اور ہر معاشرے میں اس کے حصول کی تبلیغ کی جاتی رہی ہے۔ مگر اب میڈیا بھی زبردست اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ میڈیا ذرائع ابلاغ کی شکل میں ہر دور اور ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ البتہ وہ وقت اور زمانے کے ساتھ اپنی شکل بدلتا رہا ہے اور آج وہ انتہائی ترقی یافتہ شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ آج آسمانوں کی رفعتیں ہوں یا سمندروں کی گہرائیاں، کیمرے کی دسترس سے کوئی نہیں بچا ہے۔

آج سب سے بڑا اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص یا کوئی معاشرہ میڈیا کی اہمیت کو نظر انداز کر کے یا میڈیا سے خود کو دور اور الگ تھلگ رکھ کر آج کی دوڑتی بھاگتی دنیا اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دیوانہ وار کوششوں کے درمیان زندہ رہ سکتا ہے۔ شائد نہیں۔ کیونکہ اگر وہ میڈیا سے بے خبر رہے یا دور رہے تو میڈیا خود اس سے باخبر رہے گا اور اس کی پل پل کی جانکاری لیتا رہے گا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ آج کا میڈیا مسلمانوں کے تعلق سے کیا سوچتا ہے اور مسلمانوں سے اس کا رشتہ کیسا ہے؟ دوستانہ یا معاندانہ۔ اگر ہم گہرائی میں جائیں تو بہت سے اور سوالات قائم ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن اگر ہم صرف انہی دو سوالوں کے جواب تلاش کر لیں تو صورت حال بہت حد تک واضح ہو جائے گی۔

اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ میڈیا سے دامن بچانا عقلمندی نہیں بلکہ بیوقوفی

ہے۔لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ بھی میڈیا پر توجہ دیں اور خصوصی توجہ دیں۔آج یونیورسٹیوں اور کالجوں میں میڈیا کی تعلیم کے وافر انتظامات ہیں، ڈپلومہ اور ڈگری کورسز چلائے جا رہے ہیں اور پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو اپنا کیریئر بنانے کے خواہش مند نوجوانوں کو ٹریننگ دی جا رہی ہے۔مسلمانوں کو اس سلسلے میں دو محاذوں پر کام کرنا چاہئے۔ایک یہ کہ ان کے نوجوان بھی ان کورسز میں داخلہ لیں اور دوسرے یہ کہ اسلامی مدارس کے تعلیمی نصاب میں بھی میڈیا کا سبجکٹ شامل کیا جائے۔عصری علوم کے اداروں میں جہاں میڈیا کے کورسز شامل ہیں، مسلم اسٹوڈنٹس کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اور وہاں سے نکل کر مسلم لڑکے اور لڑکیاں پرنٹ اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا میں پہنچ رہے ہیں اور اس کو اپنے کیریئر کے طور پر اختیار کر رہے ہیں۔آج ایسے مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد خاصی بڑھ گئی ہے جو نیوز چینلوں میں ایڈیٹر، نیوز ریڈر، ایکزیکیٹیو ایڈیٹر، پروڈیوسر، رپورٹر اور فوٹو گرافر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

میں نے جن دو محاذوں کی بات کی ہے ان میں دوسرا محاذ اسلامی مدارس کا ہے۔اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے میڈیا کی سوچ بدلے تو ہمیں مطالبات کے بجائے اقدامات کرنے ہوں گے۔اسلامی تعلیمی اداروں میں میڈیا کی بھی تعلیم دینی ہوگی اور اس کی پیشہ ورانہ تربیت فراہم کرنی ہوگی۔اس سلسلے میں ہمیں شکوہ ظلمت شب کے بجائے چراغ راہ جلانے ہوں گے اور مسلمانوں کے تعلق سے میڈیا کی تاریک سوچ کو روشن کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ہمیں اس کے لئے دوسروں کا سہارا لینے کے بجائے خود آگے بڑھنا ہوگا اور راستے کی فلک بوس رکاوٹوں کو عبور کر کے منزل مقصود تک پہنچنا ہوگا۔اگر ہم میڈیا کے رویے کی صرف شکایت ہی کرتے رہے اور حالات کے رخ کو موڑنے اور وقت کی کلائی کو مروڑنے کوئی کوشش نہیں کی تو ہمارا معاشرہ میڈیا کی تیز و تند لہروں میں خس و خاشاک کی مانند بہہ جائے گا۔ہم میڈیا کے رحم و کرم کے محتاج اور دست نگر بن کر رہ جائیں گے اور وہ جس طرح چاہے گا ہماری صورت گری کرے گا اور دنیا کے سامنے اسے پیش کرے گا اور ہم

محض تماشائی بن کر رہ جائیں گے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آج مسلمانوں کے چہرے پر دہشت گردی کا ماسک چڑھانے میں میڈیا نے انتہائی گمراہ کن مگر موثر رول ادا کیا ہے۔لیکن اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں ہونی چاہئے کہ اس معاملے میں ہم بھی کسی نہ کسی طور پر قصوروار ہیں اور ہمارا بھی دامن صاف نہیں ہے۔میں ایک بار پھر کہنا چاہوں گا کہ اسلامی مدارس و مکاتب کے ذمے داران اور مسلم معاشرے کی باحیثیت شخصیات کو چاہئے کہ وہ مبہم اور متضاد موقف اختیار کرنے کے بجائے کھل کر سامنے آئیں اور میڈیا اور اس کے ذمے داروں کو برا بھلا کہنے کے بجائے اس میں اصلاح کی کوشش کریں اور ممکن ہو تو نہ صرف ملکی میڈیا بلکہ عالمی سطح پر بھی مسلمانوں کا میڈیا تخلیق کرنے کی سنجیدہ کوشش کریں۔

میں یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ کیا کبھی ہم لوگوں نے اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ کوشش کی۔ شائد نہیں۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے کیا جاتا ہے اور زہر کو زہر سے مارا جاتا ہے۔ہمیں چاہئے کہ ہم میڈیا کے وار سے اپنے جسموں کو لہولہان کرنے کے بجائے اس کو اسی کے ہتھیار سے ترکی بہ ترکی اور دنداں شکن جواب دیں۔ہم یہ جواب اسی وقت دے سکتے ہیں جب ہمارے اپنے اداروں میں بھی میڈیا کی تعلیم دی جائے اور ہمارے نوجوان بھی ماس میڈیا کی تعلیم سے لیس ہوں۔ہمیں چاہئے کہ ہم ایسے نوجوانوں کی ایک مسلح فوج تیار کریں جو میڈیا کے زرہ بکتر سے لیس ہوں اور ان کے ہاتھوں میں اس کی ڈھال تلوار ہو اور پھر ہم ان کو میڈیا کے میدان کارزار میں چھوڑ دیں۔اس کے لئے ہمیں اپنی سوچ کے زاویے کو بدلنا ہوگا۔فرسودہ خیالات و رجحانات پر جدید طرز فکر کو ترجیح دینی ہوگی۔اگر ہم اپنے روایتی خول سے باہر نہیں نکلے تو اس کے اندر ہی ہمارا دم گھٹ جائے گا اور ہم اس کے لئے دوسروں کو ذمے دار گردانتے رہ جائیں گے۔

مدارس کے طلبہ کو میڈیا کے ہتھیاروں سے لیس کرنے میں ہمیں ان لوگوں کی بھی مدد لینی ہوگی جو آج میڈیا میدان کے قافلہ سالار ہیں۔نیوز چینلوں کے ذمے داروں اور پالیسی

سازوں کو دعوت دینی ہوگی کہ وہ آئیں اور ہمارے طلبہ کو اپنے تجربات سے مستفید کریں۔ان کو وقتاً فوقتاً مدارس میں توسیعی لیکچر کی دعوت دیں اور ان سے مسلسل رابطہ رکھیں۔اگر ہم نے میڈیا کے ذمے داروں کو اس کے لئے راضی کرلیا تو اس کے کم از کم تین فوائد حاصل ہوں گے۔ایک یہ کہ مدارس کے طلبہ کو میڈیائی علم حاصل کرنے میں آسانی ہوگی، وہ تجربات ومشاہدات سے استفادہ کریں گے۔دوسرے یہ کہ باہم ربط وضبط سے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے پالیسی سازوں کی سوچ میں تبدیلی آسکتی ہے اور تیسرے یہ کہ ہم خود ان پر کسی نہ کسی شکل میں اثر انداز ہوسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ان مسلم ذمے داروں سے رابطہ قائم کرنا ہوگا جو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اہم مناصب پر فائض ہیں اور جو اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ہمیں ان سینئر مسلم صحافیوں سے بھی رابطہ قائم کرنا ہوگا جو اپنے کالموں سے ریڈرشپ کو متاثر کرتے ہیں۔ان میں احتشام قریشی ہندوستان ٹائمز،ظفر آغا آزاد کالم نگار،ایم جے اکبر، سیما مصطفیٰ، پرویز حفیظ ریزیڈنٹ ایڈیٹر ایشین ایج کولکاتہ، جاوید فریدی اسسٹنٹ ایڈیٹر ہندوستان ٹائمز،لیاقت علی نمائندہ ہندوستان ٹائمز،سعید نقوی سابق ریزیڈنٹ ایڈیٹر انڈین ایکسپریس،قمر وحید نقوی نیوز ڈائرکٹر نیوز چینل آج تک،سکینہ یوسف خان اسسٹنٹ ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا،رعنا صدیقی روزنامہ ہندو،افتخار گیلانی دہلی بیورو چیف کشمیر ٹائمز،سید علی احمد ٹریبیون دہلی، مصطفیٰ قریشی فوٹو جرنسلٹ انڈین ایکسپریس،محمد الیاس فوٹو جرنلسٹ ٹائمز آف انڈیا، ارشد فریدی دینک جاگرن،شکیل اختر نو بھارت ٹائمز، یوسف کرمانی امر اجالا،صغیر کرمانی ہفت روزہ شکر وار، شیخ منظور احمد ایڈیٹر یو این آئی اردو،جلیس احسان کتھا دیس،محمد احمد کاظمی میڈیا اسٹار، یوسف انصاری زی نیوز،اصغر انصاری یو این این، عارفہ خانم شیروانی این ڈی ٹی وی وغیرہ۔ان کے علاوہ ریجنل میڈیا میں بھی بہت سے مسلمان اہم عہدوں پر فائض ہیں جن میں رشید الدین ملیالم،عبد السلام کنڑ اور ایس بی ترمذی گجرات ٹوڈے قابل ذکر ہیں۔الیکٹرانک میڈیا میں آل انڈیا ریڈیو کی بھی بڑی اہمیت ہے اور اس

میں بھی متعدد مسلمان اہم ذمے داریاں انجام دے رہے ہیں۔ اگر پہلے مرحلے میں ہم ان میں سے چند سے ہی رابطہ قائم کر لیں اور ان کو مدارس میں میڈیا لیکچر کے لئے دعوت دیں تو یہ بجائے خود اپنے آپ میں بہت بڑا کام ہوگا۔

حالانکہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ لوگ ہماری دعوت قبول ہی کر لیں۔ لیکن اگر مسلسل کوشش کی جائے تو کامیابی مل سکتی ہے۔ اگر مسلمان اس معاملے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے اور میڈیا اداروں کے ذمے داروں کی سوچ میں مثبت تبدیلی آئی تو یقین کیجئے کہ وہ لوگ اپنے اپنے اداروں میں کسی نہ کسی حد تک آپ کا کام ضرور کریں گے۔ جب ان میں سے کچھ لوگوں کو ہموار کر لیں تو غیر مسلم صحافیوں اور ذمے داروں سے رابطہ قائم کریں اور ان پر اثر انداز ہونے کی کوشش کریں۔ خود میڈیا کے لوگ ہی اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن جس دشمن سے مسلمانوں کا واسطہ ہے وہ بہت طاقتور ہے۔ لہذا پوری جد و جہد کرنی ہوگی اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ یہ باتیں مدارس کے ذمے داران آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ اب ان کی سوچ میں بھی تبدیلی آرہی ہے اور یہ تبدیلی زمانے کے ساتھ چلنے یا زمانے کو اپنے ساتھ چلانے میں بہت حد تک معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ میں اس تبدیلی کو ایک اہم قدم مانتا ہوں اور جو گذارشات پیش کی گئی ہیں ان پر عمل کرنے کی سمت میں ایک پیش خیمہ تصور کرتا ہوں۔ جن مدارس میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی تعلیم کا بند و بست نہیں ہے ان میں اس کا بند و بست کیا جانا چاہئے اور جن اداروں میں یہ انتظام ہے ان میں ماس میڈیا کے کورسز داخل کئے جانے چاہئیں۔ اس طرح یہ کام بتدریج کیا جا سکتا ہے۔ وہی قوم وقت کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہے جو اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے خود کو مین اسٹریم میں شامل کر لیتی ہے۔ ہمیں بھی اپنی اسلامی انفرادیت اور دینی شناخت کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ میڈیا کی مین اسٹریم میں آنا ہوگا اور اس میں اپنے لئے ایک جگہ متعین کرنی

ہوگی۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مدارس کے طلبہ ماس میڈیا کے کورسز کریں اور پھر عملی میدان میں قدم رکھیں۔ اگر میڈیا پر یہودیت کے غلبہ کا مقابلہ کرنا ہے تو ہمیں اپنے زاویہ نظر اور انداز فکر میں کسی نہ کسی حد تک تبدیلی لانی ہوگی۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہمارے لیے میڈیا کو کوسنے اور اسے برا بھلا کہنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں رہ جائے گا۔

موجودہ حالات میں جبکہ میڈیا عموماً ون وے ٹریفک چلاتا ہے، مسلمانوں، ان کے تعلیمی اداروں اور مسلم معاشرے کے باحیثیت اور بااثر لوگوں پر بہت بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ ان کو چاہئے کہ وہ اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے خود کو تیار کریں اور یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب مسلمان بھی میڈیائی ہتھیاروں سے لیس ایک مسلح فوج تشکیل دیں۔ اسی صورت میں ان کے بازوؤں میں طاقت آئے گی اور وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے اہل ہوسکیں گے۔ یہ بات نہ بھولیں کہ میڈیا میں تمام لوگ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں ایسے برادران وطن کی خاصی تعداد موجود ہے جو موقع بہ موقع ہمارا کیس پوری قوت اور شدت کے ساتھ لڑتی ہے اور ہمارے دشمنوں کو جواب دیتی ہے۔ اگر ہم ان لوگوں سے رابطہ قائم کریں اور ان کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کریں تو ہمارا کام قدرے آسان ہوجائے گا اور ہمیں زیادہ دشمنوں کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔

تخلیق کائنات کا راز اور ہندوستانی میڈیا

جب پوری دنیا کی نظریں جنیوا میں ہو رہے اس عظیم تجربے پر مرکوز تھیں جس کا مقصد تخلیق کائنات کے سربستہ رازوں کو فاش کر دینا تھا، جب دنیا بھر کے سائنس داں اس راز کو کھول دینے کے لئے بے چین تھے جو کائنات کی تخلیق سے وابستہ ہے اور جب ''کن اور فیکون'' کے درمیان پوشیدہ اسرار کی تہوں کو یکے بعد دیگرے واشگاف کر دینے کے لئے دنیا بھر کے ہزاروں سائنس داں اپنی علمی و عملی موشگافیوں میں مصروف تھے تو اس وقت ہندوستانی میڈیا بھی بہت جوش میں تھا اور وہ بھی تخلیق کائنات کے سربستہ اسرار کو فاش ہوتے ہوئے پوری دنیا کو دکھانے کے لئے بے چین تھا۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا بنانے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا 'کن' یعنی ہو جا اور 'فیکون' پس ہو گیا۔ کہنے میں تو یہ بہت عام اور سادہ سی بات لگتی ہے لیکن سائنس دانوں کے خیال میں کن اور فیکون کے درمیان جو پراسرار مرحلہ ہے وہ ایک عظیم آواز یا زبردست دھماکے سے وابستہ ہے جسے 'بگ بینگ کی تھیوری' کہا جاتا ہے۔ اس تھیوری کے مطابق اس زبردست آواز کے بعد ہی مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے کائنات کی تخلیق ہوئی۔ زبردست دھماکہ، عظیم آواز یا بگ بینگ کی تھیوری سچ ہے یا نہیں اس سے قطع نظر' قرآن یہ ضرور بتاتا ہے کہ جب اللہ دنیا کو ختم کر کے روز محشر برپا کرنا چاہیں گے تو ان کے ایک فرشتے اسرافیل صور پھونکیں گے جس سے بہت بھیانک اور ڈراونی آواز نکلے گی اور اسی کے ساتھ زمین و آسمان اور کائنات کی ہر چیز تباہ و برباد ہو جائے گی اور پھر قیامت برپا ہو گی۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس دانوں کا بگ بینگ کا نظریہ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ

ایسی ہی آواز کے ساتھ دنیا کی تباہی کا آغاز ہوگا۔

مفسرین قرآن کے مطابق قرآن میں اسرار کائنات سے متعلق متعدد آیات آئی ہیں۔ البتہ انسانوں سے کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ تخلیق کائنات کے راز کو فاش کرنے کی کوشش کریں یا اللہ کے ذریعے عطا کردہ اپنے علم سے تخلیق کائنات کے اسباب و اسرار کا پتہ لگائیں۔ تاہم تدبرّ فی الکائنات کا حکم ضرور دیا گیا ہے۔ یعنی تم کائنات کے بارے میں تدبر کرو، غور و فکر کرو۔ اس کے دو مقاصد بتائے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ غور و فکر کر کے کائنات کے صانع تک، اس کے خالق تک پہنچو اور اس کی وحدانیت کے قائل ہو جاؤ۔ دوم یہ کہ پھر اس بات کو تسلیم کرو کہ کائنات کا خالق ایک ہی ہے، اسی نے کائنات اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے اور اسی کی فرماں برداری اور عبادت کی جانی چاہیئے۔ گویا انسانوں کو تسخیر کائنات کے ساتھ ساتھ تصویر کائنات پر بھی غور کرنا چاہیئے اور اس کا نتیجہ اس شکل میں برآمد ہونا چاہیئے کہ وہ اللہ، اس کی قوت تخلیق اور اس کی وحدانیت کے قائل ہو جائیں۔

اس وقت پوری دنیا کا میڈیا خواہ وہ الیکٹرانک ہو یا پرنٹ، اس عظیم تجربے کی کوریج کے لئے اپنے تمام تر ساز و سامان اور لاؤ لشکر کے ساتھ مصروف کار تھا۔ اس عظیم واقعہ کے کئی دنوں پہلے سے ہی میڈیا میں اس بارے میں رپورٹیں پیش کی جا رہی تھیں اور تخلیق کائنات کے سربستہ اسرار و رموز کو جاننے کے لئے بے چین سائنس دانوں کے خیالات کے ساتھ ساتھ ان سائنس دانوں کے نظریات کو بھی پیش کیا جا رہا تھا جن کو اس تجربے سے بہت سے اندیشے لاحق تھے۔ سائنس دانوں کا ایک طبقہ اس اندیشے میں مبتلا تھا کہ یہ عظیم تجربہ محفوظ تجربہ نہیں ہے اور شعاؤں کے تصادم سے ویسے ہی بلیک ہول قائم ہو جائیں گے اور ویسا ہی بگ بینگ پیدا ہوگا جو تخلیق کائنات کے وقت پیدا ہوا تھا۔ اور اگر ایسا ہوا تو پوری کائنات اس بگ بینگ کے ساتھ تباہ و برباد ہو جائے گی۔ جبکہ تجربے کے حامی سائنس دانوں کا طبقہ اس اندیشے کو اندیشہ ہائے دور دراز قرار دیتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا اور اگر ہوگا تو اس کی حفاظتی اور احتیاطی تدابیر بھی اختیار کر لی گئی ہیں۔

ہندوستانی میڈیا بھی اس عظیم تجربے کی کوریج کر رہا تھا اور کئی دنوں پہلے سے ہی کر رہا تھا۔ جہاں اس سلسلے میں بعض نیوز چینلوں کا رویہ انتہائی محتاط اور مثبت تھا وہیں بعض کا رویہ انتہائی خوفناک تھا۔ چند ایک چینلوں نے اس کی کوریج کے ساتھ ساتھ اس کی پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ اس تجربے کے ساتھ قیامت برپا ہو جائے گی اور دنیا تباہ ہو جائے گی۔ کچھ چینلوں نے اس کا پروپیگنڈہ اس طرح کیا کہ کمزور دل و دماغ والے بدعقیدہ اور توہم پرستوں نے اسے بالکل سچ مان لیا۔ انھیں اس کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ دنیا چند دنوں کی مہمان ہے، بس اب سب کچھ تباہ و برباد ہونے والا ہے۔ دراصل ایسا یقین کرنے والوں کی زیادہ غلطی نہیں تھی۔ اس کے ذمہ دار وہ چینل تھے جو روزانہ ایسی سرخیوں کے ساتھ خبریں دے رہے تھے کہ قیامت آنے میں پانچ روز باقی ہیں، چار روز باقی ہیں اور دو روز باقی ہیں۔ سائنسی تجربہ سے پہلے ہونے والے امکانی دھماکے سے قبل ہی ان چینلوں نے بگ بینگ بجا دیا اور صور اسرافیل پھونک دیا تھا۔ انھوں نے اس کی قطعی پروا نہیں کی کہ اس غیر ذمہ دارانہ رپورٹنگ سے کیسے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک قرب قیامت کی تمام تر نشانیاں ظاہر نہیں ہو جائیں گی اس وقت تک قیامت نہیں آ سکتی۔ چھوٹی چھوٹی نشانیاں تو ظاہر ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ لیکن دجال کے فتنہ اور مسیح موعود کے ظہور سمیت متعدد بڑی نشانیاں ابھی باقی ہیں۔ ایسے میں کوئی کمزور عقیدے کا مسلمان بھی یہ یقین نہیں کر سکتا کہ اس تجربے کے ساتھ دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا اور میدان محشر بپا ہوگا۔ تمام نشانیوں کے ظہور اور پھر پوری دنیا میں اسلام کے پھیل جانے کے بعد ہی اللہ کے حکم سے اسرافیل صور پھونکیں گے اور تب چاند سورج بے نور ہو جائیں گے، زمین الٹ پلٹ دی جائے گی، وہ اپنے چھپے ہوئے خزانے باہر کر دے گی، پہاڑ اور آسمان روئی کے گالے کی طرح اڑیں گے اور پھر عظیم تباہی کے ساتھ قیامت آئے گی۔ لیکن صور اسرافیل سے پہلے کے بے شمار واقعات سے قبل یہاں کے بعض نیوز چینلوں نے اپنا صور پھونک دیا تھا اور ملک بھر میں خوف و ہراس اور دہشت و وحشت کا

ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس کے متعدد لوگ شکار ہوئے تھے۔ اندور میں ایک ناخواندہ لڑکی پر اس رپورٹنگ کا ایسا اثر ہوا کہ اس میں دنیا کی اس مفروضہ تباہی کا منظر دیکھنے کی تاب ہی نہیں رہ گئی اور اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ کچھ اور لوگوں پر بھی اس میڈیا کوریج کے منفی اثرات مرتب ہوئے تھے۔ ایک نیوز چینل نے ایک پروگرام تو اس عنوان سے پیش کیا تھا کہ ''بچنا ہے تو کاشی چلئے''۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ جب اس تجربے کے ساتھ دنیا ختم ہو جائے گی تو اس وقت بھی کاشی نگری کا وجود برقرار رہے گا۔ کیونکہ بقول چینل، کاشی کا وجود شیو جی کے ترشول پر ٹکا ہوا ہے۔ اس رپورٹ میں یہاں تک کہا گیا کہ جب پوری دنیا نیست و نابود ہو جائے گی تو اس وقت بھی کاشی ایک چھتری کی شکل میں موجود رہے گی۔ گویا کاشی نہ ہوئی نعوذ باللہ جودی پہاڑ ہو گیا جس پر حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی آ کر ٹکی تھی۔ نیوز چینلوں نے اور بھی جانے کیا کیا توہمات پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ ان چینلوں کا بھی عجیب وغریب رویہ ہے۔ جب عقدہ کشائی پر آئیں گے تو ایسی ایسی گتھیوں کی گرہ کشائی کریں گے کہ دل و دماغ دنگ رہ جائیں اور جب توہم پرستی پر آئیں گے تو دنیا کا بڑے سے بڑا توہم پرست بھی ان کے آگے بونا اور بالشتیہ ہو جائے گا۔ گویا اقبال کا یہ شعر ان پر بھی صادق آتا ہے کہ۔ گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود۔ گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں۔ یہ نیوز چینل اپنے توہمات میں نہ صرف خود الجھتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی الجھاتے رہتے ہیں۔